آہنی بھائی چارے کا راز

پاک چین تعلقات کی کہانی

امتیاز گل

امتیاز گل نے ۱۹۸۵ میں اپنے کیریئر کی شروعات Deutsche Welle کے ساتھ جرمنی کے شہر کولون سے کیا۔ وہ جنوری ۱۹۸۸ میں پاکستان واپس آئے اور DW (اردو، انگریزی، پشتو اور جرمن) کے نمائندے کے طور پر صحافت کا آغاز کیا۔ اس کے علاوہ انہوں نے CNN کے لیے مئی ۱۹۹۸ میں پاکستان کے جوہری تجربات، کارگل تنازعہ (مئی ۱۹۹۹)، دسمبر ۱۹۹۹ میں ایک بھارتی مسافر بردار طیارے کی قندھار میں ہائی جیکنگ اور اکتوبر ۱۹۹۹ میں جنرل پرویز مشرف کے مارشل لاء جیسی اہم ترین رپورٹس پر بھی بطور پروڈیوسر کام کیا۔

انہوں نے قومی سلامتی، دہشت گردی، ملکی سیاست، معیشت، طالبانائزیشن، افغانستان، کشمیر اور ہندوستان کے مسائل پر ملکی اور غیر ملکی میڈیا میں سینکڑوں مضامین اور تجزیے لکھے ہیں۔

امتیاز گل قومی انگریزی روزنامے The Express Tribune اور Matrix Mag میں بھی اکثر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔ ان سب کاوشوں کے علاوہ وہ NDTV، TRT اور الجزیرہ کے ساتھ ساتھ قومی نیوز ٹی وی چینلز پر بھی باقاعدہ تبصرے کرتے ہیں اور دنیا بھر میں پاکستان کے نامور صحافی اور مصنف کے طور پر پہچانے جاتے ہیں۔

مصنف کی دوسری کتابیں:

1. Pakistan: Before and After Osama bin Laden (Roli Books, India, September, 2012)
2. The Most Dangerous Place – Pakistan's Lawless Frontier (Penguin US/UK June, 2010)
3. The Al-Qaeda Connection –Taliban and Terror in Tribal Areas (Penguin-Viking India, August 20, 2009)
4. The Unholy Nexus; Pak-Afghan relations under the Taliban, (Vanguard Books, Pakistan, July 2002)
5. Pakistan: Pivot of Hizbu Tahrir's Global Caliphate (2014)
6. What Lies Behind Iron Brotherhood – Overview of Pak China Relations

اس کتاب کے مندرجات بحق مصنف امتیاز گل محفوظ ہیں۔
کسی بھی حصے کی اشاعت کیلئے میٹرکس میڈیا کی اجازت لازمی ہے۔

آہنی بھائی چارے کا راز
پاک چین تعلقات کی کہانی

اشاعت 2023
میٹرکس میڈیا، اسلام آباد

بتعاون
SAP Communications

فہرست

سپاس نامہ	4
دیباچہ	6
تعارف	10
آج کا چین	30
1- آہنی بھائی چارے (آئرن برادر ہُڈ) کا پس منظر کیا ہے؟	40
2- چین کیا ہے؟	69
3- گورننس کا ''چینی ماڈل''	102
4- چین: صدر شی جن پنگ کی قیادت میں	116
5- شی جن پنگ کی کرپشن کے خلاف جنگ	133
6- چین کے عالمی پاور ہاؤس بننے کی کہانی	147
7- چین اور عالمی برادری	167
8- خطے میں امن کے لیے جستجو	192
9- چین اور انسدادِ دہشت گردی	213
10- سنکیانگ، ہانگ کانگ کا دہشت گردی اور سیاسی آلے کے طور پر استعمال	232
11- مستقبل- درپیش چیلنجز اور حاصل مواقع	256
12- صدر شی جن پنگ کی زندگی، تصاویر کے آئینے میں	265
13- چین: متفرق یادگار تصاویر	270

سپاس نامہ

یہ کتاب آپ تک پہنچانے کے حوالے سے میں اپنے بہت سے ساتھیوں، دوستوں اور اداروں کا مشکور ہوں۔ اس معاملے میں سب سے فائق عوامی جمہوریہ چین کا سفارت خانہ ہے اور میں اسی کا سب سے زیادہ شکر گزار ہوں۔ یہ چینی سفارت خانہ ہی ہے جس نے مختلف چینی تھنک ٹینکس، سکالرز، چینی وزارتِ خارجہ، چائنا فرینڈ شپ ایسوسی ایشن کے ساتھ ساتھ صدر شی جن پنگ کے دفتر کے حکام کے ساتھ میری طویل رفاقت کی راہ ہموار کی۔

ان سرگرم تعاملات نے مجھے چینی عوام اور حکام کے مائنڈ سیٹ اور پاکستان کے لیے ان کے جذبے کو سمجھنے کے قابل بنایا، اور اس فکر کا ادراک دیا جو وہ ایک مستحکم اور خوشحال پڑوسی کے لیے رکھتے ہیں کیونکہ خود چین کے اندر امن اور استحکام کے لیے یہی بنیادی شرط ہے۔

میں اپنے ساتھیوں ذیشان صلاح الدین، مرانڈا حسین اور سفیر نغمانہ ہاشمی کا بے حد مشکور ہوں کہ انہوں نے اس کتاب کے لیے انمول ادارتی تعاون فراہم کیا۔

میں اپنی جیون ساتھی ثمینہ کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انہوں نے میرے اس دانشورانہ منصوبے کو تکمیل تک پہنچانے میں بھرپور معاونت کی۔ اس کتاب کے آغاز سے اس کی تکمیل تک کے تمام مراحل میں جن لوگوں نے میرے ساتھ ہر طرح سے تعاون کیا میں ان کا فرداً فرداً اور اجتماعی طور پر بھی شکریہ ادا کرتا ہوں۔ چیدہ نام درجِ ذیل ہیں:

☆ ڈاکٹر فاروق یوسف، آسٹریلیا
☆ مارگریٹ ایڈمسن (پاکستان میں سابق آسٹریلوی سفیر)
☆ جینیفر میک کے
☆ سن وائے ڈونگ (پاکستان میں سابق چینی سفیر)
☆ لیجیان جاؤ، بیجنگ
☆ حامد شریف، بیجنگ
☆ سٹیو وانگ، بیجنگ
☆ ڈاکٹر جی جین جھانگ، بیجنگ
☆ جھاؤ شوئی، بیجنگ
☆ گووٴ شوئے تانگ، شنگھائی
☆ مسز وو، ارمچی
☆ لِن بِن ہوانگ، گوانگ شو
☆ سٹیفن وانگ

اور سب سے آخر میں اس کتاب کو انگریزی سے اردو کے قالب میں ڈھالنے پر میں سجاد کریم انجم اور ترجمے پر نظر ثانی کے لیے سبوخ سید کا شکر گزار ہوں کہ ان کی شبانہ روز محنت کے نتیجے میں ہی یہ کتاب آج آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

احقر العباد
امتیاز گُل

دیباچہ

پاک چین تعلق افسانوی محسوس ہوتا ہے۔ ایک ایسی چیز جسے محسوس کرنے اور جس کا تجربہ کرنے کی ضرورت ہے۔ اس بندھن کی روح کو چند لفظوں میں سمیٹنا مشکل ہے۔ اس کے باوجود امتیاز گل نے نہایت خوبصورتی اور کامیابی سے اس تعلق کے جوہر کو ضبطِ تحریر میں لا کر قابو کیا ہے۔

چین کو وہاں کے عوام کے ساتھ ملاقاتوں، بات چیت و تبادلہ خیالات اور تجربے کے منشور (Prism) سے دیکھتے ہوئے مصنف کی گہری صحافتی نظر نے اس میں ذاتی احساسات بھی شامل کر دیئے ہیں، جن میں یہ گہری تفہیم موجود ہے کہ چین کو عروج کیسے ملا اور اس کی پاکستان کے ساتھ دوستی کا شاندار سفر کیسے اور کن حالات میں طے ہوا۔

پاک چین سفارتی تعلقات کے قیام کی 70 ویں سالگرہ کے موقع پر شائع کی گئی یہ کتاب اس موضوع پر فروغ پذیر لٹریچر میں ایک قابلِ قدر اضافہ ہے۔ دلچسپ اندازِ تحریر کی بنا پر یہ کسی بھی ادب پارے سے کم نہیں۔ یہ تصنیف واقعات اور ان کے اثرات کا تاریخی تجزیہ پیش نہیں کرتی بلکہ یہ نظریے، معاشیات، سیاست اور جیوسٹریٹیجی کے نقطۂ اتصال کا سراغ بھی لگاتی ہے۔ کئی اعلیٰ سطحی سیمینارز اور کانفرنسز کے سلسلے میں چین کے اپنے لاتعداد دوروں کے دوران امتیاز گل نے چین کے اندرونی سطح پر طاقت پکڑنے اور اس کی عالمی حیثیت کے استحکام کے پیچھے کارفرما عوامل کی گہری تفہیم حاصل کر لی ہے۔ بیجنگ نے جس چابک دستی سے بین الاقوامی تعلقات کی حساس اور پیچیدہ حرکیات کو سنبھالا، امتیاز گل کی تفہیم میں اس کی جھلک بھی نظر آتی ہے۔ پاک چین تعلقات کے استحکام کا منبع چین کا پُرامن بقائے باہمی اور اپنے قریبی دوستوں کے لیے بے حد احترام پر یقین ہے۔

سال 2021ء میں چین کی کمیونسٹ پارٹی (CPC) کے قیام کی صد سالہ تقریبات منائی گئیں۔ کمیونسٹ پارٹی آف چائنا نے پچھلے 100 برسوں میں زبردست تبدیلیوں کا مشاہدہ اور مقابلہ کیا ہے، اور انتہا پسندی اور غربت کے خاتمے کا صد سالہ ہدف حاصل کر لیا ہے۔ تصنیف ہذا کے باب 'آہنی بھائی چارے کے پس منظر میں کیا ہے؟' میں سال 2021ء کے بارے میں بھی تفصیلات موجود ہیں۔ یہ سال پاکستان اور چین، دونوں کے لیے ایک بہت ہی خاص سال تھا۔ اس سال مئی میں تمام موسموں والی دوستی 70 سال کی ہوگئی تھی کیونکہ دونوں ملکوں کے رسمی تعلقات 1951ء میں قائم ہوئے تھے۔ اس خاص موقع پر منفرد سٹریٹیجک کوآپریٹو پارٹنرشپ اور ان کامیابیوں کا جشن منایا گیا جو دونوں ملکوں نے گزشتہ 70 سالوں میں مل کر حاصل کی ہیں۔ سال 2021ء نے ایک آسودہ اور پُرامن مستقبل کی طرف بڑھنے کے سلسلے میں مشترکہ مقدر تشکیل دینے اور ماضی کی کامیابیوں پر نئی عمارت استوار کرنے کے حوالے سے تجدیدِ عہد کے لیے ایک اہم موقع کے طور پر بھی کام کیا۔

ایسا ہی ایک ورثہ 1971ء کا ہے جب ہنری کسنجر، اس وقت کے امریکی وزیر خارجہ، نے اسلام آباد کے راستے بیجنگ کے سیکرٹ سفارتی مشن کا آغاز کیا تھا۔ پاکستان نے دونوں فریقوں کے مابین ایک پُل کا کام کیا تھا۔ یوں رچرڈ نکسن کے وہ پہلا امریکی صدر بننے کا راستہ ہموار ہوا تھا جس نے چین کا دورہ کیا اور عالمی سیاست کا راستہ ہمیشہ کے لیے تبدیل کر دیا تھا۔

چین پاکستان تعلقات گہرے سیاسی اعتماد، باہمی احترام، نسل در نسل منتقل ہونے والے برادرانہ روابط اور اچھی ہمسائیگی کی مثال ہیں۔ علاوہ ازیں یہ تعلقات اندرونی و بیرونی سیاسی پیشرفتوں سے قطع نظر پُرامن بقائے باہمی کی ایک مضبوط روایت کی علامت ہیں۔

بیجنگ اور اسلام آباد میں یکے بعد دیگرے برسرِ اقتدار آنے والی حکومتیں اس اتحاد کے سیاسی اور عوامی جذبات کی عکاسی ایک ''غیر متزلزل، آہن پوش، منفرد، ہر موسم کی سٹریٹیجک کوآپریٹو پارٹنرشپ'' کے طور پر کرتی رہی ہیں اور ان انمول بندھنوں کو مزید مضبوط بناتے رہنے کے عزم سے اپنا جوش و ولولہ کشید کرتی رہی ہیں۔ ایسے بندھن جو حالات اور وقت کی تمام آزمائشوں پر پورا اترے ہوں۔

چین کے ساتھ پاکستان کے تعلقات کبھی لین دین والے نہیں رہے۔ دراصل ان

تعلقات کا گراف مسلسل بلند ہوتا رہا ہے۔ بالکل آغاز سے اور خاص طور پر 1960ء کی دہائی سے دونوں ملکوں نے باہمی افہام وتفہیم اور مطابقت کے ذریعے پارٹنرشپ قائم کرنا شروع کی۔ ملکی، علاقائی اور بین الاقوامی سیاست میں اہم تبدیلیوں اور اتار چڑھاؤ کے باوجود یہ پارٹنرشپ غیر معمولی طور پر مسلسل اور مستقل رہی ہے۔

پاکستان اور چین، دونوں ابھرتے ہوئے چیلنجز سے بخوبی آگاہ ہیں۔ وہ چیلنجز جو داخلی سطح پر درپیش ہیں اور ان سے بھی جو جیوا کنامک، جیوپولیٹیکل اور جیوسٹریٹیجک گروہ بندیوں کی وجہ سے پیدا ہو رہے ہیں۔ دونوں اپنے اپنے متعلقہ قومی چیلنجز سے آگاہ ہیں، اور ان بیرونی متغیرات سے بھی جن کا مقصد بی آر آئی کے ذریعے ہونے والی علاقائی اور بین العلاقائی رابطہ کاری (کنیکٹیوٹی) کو روکنا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ دونوں برادر ملک یک رُخے نظام، ملکی مصنوعات کے تحفظ کے معاشی نظام (تحفظِ تجارت) اور جابرانہ سفارتکاری کے حوالے سے درپیش چیلنجز سے بھی پوری طرح آگاہ ہیں۔

پاکستان اور چین مشترکہ علاقائی مسائل کا بھی پورا ادراک رکھتے ہیں جیسے بڑے پیمانے پر بیروزگاری، بارشیں برسنے کے پیٹرن اور دریاؤں کے بہاؤ میں تبدیلی، سطحِ سمندر کی بلندی، ہمالیائی گلیشئرز کا پگھلنا جو ایشیائی براعظموں کے دریائی نظام کے بیشتر حصے کو پانی فراہم کرتے ہیں، اور تازہ پانی کے وسائل کی بڑھتی ہوئی قلت۔ دونوں ملک اس حقیقت سے بھی پوری طرح آگاہ ہیں کہ انہیں ان تمام شعبوں میں تعاون جاری رکھنے کی کوشش کرتے رہنا چاہیے۔

ان ساری پیش رفتوں کے تناظر میں دونوں ملک بخوبی جانتے ہیں کہ انہیں نئے دور میں 2005ء میں پاکستان اور چین کے مابین کئے گئے فرینڈ شپ، کوآپریشن اینڈ گُڈ نیبر لی ریلیشنز کے معاہدے، نومبر 2018ء کے مشترکہ بیان اور اسی نوعیت کی دوسری دوطرفہ دستاویزات کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے ایک قریب تر اور زیادہ معنی خیز مشترکہ مستقبل والی پاک چین کمیونٹی تشکیل دینے کا مقصد سامنے رکھنا چاہئے۔

لہٰذا، مستقبل کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے، جس پر امتیاز گل نے بھی زور دیا ہے، ایک زیادہ مضبوط، جامع اور ہمہ جہت پاک چین دوستی نہ صرف دونوں ملکوں کے بہترین مفادات کو پورا کرے

گی بلکہ اس پورے خطے اور اس سے بھی آگے کی دنیا میں امن اور استحکام کو یقینی بنائے گی۔ موجودہ جغرافیائی و سیاسی حالات دونوں ملکوں کے لیے اسے ماضی کی نسبت کہیں زیادہ ناگزیر بناتے ہیں کہ وہ اپنی ''ہر موسم کی تزویراتی تعاون پر مبنی پارٹنرشپ'' کی موجودہ سطح کو مزید بلند کریں۔ یہ مقصد ترقی کے آفاقی اہداف کے ساتھ جڑے رہ کر مستقبل کی ضروریات کو پورا کرنے والے جامع لائحہ عمل کے ذریعے دونوں ملکوں کے عوام کی خواہشات کو ذہن میں رکھتے ہوئے پورا کیا جا سکتا ہے لیکن اس کے لیے علاقائی اور عالمی شراکت داری، تزویراتی تعاملات اور صف بندیوں پر توجہ مرکوز کرنا ہوگی۔

یہ کوئی اتفاق نہیں ہے کہ پاک چین تعلقات وقت اور حالات کے ہر امتحان پر پورے اترے اور برقرار رہے۔ دونوں دوست ملک ہر اچھے برے وقت میں ایک دوسرے کے ساتھ کھڑے رہے، دوطرفہ طور پر ایک دوسرے کی حمایت کرتے رہے اور بین الاقوامی میدان میں بھی۔ آنے والی دہائیوں میں، ان مضبوط تعلقات کے مساوی پائیدار ترقی، اقتصادی تعاون، اور باہمی اعتماد اور احترام پر مبنی دیرپا امن کے لیے زیادہ سے زیادہ ہم آہنگی کے ساتھ مزید مضبوط ہونے کے امکانات روشن تر ہیں۔

نغمانہ اے ہاشمی (سفیر)

تعارف

پاک چین تعلقات کا خلاصہ صدر شی جن پنگ کی کہی گئی بات سے بہتر اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ جون 2018ء میں چین کے ساحلی شہر چنگ ڈاؤ میں شنگھائی تعاون تنظیم (SCO) کے سربراہی اجلاس کی سائیڈ لائنز پر اپنے پاکستانی ہم منصب ممنون حسین سے ملاقات کے دوران انہوں نے کہا تھا، ''چین پاکستان ہمہ موسمی تزویراتی تعاون نہ صرف دونوں ممالک کا مشترکہ اثاثہ ہے، بلکہ یہ بین الاقوامی تعلقات کی ایک نئی قسم کی تشکیل کے لیے ایک ماڈل بھی پیش کرتا ہے۔''

چین، پاک چین اقتصادی کوریڈور (CPEC) کو مسلسل فروغ دے گا اور توانائی اور نقل وحمل کے انفراسٹرکچر جیسے شعبوں میں دوطرفہ تعاون کو مضبوط بنائے گا۔ یہ بیانیہ چیئرمین ماؤزے تنگ اور وزیراعظم چواین لائی سے شروع ہوا تھا اور گزرنے والی دہائیوں کا سفر کرتے ہوئے یہاں تک پہنچا ہے، غیر تحلیل شدہ اور ہر قسم کے شک وشبہ سے بالاتر۔

'یہ تعلق کتنا خاص ہے' مجھے اس کا پہلا تجربہ اپریل 2009ء میں ہوا تھا جب میں ایک کانفرنس میں شرکت کے لیے بیجنگ کے اپنے دوسرے دورے پر گیا تھا۔ کانفرنس کے شرکا کی گروپ فوٹو کے عمل نے چینیوں کی ہم پاکستانیوں کے لیے محبت کی ایک اور جھلک پیش کی۔ میں تب تک چینی زبان کے انگریزی لہجے کی پیروی کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ جب میں گروپ فوٹو کے لیے تمام مہمانوں کے بیٹھنے یا لائن میں کھڑے ہونے کا انتظار کر رہا تھا تو میں نے ایک خاتون کو کسی کا نام پکارتے ہوئے سنا۔ اس نے کم از کم تین بار کسی کا نام پکارا اور پھر اس کی تلاش میں ادھر ادھر دیکھا۔ پھر تیسری قطار میں میرے ساتھ کھڑے ایک شخص نے میری توجہ اس خاتون کی طرف مبذول

کرائی۔ دراصل وہ خاتون مجھے ہی ڈھونڈ رہی تھی۔

میں نے حیران ہو کر پوچھا: آپ مجھے بلا رہی تھیں؟

اس نے کہا کہ ہم نے پہلی قطار میں ایک کرسی آپ کے لیے مختص کر رکھی ہے۔ یہ کہہ کر اس نے پہلی قطار میں ایک خالی کرسی تک میری رہنمائی کی۔ میرے ایک دوست نے بعد میں مجھے بتایا کہ پاکستانی مہمانوں سے یہ پیار اب تقریباً خودکار ہو چکا ہے۔

'پٹیا' (آئرن برادر) پاکستان کے حوالے سے اس گہرے پیوست بیانیے کا حصہ ہے۔ اس لفظ کا ترجمہ 'آئرن برادر' ہے، ایک جملہ جو تقریباً ہر دوطرفہ بات چیت کا ایک لازمی عنصر ہے۔

دو اور واقعات اس معاملے پر روشنی ڈالتے ہیں۔ 2010ء کی بات ہے، چین کے دورے کے دوران جب ہم دارالحکومت کے مشہور بیجنگ ڈک ریسٹورنٹ میں داخل ہوئے تو گارڈز میں سے ایک نے ہمیں روکنے کے لیے ہاتھ ہلایا اور ہمارے چینی دوست سے پوچھا کہ یہ لوگ کہاں کے رہنے والے ہیں؟ جواب تھا ''پٹیا۔'' پھر جولائی 2018ء میں، جب ہم ٹیکسی میں سوار ہوئے تو متجسس ڈرائیور نے میرے چینی دوست سے وہی سوال دہرایا کہ یہ کہاں کا رہنے والا ہے؟ چینی دوست، جس کا انگریزی نام سٹیفن تھا، نے جونہی وہ جادو بھرا لفظ بولا ''پٹیا'' تو ڈرائیور کا چہرہ خوشی سے دمکنے لگا۔ اس نے پُرجوش انداز میں جواب دیا ''ہم دوست ہیں، آئرن برادرز۔''

اس سے پہلے 2008ء میں بھی، اپنے چین کے پہلے دورے کے دوران، جب ہم بیجنگ ڈک کے کار پارک میں سے گزر رہے تھے تو دیکھا کہ ایک متجسس آدمی، جو ایک گاڑی کے پاس کھڑا تھا، ہمیں دیکھ کر ہاتھ ہلانے لگا۔ وہ دراصل ہمارے چینی دوست سٹیو وانگ کو دیکھ کر ہاتھ ہلا رہا تھا۔ پھر اس نے سٹیو سے اپنی مقامی زبان مینڈارن (Mandarin) میں کچھ پوچھا۔ جب وانگ نے جواب دیا تو اس کا چہرہ واضح طور پر دمک اٹھا۔ ان کی گفتگو میں جس لفظ کی ہمیں سمجھ آئی وہ 'پاچستان' تھا (یاد رہے کہ مینڈارن میں پاکستان کو 'پاچستان' بولا جاتا ہے) میں نے اپنے چینی دوست سے پوچھا کہ وہ آپ سے کیا چاہتا تھا، تو وانگ نے جواب دیا: وہ جاننا چاہتا تھا کہ آپ کہاں سے ہیں، جب میں نے اسے آپ کے ملک کے بارے میں بتایا تو اس نے کہا، ''اوہ پٹیا (آئرن برادرز) چین میں خوش آمدید۔''

اس کے کچھ دن بعد اسلام آباد میں، میرا ایک امریکی سفارت کار سے ٹاکرا ہو گیا۔ وہ بیجنگ مشن میں چند سال گزارنے کے بعد پاکستان میں نئے آئے تھے۔ اس سفارت کار نے مجھے بتایا ''تمام تر تجربات سے جو چیز مجھے سمجھ آئی، یہ ہے کہ چین میں چینی حکام کے لیے پاکستان ہمیشہ سب سے پہلے ہوتا ہے، بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ پاکستان کو دوسروں پر ہمیشہ فوقیت دی جاتی ہے۔''

پاکستان کے بارے میں یہ احترام ایک مضمون سے بھی واضح ہوا۔ یہ مضمون وسیع اشاعت والے چائنا ڈیلی میں ان دنوں شائع ہوا تھا جب 2018ء کے عام انتخابات میں عمران خان کی قیادت میں پاکستان تحریک انصاف (پی ٹی آئی) نے اکثریت حاصل کی تھی۔ نواز شریف اپنی وزارت عظمیٰ کے دور میں سی پیک کے پروجیکٹس کے ساتھ جو معاملات کر رہے تھے خان صاحب اپنے اپوزیشن کے زمانے میں ان پر تنقید کرتے رہے تھے۔ ان کی تنقید کا مرکزی نکتہ یہ تھا کہ سی پیک کے حوالے سے چین کے ساتھ معاہدوں میں شفافیت کا فقدان ہے۔ خان صاحب کے عروج نے چینیوں کو خاصا بے چین کر دیا اور انہیں خدشہ لاحق ہو گیا تھا کہ وہ (عمران خان) طے کئے گئے معاملات میں ضرور گڑبڑ کریں گے۔

ایک بظاہر پیشگی اقدام میں چائنا انسٹیٹیوٹ آف کنٹمپریری انٹرنیشنل ریلیشنز (CICIR) میں ریسرچ فیلو فو شیاؤ چیانگ نے سی پیک کے بارے میں شکوک وشبہات اور تنازعات دور کرنے کی کوشش کی اور چینی حکومت کو مشورہ دیا کہ وہ کوریڈور کی متنازع جہتوں کی پوری ہمدردی کے ساتھ تحقیقات کرے، جیسے چین کا قرضوں کا مبینہ تزویراتی جال، منصوبے کی غیر ہموار ترجیحات، چینی کمپنیوں کو غیر متناسب فوائد کی فراہمی، اور اس حوالے سے بے یقینی کہ بیجنگ طے کی گئی شرائط پر قائم رہے گا یا نہیں۔ انہوں نے لکھا ''پروگرام کے ساتھ آسانی سے اور ہموار انداز میں آگے بڑھنے اور اس منصوبے کے حوالے سے پائی جانے والی غلط فہمیوں اور تنازعات کو ختم کرنے کے لیے چین کو معقول اور موثر اقدامات کرنے چاہئیں۔'' مصنف نے حکومت کو مشورہ دیا کہ وہ پاکستان کی جانب سے منصوبوں کو آگے بڑھانے کی صلاحیت پر ''مکمل توجہ'' دے اور پاکستان کی ترقی کی ضروریات کو پورا کرنے کا عزم کرے۔ توانائی اور بنیادی ڈھانچے کی تعمیر کے علاوہ بیجنگ کو سختی سے اسلام آباد کی اصل ضروریات کا جائزہ لینا چاہئے اور سی پیک کو پاکستان کی قومی ترقی کی سٹرٹیجی کے ساتھ مربوط

کر کے ان ضروریات کو پورا کرنا چاہئے اور اس طرح پاکستان کی معیشت کو برآمدات پر مبنی معیشت بنانے کے سلسلے میں مدد کرنی چاہئے۔ انہوں نے مزید لکھا:

''پاکستانی میڈیا کے الزامات کے مطابق سی پیک پاکستان پر قرضوں کا بہت بڑا بوجھ ڈالے گا، اور پاکستانی لوگ اس پروگرام میں فعال طور پر شامل نہیں ہیں، چین پاکستان کے لیے قرضوں کی مدت مناسب طریقے سے بڑھانے پر غور کر سکتا ہے۔ چین اور پاکستان کو سی پیک کی تعمیر کے معاملات میں مزید پاکستانیوں کو شامل کرنے کی کوشش میں کوئی کسر نہیں چھوڑنی چاہیے۔ اس کے ساتھ ساتھ دونوں ملکوں کو سکولوں، ہسپتالوں اور ایسی عوامی سہولتوں کی تعمیر پر بھی توجہ دینی چاہئے جو عوام کی روزمرہ زندگی سے متعلق ہوں تا کہ سی پیک کے لیے عوامی حمایت کی ٹھوس بنیاد قائم کی جا سکے۔''

اس آرٹیکل کے ذریعے فو شیاؤ چیانگ نے چین میں پاکستان پر نظر رکھنے والوں، خاص طور پر جو بار بار کے تعاملات کی وجہ سے اس ملک کے بارے میں خاصے آگاہ ہیں، کی ترجمانی کی۔ یہ ایک چینی ماہرِ تعلیم کا اپنی حکومت کو غیر معمولی لیکن پُر زور مشورہ تھا: تنازعات کا ایک تیز، بروقت جواب۔ وہ تنازعات جو ناقدین نے پیدا کئے ہیں، جو شکوک وشبہات کی وجہ سے پیدا ہوئے ہیں، اور جو مغرب کی طرف سے سی پیک کے بارے میں تحفظات نے بڑھائے ہیں۔ اس سے اس اہمیت کا بھی اظہار ہوتا ہے جو چینی دانشور اور سرکاری حکام پاکستانی حساسیتوں کو دیتے ہیں۔

میں نے اس معاملے کی مزید چھان بین کا ارادہ کیا اور دونوں ملکوں میں اپنے چینی دوستوں سے دریافت کرنے نکلا۔

میری فہرست میں سب سے پہلے پروفیسر جو رونگ (Jo Rong) تھے، جو پہلے صحافی تھے اور پھر انہوں نے تعلیم کا شعبہ چن لیا۔ انہوں نے پاکستان سے گوانگمنگ ڈیلی (Guangming Daily) کے لیے چھ سال سے زیادہ عرصہ تک رپورٹنگ کی تھی۔ بیجنگ میں مجھ سے بات چیت کرتے ہوئے انہوں نے بتایا کہ پاکستان کس طرح ہمیشہ چین کے ساتھ کھڑا رہا، خاص طور پر اقوام متحدہ کے پلیٹ فارم پر، اس وقت جب بین الاقوامی ایشوز کو چینیوں کے بنیادی مفادات سے جوڑا گیا۔ انہوں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا، ''کبھی کبھی پاکستانی حکام خود اقوام

متحدہ اور دیگر بین الاقوامی فورموں پر چین کے لیے بات کرتے ہیں، جس سے مختلف بین الاقوامی مسائل پر چینی موقف میں بہت وزن پیدا ہو جاتا ہے۔''

استعارہ ''آئرن برادر'' بھی اسی غیر معمولی باہمی اضافی حمایت سے نکلا ہے۔ مجھے بتایا گیا تھا کہ ایک اور بھائی چارہ چین اور برازیل کے مابین موجود ہے۔ پروفیسر جورونگ نے واضح کیا ''ہم نے کبھی کسی دوسرے ملک کو اپنا آئرن برادر نہیں کہا۔''

دوطرفہ تعلقات کا یہ پہلو زیادہ تر بیرونی لوگوں اور تنقید کرنے والوں کے لیے نظر نہیں آتا۔ جیسا کہ اس حقیقت سے ظاہر ہے کہ مختلف افراد اور اداروں سے، خاص طور پر وہ جو سی پیک کے منصوبوں میں شامل ہیں، کہا گیا ہے کہ پاکستان میں کام کرتے وقت منافع کو ترجیح نہ دیں۔ اسلام آباد میں ایسی ہی ایک قومی کارپوریشن کے سی ای او کے ساتھ موجود ایک سینئر چینی اہلکار نے مجھے بتایا کہ ریاستی کارپوریشنوں کے اعلیٰ افسران منافع کے کم مارجن اور آپریشنل مشکلات کی شکایت کرتے ہیں لیکن ان سے کہا جاتا ہے کہ آگے بڑھیں اور اپنے کام مکمل کریں کیونکہ قومی مفاد کا یہی تقاضا ہے۔'' مذکورہ بالا سی ای او نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا، ''بھارت ہمارا بزنس پارٹنر ہے لیکن پاکستان آئرن برادر ہے، اور تجارتی مفادات جیسے معاملات سے محفوظ ہے۔ ہمارے لیڈر نے ہمیں بتایا کہ ہم یہاں منافع کے لیے نہیں ہیں بلکہ ترقی اور دوستی کے لیے ہیں، اس لیے ہمیں منافع یا نقصان سے قطع نظر کام جاری رکھنا چاہیے۔''

مجھے پاکستانیوں کے لیے چینیوں کے دلوں میں احترام کا مشاہدہ کرنے کا موقع مئی 2015ء میں واشنگٹن میں واقع انسٹی ٹیوٹ آف پیس امریکہ میں ایک سہ فریقی اجلاس کے دوران بھی ہوا تھا۔ چین کے انسٹی ٹیوٹ آف انٹرنیشنل ریلیشنز کے نائب صدر ڈونگ مینیو آن (Dong Manyuan) کے مطابق ''چین پاکستان تعلقات اتنے معصومانہ ہیں کہ اکثر ممالک اسے سمجھ بھی نہیں سکتے۔'' انہوں نے اپنی بات پر زور دے کر کہا، ''عالمی برادری کو چین پاکستان تعلقات کی خاص نوعیت کو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔''

ان شدید قسم کے تعاملات کے دوران زیادہ تر چینی حکام، جو تھنک ٹینکس اور تحقیقی اداروں کی نمائندگی کرتے تھے، امریکی ''ڈومور'' کے منتر ایا جسے وہ پاکستان پر تنقید سمجھتے ہیں، کی مذمت میں

غیر معمولی طور پر آگے بڑھ گئے تھے۔ چینی تھنک ٹینکرز کا زور دے کر کہنا تھا ''آپ کو 'ڈومور' کے اس تقاضے کو بند کر دینا چاہیے اور پاکستان نے اب تک جو کچھ کیا ہے، اس کی تعریف کرنا شروع کر دینی چاہیے۔ امریکہ اور اس کے اتحادیوں کو اس بات پر غور کرنا چاہیے کہ پاکستان کو نان سٹیٹ ایکٹرز کے بارے میں کس چیز نے دوہری اور جوڑ توڑ کے ذریعے نقصان سے بچنے کی پالیسی اپنانے پر مجبور کیا تھا۔''

واشنگٹن میں ایک اور مشاورت کے دوران چائنا انسٹی ٹیوٹ آف انٹرنیشنل سٹڈیز (CIIS) کے لیوشواین شینگ نے اس بات پر زور دیا تھا کہ پاکستان کس طرح بعض جغرافیائی سیاسی اثرات کی وجہ سے مشکلات کا شکار ہے اور بیرونی طاقتوں کو اس مشکل وقت میں اس کی مدد کرنی چاہیے۔ لیوشواین شینگ نے بیرونی سٹیٹ ایکٹرز سے کہا کہ وہ ''پاکستان کا جائزہ مقامی تناظر میں لیں اور مسائل کے حل باہر سے مسلط کرنے کے بجائے مقامی طریقے اختیار کریں۔'' انہوں نے یہ تقاضا بھی کیا ''حتیٰ کہ جوہری پھیلاؤ، انسداد دہشت گردی پر تعاون، اور ادارہ جاتی اصلاح جیسے معاملات پر بھی پاکستان کے ساتھ یکساں سلوک کیا جائے۔''

''جغرافیائی و سیاسی عوامل کی وجہ سے جن مشکلات کا سامنا ہے ان پر قابو پانے کے سلسلے میں کیا ہم نے پاکستان کی مدد کے لیے کافی کچھ کیا ہے؟'' اس نے ایک چینی دوست کی طرف سے انتہائی پرجوش پریزنٹیشنز میں سے ایک کے دوران سوال اٹھایا تھا۔ اس نے اس بات پر اتفاق کیا تھا کہ پاکستان کو پرانی پالیسیوں کو ترک کر دینا چاہیے (جو غیر ریاستی ایکٹرز پر انحصار کرتی تھیں)، لیکن اس کے ساتھ ساتھ امریکہ، بھارت اور دیگر سے بھی اپیل کی کہ انہیں پاکستان کے جائز تحفظات کو دور کرنا چاہیے جنہوں نے اسے اپنی شرائط پوری کرنے کے معاملے میں روک رکھا ہے۔

واشنگٹن ڈی سی میں ان اجلاسوں اور اس سے زیادہ بیجنگ اور شنگھائی میں ہونے والی ملاقاتوں نے چشم کشا بصیرت فراہم کی کہ دونوں ممالک کی لیڈرشپ پاکستان کی طرف کس نظر سے دیکھتی ہے۔ جہاں تک متصادم امریکیوں، چینیوں کے پاکستان کے ساتھ معاملات کا تعلق ہے تو وہ کچھ نتائج اخذ کرنے میں مددگار ہو سکتے ہیں۔ امریکی نقطۂ نظر بڑی حد تک انڈ وافغان تناظر میں مرتب کیا گیا ہے جبکہ چین کا پاکستان کے بارے میں بیانیہ ایک غیر مشروط اور ہمدردانہ بغلگیری والا

بیانیہ ہے۔ یہ بیانیہ نہ صرف سی پیک کو ایک علاقائی امن، تعاون اور باہمی طور پر فائدہ مند تجارت والی راہداری کے طور پر پیش کرتا ہے بلکہ پاکستان کو مطلوبہ حمایت فراہم کرنے کی ضرورت پر زور بھی دیتا ہے۔ وہ سپورٹ جو ادارہ جاتی اصلاحات اور ملک میں طالبان کی قیادت میں ہونے والی ظالمانہ دہشت گردی کے تناظر میں استعداد کار بڑھانے کے لیے ناگزیر ہے۔

پاکستان کی معیشت کی تعمیرِ نو کے ساتھ معاشی مدد کے لیے اس عزم کا زبردست اعادہ اس وقت کے چینی سفیر ہز ایکسیلینسی یاؤ جنگ (Yao Jing) نے کیا تھا۔ انہوں نے عزم ظاہر کیا تھا کہ ''چین عالمی سطح پر 'میڈ ان پاکستان' برانڈ بنانے اور اس کو فروغ دینے میں مدد کرے گا۔'' انہوں نے اسے ایک منفرد دوستی قرار دیا، دوسروں کے لیے ایک ماڈل، جس کی وہ پیروی کر سکیں۔ ''یہ چین کی نئی سفارت کاری اور پرامن بقائے باہمی کے پانچ اصولوں کی پرچم برداری ہے۔'' انہوں نے یہ بات مجھے اسلام آباد میں تین سال کی مدت گزارنے کے بعد واپس بیجنگ جانے سے تھوڑا عرصہ پہلے بتائی تھی۔

امریکی حکام اور تھنک ٹینکرز کا اصرار ہے کہ ترقیاتی منصوبوں پر کام شروع کرنے سے پہلے پاکستان کو استحکام کی ضرورت ہے۔ چینی ان کے اس موقف سے اتفاق نہیں کرتے۔ ان کا کہنا ہے ''ترقی استحکام سے مقدم ہے، دراصل یہ امن اور استحکام کا بنیادی پیش خیمہ ہے۔''

جو چیز پارٹنرشپ کی ایک چونکا دینے والی مثال ثابت ہوئی، وہ یونائیٹڈ سٹیٹس انسٹی ٹیوٹ آف پیس (یو ایس آئی پی) کے سینئر ریسرچ امریکی سکالر اینڈریو ولڈرز کا بھارت کو سہ فریقی بات چیت کے اس عمل میں شامل کرنا تھا اور یہ کام چین کے پاکستان کی طرف بڑھتے ہوئے جھکاؤ کو شک کی نظروں سے دیکھنے کے بعد ضد میں کیا گیا تھا۔ اینڈریو نے ایک چینی ماہرِ تعلیم سے سوال کیا ''آپ بی آر آئی کا آغاز بھارت سے کیوں نہیں کرتے کیونکہ پاکستان بہت تشدد کا شکار اور غیر مستحکم ہے؟'' اسے معلوم نہیں تھا کہ وہ ایک ریٹائرڈ چینی جنرل سے بات کر رہا ہے۔ جنرل صاحب نے طنزیہ انداز میں جواب دیا ''میرے دوست، ہم جانتے ہیں کہ کہاں اور کب کیا کرنا ہے۔''

اس بات چیت میں حصہ لینے والے ایک اور شخص نے امریکی حکام کی ملامت کرتے ہوئے یہ ردِعمل ظاہر کیا ''ایسے ملک کے ساتھ کیوں نہ جڑا جائے جس نے بے مثال قربانیاں دیں

لیکن بدلے میں اسے صرف تنقید کا نشانہ بنایا جاتا رہا۔'' چائنا انسٹی ٹیوٹ آف کنٹیمپریری انٹرنیشنل ریلیشنز (CICIR) کے ہوشوشینگ (Hu Shusheng) نے اس حقیقت کہ چین پاکستان ایک منفرد بندھن میں بندھے ہیں، کو اجاگر کرتے ہوئے کہا ''یہی وقت ہے ایک ایسے ملک کے نقصانات کا ازالہ کرنے کا جو سیاسی وجغرافیائی اثرات کی وجہ سے مسلسل نقصان اٹھا رہا ہے۔''

چینی دوستوں کی طرف سے پاکستان کا ایسا پُر زور دفاع نہ صرف حوصلہ افزا ثابت ہوتا ہے بلکہ ندامت اور شرمندگی کا باعث بھی بنتا ہے، جس کی وجہ بڑی سادہ سی ہے۔ یہ کہ زیادہ تر پاکستانی جب اپنے ملک کی مشکلات کا ذکر کرتے ہیں تو ان میں اس قسم کے تیقن کا فقدان پایا جاتا ہے۔ جب امریکی حکام اور محققین یہ اصرار کرتے رہے کہ پاکستان کو دوسروں کو قائل کرنے کی ضرورت ہے کہ وہ تمام دہشت گرد گروہوں، بشمول بھارت پر مرکوز لشکرِ طیبہ (LeT) کے خلاف بلا امتیاز کارروائی کرنے میں مخلص ہے تو ان کے چینی ہم منصب دوسری طرح کی سوچتے ہیں ''پاکستان کو اپنا خلوص ثابت کرنے کی ضرورت نہیں... یہ دہشت گردوں کے خلاف لڑ رہا ہے اور اس کی وجہ سے نقصان اٹھا رہا ہے۔''

چینی حکام کا کہنا ہے کہ چین پاک اور چین بھارت، دونوں تعلقات میں دوستانہ توازن برقرار رکھنا اہم ہے۔ وہ اس بات پر بھی زور دیتے ہیں کہ واشنگٹن اور دیگر مغربی دارالحکومتوں کی طرف سے نشاندہی کئے گئے خطرات کے باوجود بیجنگ سی پیک اور ادارہ جاتی اصلاحات میں مدد کرنے کے لیے پُرعزم ہے۔

نیشنل ڈیفنس یونیورسٹی (این ڈی یو) میں امریکی محکمہ خزانہ کے ایک ریٹائرڈ افسر کا مندرجہ ذیل تبصرہ اس بے چینی کو ظاہر کرتا ہے جو چین کی پاکستان میں سرمایہ کاری نے پاکستان میں پیدا کر دی ہے۔ ریٹائرڈ افسر نے کہا، ''ایک لمحے کے لیے سوچیں، چین کو دنیا کے اس حصے سے باہر نکال دیں تو کیا پاکستان برقرار رہ سکے گا؟''

یہ آڑا سوال پاکستان کے بارے میں امریکہ کے وسیع جذبات کی نشاندہی کرتا ہے، ایک ایسا ملک جسے شک کی نگاہ سے دیکھا جا رہا ہے اور جس کے بارے میں سمجھا جاتا ہے کہ پچھلی دو دہائیوں میں اس نے کافی کام نہیں کیا۔ اس طرح کی گھٹیا سوچ آسانی سے یہ چیز نظر انداز کر دیتی ہے

کہ داخلی عوامل کے علاوہ، جیو پولیٹیکس نے کس طرح اس ملک کو ایک سماجی اور اقتصادی بحران میں مبتلا کر رکھا ہے۔

تاہم اس جنت میں سب کچھ ٹھیک نہیں ہے کیونکہ ہمارے چینی دوست نجی طور پر اس بات پر فکر مند ہیں کہ پاکستانی قیادت بیجنگ کی جانب سے مدد اور غیر مبہم اظہارِ یکجہتی کو بروئے کار لا سکے گی یا نہیں۔ اس سے یہ وضاحت بھی ہو جاتی ہے کہ چینیوں کی اکثریت کیوں امریکی ماہرین کی اس سوچ سے متفق ہے کہ کور (Core) گورننس اور اقتصادی نقطۂ نظر میں تبدیلی اندر سے پیدا ہونی چاہیے۔ انسداد دہشت گردی اور انسداد بنیاد پرستی کی طویل مدتی حکمت عملیوں کو نافذ کرنے کے حوالے سے پاکستان کی صلاحیت پر سوالیہ نشان باقی ہے۔ بنیاد پرستانہ نظامی اصلاحات کے ذریعے معیشت کو پہنچنے والی نقصان کے ازالے کے عزم کے حوالے سے بھی صورتحال یہی ہے۔

ان سارے تحفظات کے باوجود چینی رہنما برکس (برازیل، روس، بھارت، چین، اور جنوبی افریقہ)، برکس پلس، ایس سی او، اور ہارٹ آف ایشیا (HoA) جیسے بین الاقوامی فورمز پر پاکستان کے ساتھ کھڑے ہونے کا موقع، چاہے علامتی ہی کیوں نہ ہو، ضائع نہیں جانے دیتے۔

دسمبر 2016ء میں امرتسر، بھارت میں افغانستان کے مسئلے پر بلائی گئی ہارٹ آف ایشیا کانفرنس کے اختتام پر جاری کیا گیا اعلامیہ بھی ایسا ہی ایک موقع تھا۔ وہاں چین، ایران اور روس کی مشترکہ حمایت نے میزبان بھارت، اور افغان صدر اشرف غنی کی طرف سے اپنی سرزمین پر ''دہشت گرد گروہوں'' کی مبینہ حمایت کے حوالے سے پاکستان کو مطعون کرنے کی کوششوں کو ناکام بنا دیا تھا۔

بھارت نے اس سے قبل اکتوبر (2016ء) میں گوا میں ہونے والے برکس سربراہی اجلاس کے دوران بھی چین اور روس کو پاکستان کے خلاف اپنے ساتھ شامل کرنے کی ناکام کوشش کی تھی۔ نئی دہلی نے امرتسر میں ہونے والی کانفرنس کو ایک بار پھر پاکستان کو بدنام کرنے کے موقع کے طور پر دیکھا، لیکن روسی ایلچی ضمیر کابلوف نے بھارتی بیانیہ کو پنکچر کر دیا۔ کابلوف نے کہا، ''پاکستان اور انڈیا کو ہارٹ آف ایشیا کانفرنس کو پوائنٹ سکورنگ کے لیے استعمال نہیں کرنا چاہئے اور تمام بڑے کھلاڑیوں کو چاہیے کہ وہ افغانستان کو ٹرانزیشن میں ہر ممکن تعاون فراہم کریں۔'' پھر کابلوف نے

روس پاکستان فوجی مشقوں کا حوالہ دیتے ہوئے سوال اٹھایا؛ ''بھارت کا امریکہ کے ساتھ قریبی تعاون ہے۔ کیا ماسکو نے کبھی شکایت کی؟ پھر پاکستان کے ساتھ بہت نچلی سطح کے تعاون کے بارے میں شکایت کیوں؟''

شاید نئی دہلی اور کابل، دونوں کے لیے یکساں طور پر پریشان کن ایرانی وزیر خارجہ جواد ظریف کی یہ پیشکش بھی تھی کہ پاک بھارت کشیدگی کو کم کرنے میں ایران مدد کر سکتا ہے۔ جواد ظریف نے زور دیتے ہوئے کہا تھا، ''اگر ایران دونوں میں سے کسی کی بھی کوئی مدد کر سکتا ہے تو ہم تیار ہیں کیونکہ دونوں پڑوسی ہمارے لیے بہت اہم ہیں۔''

چینی مندوبین نے یہ کہہ کر بھارت اور افغانستان، دونوں کو مایوس کر دیا تھا کہ پاکستان افغانستان میں امن کی کوششوں کے لیے ایک 'لازمی عنصر' ہے۔ یہ مطابقت پذیر نقطۂ نظر ہی تھا جس کے نتیجے میں ایک متفقہ اعلامیہ وجود میں آیا، جس میں نکتہ 14 بھی شامل تھا جس میں بڑے دہشت گرد نیٹ ورکس بشمول حقانی نیٹ ورک، مشرقی ترکستان اسلامی تحریک (ETIM)، اسلامی تحریک ازبکستان (IMU)، لشکر طیبہ (LeT)، جیشِ محمد (JeM)، تحریک طالبان پاکستان (TTP) اور جماعت الاحرار (JuA) کا ذکر موجود ہے۔ ایران، ترکی، چین اور روس کے ساتھ پسِ پردہ چھ ہفتوں کی محنت اور قریبی رابطہ کاری آخرکار رنگ لائی تھی۔ نکتہ نمبر 14 میں تمام ریاستوں سے مطالبہ کیا گیا تھا کہ وہ ''مذکورہ دہشت گرد گروہوں کے خلاف اپنی اپنی اینٹی ٹیررازم پالیسیوں، اپنی بین الاقوامی ذمہ داریوں اور اقوام متحدہ کی انسداد دہشت گردی کی حکمت عملی 2006ء کے تحت کارروائی کریں۔''

اس کا مطلب یہ بھی ہے کہ پاکستان کو جیشِ محمد اور لشکرِ طیبہ کے اعلامیہ میں نام موجود ہونے کا کوئی نقصان نہیں ہوا بلکہ اس نے تمام دہشت گرد گروہوں کے خلاف ہر ممکن طریقے سے اقدامات کرنے کا عزم ظاہر کیا۔ اس طرح ماسکو اور بیجنگ، دونوں کو یقین دلایا گیا کہ اسلام آباد دہشت گرد تنظیموں کو معاف نہیں کرے گا، نہ ہی کسی کو سرحد پار حملوں کے لیے اپنی سرزمین استعمال کرنے کی اجازت دی جائے گی۔

تاہم، یہ اتنا آسان نہیں تھا جتنا کہ لگ رہا تھا۔ پاکستان نے ایک جغرافیائی و سیاسی طور پر

پیچیدہ خطے میں دہشت گردی کے خلاف مہم میں جن پیچیدگیوں کا سامنا کیا، چینی اور روسی حکام نے ترکی کی حمایت سے اس کی تعریف کی۔ حتیٰ کہ افغانستان میں امریکی، نیٹو افواج کے اس وقت کے کمانڈر جنرل جان ڈبلیو نکلسن نے بھی اپنے ایک پالیسی بیان میں ان مشکلات کو اجاگر کیا تھا۔ نیویارک ٹائمز نے دسمبر 2016ء میں ان کے حوالے سے لکھا تھا، ''امریکہ یا اقوام متحدہ کی طرف سے پوری دنیا میں نامزد 98 دہشت گرد تنظیموں میں سے 20 افپاک خطے میں ہیں، اور یہ کسی علاقے میں مختلف گروہوں کی تعداد کا سب سے زیادہ ارتکاز ہے۔''

ان گروہوں میں داعش/ اسلامک اسٹیٹ آف خراسان پرووِنس (ISKP) بھی شامل تھی، اور نہ صرف پاکستان بلکہ چین، روس، ترکی اور ایران نے بھی اس مضبوط نقطہ نظر کے ساتھ اتفاق کیا تھا کہ یہ تنظیم عراق پر امریکی قیادت میں ہونے والے حملے کی راکھ سے ابھری۔ لہٰذا، واقعات میں آنے والے ایک موڑ پر ماسکو اور بیجنگ، دونوں افغان طالبان سے مؤخر الذکر کے داعش کے خلاف مضبوط دفاع کے طور پر کام کرنے کی صلاحیت کے بارے میں بات کرتے رہے۔ داعش، جو اس خطے میں دہشت گردی اور عدم استحکام کا نیا آلہ تھا اور جسے خطے کے دو بڑے ملک پر اکسی سمجھتے تھے۔ درحقیقت روس اور چین، دونوں نے اسے ایک نان سٹیٹ ایکٹر کو دوسرے نان سٹیٹ ایکٹر کے خلاف کھڑا کرنے کی ایک سوچی سمجھی چال تصور کیا تھا۔ اس کے برعکس بھارت، افغانستان اور امریکہ نے آئی ایس کے پی کے خطرے کو بڑھا چڑھا کر بیان کرنے کے الزامات لگانے میں کوئی وقت ضائع نہ کیا۔

چین کے اس غیر معمولی عروج، رفتار اور طاقت، دونوں لحاظ سے، نے بین الریاستی معاملات کے حوالے سے قوانین کو بنیادی طور پر تبدیل کر دیا ہے، اور یہ تبدیلی صرف ترقی پذیر دنیا کے لیے ہی نہیں آئی بلکہ یہ امریکہ اور یورپ سمیت تمام عالمی طاقتوں کے لیے بھی ہے۔ اپنی مضبوط اور پائیدار معاشی طاقت، جو اسے اپنے جیو پولیٹیکل اور جیو اکنامک ایجنڈے کو آگے بڑھانے کے لیے مطلوبہ زور فراہم کرتی ہے، سے چین کی سیاسی رسائی کئی گنا بڑھ گئی ہے۔ آج چین قومی مفادات کے لیے جیو اکنامک ٹولز کے ناقابل یقین حد تک اطلاق میں باقی دنیا کو پیچھے چھوڑ رہا ہے۔ اس ملک نے مشرق وسطیٰ، لاطینی امریکہ اور افریقہ میں اپنا اثر ورسوخ پھیلا اور بڑھا لیا ہے۔ چین افریقہ میں

امریکہ کی نسبت زیادہ سرمایہ کاری کرتا ہے۔ جنوبی امریکہ کے ممالک کو بھی چین کی بھاری امداد ملی ہے۔ اسی طرح بیجنگ جنوبی ایشیا، مشرقی ایشیا، مشرقِ وسطیٰ اور یورپ سمیت دیگر خطوں میں بھی مغربی مالیاتی طاقتوں کو چیلنج کر رہا ہے۔

دوسری طرف، داخلی دباؤ اور سست اقتصادی ترقی ترقی یافتہ معیشتوں کے عالمی سٹیج پر اپنا اختیار برقرار رکھنے کی خواہش اور صلاحیت، دونوں پر چوٹ لگا رہے ہیں جبکہ دوسری طرف ابھرتی ہوئی مارکیٹ کی معیشتیں (EMEs) اہم کردار ادا کرنے کی خواہاں ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ عالمی کثیر جہتی ادارے اتفاق رائے حاصل کرنا مشکل محسوس کر رہے ہیں اور اس طرح اہم معاملات پر جارحانہ اور متضاد آوازوں کے پھیلاؤ کی وجہ سے متفقہ کارروائی کا فقدان ہے۔ ان سب نے مغربی دنیا میں سیاست، معیشت اور ٹیکنالوجی کے حوالے سے قیادت کا خلا پیدا کر دیا ہے۔

غیر یقینی صورتحال اور جغرافیائی و سیاسی بہاؤ کی اس حالت میں یو ایس سٹریٹیجک کمپیٹیشن ایکٹ 2021ء میں نہ صرف چین کے ساتھ معاشی مسابقت کا مقابلہ کرنے کے اقدامات شامل ہیں بلکہ انسانی اور جمہوری اقدار، جیسے ایغور کے اقلیتی مسلمان کے ساتھ سلوک اور ہانگ کانگ میں جمہوریت کی حمایت، کے حوالے سے بھی اقدامات تجویز کئے گئے ہیں۔ یہ ایکٹ عوامی جمہوریہ چین کے بڑھتے ہوئے عالمی اثر و رسوخ کو روکنے کی راہ سجھاتا ہے۔ یہ کام امریکی پالیسی کے مقصد کو باضابطہ بنا کر ''اس کے عالمی قائدانہ کردار کو برقرار رکھنے'' کے ذریعے کیا جائے گا اور یہ اعلان کرتے ہوئے کہ چینی حکومت عالمی سٹیج پر امریکہ کا مقابلہ کرنے کے لیے اپنی سیاسی، سفارتی، اقتصادی، فوجی، تکنیکی اور نظریاتی طاقت کو بڑھا رہا ہے۔

سینیٹ کا حمایت یافتہ یہ ایکٹ دو طرفہ نقطۂ نظر کی عکاسی کرتا ہے۔ وہ نقطۂ نظر ریپبلکن اور ڈیموکریٹس، دونوں یکساں طور پر جس کے حامل ہیں۔ یہ کہ مختلف النوع حفاظتی (جبری) سیاسی اور کاروباری اقدامات کے ذریعے چین کا راستہ روکنے اور اس کے عالمی اثر و رسوخ کو محدود کرنے کی ضرورت ہے۔ وہ اقدامات جن کے بارے میں امریکہ کو یقین ہے کہ چین کے بڑھتے ہوئے اثر و رسوخ کو محدود کر سکتے ہیں۔ قدرتی طور پر اس کے نتیجے میں چین امریکہ مخاصمت بڑھ جائے گی جس سے دونوں کے باہمی تعلقات متاثر ہوں گے اور اس کے عالمی معاملات پر بھی شدید اثرات

مرتب ہوں گے۔ پاکستان بھی چین کے ساتھ ہمہ گیر دوستی اور سی پیک کی وجہ سے دباؤ میں آئے گا۔ اس کے علاوہ آئی ایم ایف (بین الاقوامی مالیاتی فنڈ) اور ایف اے ٹی ایف (فنانشل ایکشن ٹاسک فورس) کو بھی ہمارے خلاف استعمال کیا جا سکتا ہے جبکہ افغانستان کے ذریعے بھی ہم پر دباؤ بڑھایا جا سکتا ہے۔ سی پیک سمیت اپنے اہم قومی مفادات کے تحفظ کے لیے چین اور پاکستان، دونوں کو ایک میڈیا سٹریٹیجی پر ہم آہنگی بڑھانے کی ضرورت ہے تاکہ جاری پروپیگنڈا کا تدارک کیا جا سکے۔

یہ پیش رفتیں بتاتی ہیں کہ اس کی اقتصادی ترقی اور وژن، خاص طور پر جو بی آر آئی کی طرح عالمی سرمایہ کاری کے ذریعے وضع کیا گیا ہے، کے ساتھ چین کو ایک عالمی لیڈر، قریبی تجارتی پارٹنر اور یقیناً 'آئرن برادر' کے طور پر سمجھنے کی اشد ضرورت ہے۔ یوں یہ کتاب عالمی سٹیج پر چین کے کردار کے ایک مختصر پس منظر کو پیش کرنے کے لیے مرتب کی گئی ہے، جس میں خصوصی توجہ جنوبی ایشیا اور پاکستان پر مرکوز رہے گی۔ یہ کتاب تحریر کرنے کا مقصد پاکستان میں موجود لوگوں کے لیے چین کی ثقافت، تاریخ اور خارجہ پالیسی پر ایک ہینڈ بک مرتب کرنا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اس تصنیف کا مقصد چینی حکمرانی، سیاست، اور خارجہ پالیسی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالنا ہے۔ یہ ایسے موضوعات ہیں جن کو پاکستانی میڈیا اور تعلیمی حلقوں میں شاذ و نادر ہی کوّر کیا جاتا ہے۔ 'آہنی بھائی چارے کے پیچھے کیا ہے؟' اس تصنیف میں اس کا بھی مکمل سراغ لگایا گیا ہے۔

ایک اہم پیش رفت

کتاب تکمیل کے آخری مراحل میں تھی تو ایک اور بڑی پیش رفت سامنے آئی۔ چینی صدر شی جن پنگ کا تیسری مدت کے لیے منتخب ہونا۔

23 اکتوبر 2022ء شی جن پنگ کی قیادت میں چین کی سیاسی تاریخ کا ایک اہم دن تھا۔ اس روز شی جن پنگ، جو کمیونسٹ پارٹی آف چائنا (سی پی سی) کی مرکزی کمیٹی کے جنرل سیکرٹری بھی ہیں، تیسری بار صدر منتخب ہوئے اور انہوں نے عظیم ہال آف دی پیپلز میں میڈیا سے ملاقات کے دوران پارٹی کی نئی مرکزی قیادت کو پیش کیا۔ سی پی سی کی 20ویں مرکزی کمیٹی کے پولیٹیکل بیورو کی قائمہ کمیٹی کے چھ نو منتخب ارکان کے نام یہ ہیں: لی چیانگ، ژاؤ لیجی، وانگ ہننگ، کائی چی، ڈنگ

زوشیانگ اور لی شی۔

شی جن پنگ نے تیسری مدت کے آغاز میں کمیونسٹ پارٹی کے اعلیٰ ترین وفد کے ساتھ کمیونسٹ پارٹی کی مقدس سرزمین اور کمیونسٹ انقلاب کے گہوارے یانان شہر کا دورہ کیا۔ یہ شہر چین میں کمیونسٹ انقلاب کے بانی ماؤزے تنگ کے ساتھ جڑا ہوا ہے۔ تجزیہ کاروں کے مطابق شی جن پنگ کا دورہ ان کے اقتدار کے اگلے پانچ سالہ موضوعات کی جانب اشارہ کرتا ہے۔ ماؤزے تنگ کے بعد شی جن پنگ پارٹی کے دوسرے رہنما ہیں جنہوں نے پارٹی میں اتنا اختیار اور طاقت حاصل کی ہے۔ اس سفر میں صدر شی جن پنگ نے سابق صدر ماؤ کی رہائش گاہ کا بھی دورہ کیا۔ وہ اس ہال میں بھی گئے جہاں 1945ء میں سی پی سی کے ایک اہم اجلاس نے صدر ماؤ کی تقرری اور توثیق کی۔ یہ سارا عمل دراصل صدر شی جن پنگ کی جانب سے پارٹی کی تاریخ اور پالیسیوں میں اثر ورسوخ کو ظاہر کرتا ہے۔ مبصرین کے مطابق ان کے اس دورے سے آنے والے دنوں میں جغرافیائی معاملات اور مشکل صورتحال سے نمٹنے کے لیے بھرپور حکمت عملی پر انحصار کرنا بھی ظاہر ہوتا ہے۔ سرکاری میڈیا کے مطابق صدر شی جن پنگ نے اس عزم کا اظہار بھی کیا کہ وہ پارٹی کی جانب سے تشکیل دی گئی عمدہ انقلابی روایات اور وراثت کو لے کر آگے بڑھیں گے۔ یانان شہر شمال مغربی چین کے دور دراز پہاڑوں میں واقع ہے۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں پارٹی کے لانگ مارچ کی بنیادیں رکھی گئی تھیں۔ چینی خانہ جنگی کے دوران قوم پرست فوجیوں کے گھیرے سے بچنے کے لیے ایک سال کی طویل مہم جوئی کی گئی تھی۔ دسیوں ہزار لوگ راستوں میں مر گئے۔ جو بچے وہ شدید کمزور ہو چکے تھے۔ ماؤ اور ان کے اتحادی، جن میں صدر شی جن پنگ کے والد بھی شامل تھے، غاروں میں مزدوروں اور کسانوں کے ساتھ رہتے تھے، جب انہوں نے فوجی مہمات کی منصوبہ بندی کی تھی۔

قوم پرستوں پر کمیونسٹ پارٹی آف چائنا کی فتح نے یانان کو ایک تاریخی شہر بنا دیا اور اب اسے پارٹی کی مشکلات پر قابو پانے کی صلاحیت کی روشن مثال کے طور پر دیکھا جاتا ہے۔ صدر شی جن پنگ نے اپنے دورے کو پُرعزم اور تاریخی قرار دیتے ہوئے کہا کہ یانان شہر میں پوری پارٹی ماؤزے تنگ کے بینر تلے متحد ہوئی اور بے مثال اتحاد قائم کیا۔

نئی قیادت کے چناؤ کے لیے منعقد کی گئی کانگریس کا ایجنڈا درج ذیل تھا:

الف) ایک نئی مرکزی کمیٹی کا انتخاب

ب) صدر شی جن پنگ کے لیے پارٹی کے سربراہ کے طور پر تیسری مدت کے لیے معمول کی توثیق کرنا

س) پارٹی آئین میں ترامیم کو اپنانا

ایک ہفتہ طویل کانگریس کے اختتام کے ساتھ، شی جن پنگ جدید چین کے مضبوط رہنما کے طور پر سامنے آئے اور بیجنگ میں ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔

افتتاحی خطاب میں صدر شی جن پنگ نے انسدادِ بدعنوانی کے ساتھ ساتھ فوج اور دفاع کے بارے میں ایک مضبوط پیغام بھی دیا جس میں اسٹریٹیجک ڈیٹرنس کو بہتر بنانے کے وعدوں کے علاوہ وہ چیزیں بھی شامل تھیں جو 19 ویں کانگریس کی رپورٹ میں درج ہیں۔

انہوں نے کہا، ''ہمیں مشکل کے اپنے احساس کو مضبوط کرنا چاہیے، اپنی سوچ پر قائم رہنا چاہیے، امن کے وقت خطرے کے لیے تیار رہنا چاہیے، بارش کے دن کے لیے تیار رہنا چاہیے، اور تیز ہواؤں اور اونچی لہروں کے بڑے امتحانات کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔''

شی جن پنگ نے قومی سلامتی کو برقرار رکھنے، خوراک اور توانائی کی فراہمی کو یقینی بنانے، سپلائی چین کو محفوظ بنانے، آفات سے نمٹنے کی صلاحیت کو بہتر بنانے اور ذاتی معلومات کے تحفظ پر زور دیا۔ انہوں نے تائیوان کی آزادی کی مخالفت کو بھی دہرایا اور اس بات پر زور دیا کہ بیجنگ اسے اپنا حصہ سمجھتا ہے۔

صدر شی جن پنگ نے مندوبین کو بتایا، ''ہم نے اعتدال پسندی سے خوشحالی حاصل کی ہے جو چینی قوم کا ہزاروں سال پرانا خواب ہے۔ ہم نے نئے دور میں پارٹی اور ملک کے مقصد کو آگے بڑھانے کے لیے اچھی طرح سوچ سمجھ کر مکمل سٹریٹیجک منصوبے بنائے ہیں اور ایک نئے ترقیاتی فلسفے کو آگے بڑھایا اور لاگو کیا ہے۔ ہم نے زبردست سیاسی جرأت کے ساتھ اصلاحات کو جامع طور پر اپنایا ہے اور زیادہ فعال حکمت عملی پر عمل کیا ہے۔ ہم نے ترقی کے عوام پر مبنی فلسفے کو نافذ کیا ہے۔ ہم نے اس خیال پر عمل کیا ہے کہ سرسبز پانی اور سرسبز پہاڑ انمول اثاثہ ہیں۔''

ہفتہ بھر جاری رہنے والی کانگریس کے اختتام کے ساتھ ہی شی جن پنگ نے جدید چین کے نئے غیر متنازع رہنما کے طور پر اپنی طاقت کو مضبوط کر لیا۔ پورے چین کے نمائندوں نے متفقہ طور پر اس فلسفے کی توثیق کی جسے 'شی جن پنگ کی سوچ' کے نام سے جانا جاتا ہے، جس نے بڑی حد تک اندرونی، سماجی و اقتصادی ترقی اور بیلٹ اینڈ روڈ انیشی ایٹو کے ذریعے بیرونی تعاون کے طریقہ کار پر توجہ مرکوز کی۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ قرارداد میں بی آر آئی کا کوئی ذکر نہیں تھا جس میں سائنسی علم، تحقیق اور محنت سے اندرونی ترقی پر زیادہ توجہ دی گئی تھی۔ اس کی عکاسی 20ویں کانگریس کی 19ویں مرکزی کمیٹی کی رپورٹ سے متعلق قرارداد میں بھی ہے جسے ایک دن قبل متفقہ طور پر منظور کیا گیا تھا۔

چینی قوم کی تجدید اب ایک ناقابل واپسی تاریخی راستے پر ہے۔ اکیسویں صدی کے چین میں سائنسی سوشلزم جوش و خروش سے بھرا ہوا ہے۔

ملک بھر سے تقریباً 2340 مندوبین کے ساتھ کانگریس نے تین مستقل خصوصیات پر زور دیا جو چینی خصوصیات والے سوشلسٹ ماڈل گورننس کو جاری رکھنے کے لیے رہنما اصولوں کے طور پر کام کرتی ہیں یعنی مارکسزم-لینن ازم، ماؤزے تنگ نظریہ، ڈینگ شیاؤ پنگ تھیوری، تین نمائندوں کا نظریہ اور ترقی پر مبنی سائنسی آؤٹ لک۔

نئے دور کے لیے چینی خصوصیات کے ساتھ سوشلزم کے بارے میں شی جن پنگ کی سوچ اس دوران ایک اعلیٰ ترین فلسفہ ہے جو اب چین پر حاوی ہے۔

قرارداد میں کہا گیا ''یہ پارٹی کے لیے تمام نسلی گروہوں کے چینی لوگوں کو اکٹھا کرنے، چینی خصوصیات والے سوشلزم کے لیے نئی کامیابی حاصل کرنے میں ان کی رہنمائی کرنے کا ایک سیاسی اعلان اور عمل کا ایک پروگرام ہے۔ یہ ایک رہنما مارکسسٹ دستاویز ہے۔''

ایک دہائی قبل شی جن پنگ کے اقتدار سنبھالنے کے بعد سے ملک نے جو اقتصادی پیش رفت کی ہے، اس کے حوالے سے قرارداد میں کہا گیا کہ کانگریس اس بات پر زور دیتی ہے کہ ہم اس عظیم تبدیلی پر پوری پارٹی اور تمام نسلی گروہوں سے تعلق رکھنے والے چینی عوام کے مرہون منت ہیں جنہوں نے پارٹی کی مرکزی کمیٹی کی مضبوط قیادت میں کامریڈ شی جن پنگ اور ان کی فکر کی رہنمائی

میں اتحاد کے لیے جدوجہد کی۔

پارٹی نے پارٹی کی مرکزی کمیٹی اور مجموعی طور پر پارٹی میں کامریڈ شی جن پنگ کی بنیادی حیثیت کا تعین کیا، اور نئے دور کے لیے چینی خصوصیات والے سوشلزم کے بارے میں شی جن پنگ کی فکر کے رہنما کردار کو قائم کیا ہے۔ یہ کردار پارٹی، فوج اور چینی عوام کی مشترکہ خواہش کی عکاسی کرتا ہے، اور یہ نئے دور میں پارٹی اور ملک کے مقصد کے لیے اور قومی تجدید کے تاریخی عمل کو آگے بڑھانے کے لیے فیصلہ کن اہمیت کا حامل ہے۔

نئے دور میں چینی خصوصیات والے سوشلزم کو آگے بڑھانے کے لیے پارٹی کی مرکزی کمیٹی اور مجموعی طور پر پارٹی میں کامریڈ شی جن پنگ کی بنیادی حیثیت کے تعین کی فیصلہ کن اہمیت کے بارے میں گہرا ادراک پیدا کرنا انتہائی ضروری ہے۔ جیسے نئے دور کے لیے چینی خصوصیات والے سوشلزم پر شی جن پنگ کی سوچ کا رہنما کردار، سیاسی سالمیت کو برقرار رکھنے کی ضرورت کے بارے میں اپنے شعور کو مضبوط کرنے کے لیے بڑی تصویر کے لحاظ سے سوچنا، لیڈرشپ کور کی پیروی کرنا، اور پارٹی کی مرکزی قیادت کے ساتھ صف بندی میں رہنا، علاوہ ازیں چینی خصوصیات والے سوشلزم کے راستے، نظریے، نظام اور ثقافت میں پُراعتماد رہنا، پارٹی کی مرکزی کمیٹی اور مجموعی طور پر پارٹی میں کامریڈ شی جن پنگ کی بنیادی حیثیت کو برقرار رکھنے اور پارٹی کی مرکزی کمیٹی کے اختیارات اور اس کی مرکزی متحد قیادت کو برقرار رکھنے کے لیے سوچ، سیاسی موقف اور عمل میں کامریڈ شی جن پنگ کے ساتھ پارٹی کی مرکزی کمیٹی کی قریب سے پیروی کرنے میں زیادہ بامقصد ہونا۔

قرارداد کا اختتام پوری پارٹی، پوری فوج، اور تمام نسلی گروہوں کے چینی عوام سے پارٹی کی مرکزی کمیٹی کے ساتھ مل کر کامریڈ شی جن پنگ کے گرد جمع رہنے کی اپیل کے ساتھ ہوا، اس بات کو ذہن میں رکھنے کے لیے کہ خالی بات چیت ہی کام کرے گی۔

''ہمارے ملک کے لیے اور کچھ نہیں اور صرف ٹھوس کام سے ہی یہ پھلے پھولے گا، مضبوط اعتماد کو برقرار رکھنا، متحد ہونا، عزم کے ساتھ آگے بڑھنا، ہر لحاظ سے ایک جدید سوشلسٹ ملک کی تعمیر کے لیے متحد ہو کر جدوجہد کرنا اور تمام محاذوں پر قومی تجدید کو آگے بڑھانا۔''

ذیل میں ان 205 اراکین کی فہرست ہے جنہیں 20ویں کانگریس نے اختتامی اجلاس

میں منتخب کیا:

Ding Xuedong, Ding Xuexiang, Wan Lijun, Xi Jinping, Ma Xingrui, Ma Xiaowei, Wang Ning, Wang Kai (Henan), Wang Kai (PLA), Wang Yong, Wang Hao, Wang Qiang, Wang Peng, Wang Yi, Wang Xiaohong, Wang Guanghua, Wang Renhua, Wang Wenquan, Wang Wentao, Wang Yubo, Wang Zhengpu, Wang Dongming, Wang Weizhong, Wang Zhijun, Wang Xiubin, Wang Huning, Wang Junzheng, Wang Zhonglin, Wang Shouwen, Wang Chunning, Wang Lixia (f., Mongolian), Wang Xiaohui, Wang Xiangxi, Wang Qingxian, Wang Menghui, Ju Qiansheng, Mao Weiming, Yin Li, Yin Hong, Bater (Mongolian), Erkin Tuniyaz (Uygur), Shi Taifeng, Ye Jianchun, Feng Fei, Qu Qingshan, Ren Zhenhe (Tujia), Zhuang Rongwen, Liu Ning, Liu Wei, Liu Xiaoming, Liu Faqing, Liu Qingsong, Liu Guozhong, Liu Jinguo, Liu Jianchao, Liu Junchen, Liu Zhenli, Liu Haixing, Qi Yu, Xu Qin, Xu Kunlin, Xu Xueqiang, Sun Jinlong, Sun Shaocheng, Yin Hejun, Yan Jinhai (Tibetan), Li Yi, Li Wei, Li Xi, Li Qiang, Li Ganjie, Li Xiaoxin (f.), Li Fengbiao, Li Shulei, Li Yuchao, Li Lecheng, Li Yifei, Li Shangfu, Li Guoying, Li Bingjun, Li Qiaoming, Li Xiaohong, Li Hongzhong, Yang Cheng, Yang Zhiliang, Yang Xuejun, Xiao Jie, Xiao Pei, Wu Hansheng, Wu Yanan, Wu Zhenglong, Wu Xiaojun, He Weidong, He Lifeng, He Hongjun,

Zou Jiayi (f.), Ying Yong, Wang Haijiang, Shen Chunyao, Shen Xiaoming, Shen Yueyue (f.), Huai Jinpeng, Zhang Gong, Zhang Jun (SPP), Zhang Lin, Zhang Youxia, Zhang Shengmin, Zhang Yuzhuo, Zhang Qingwei, Zhang Hongbing, Zhang Hongsen, Zhang Yupu (Hui), Zhang Guoqing, Lu Hao, Lu Zhiyuan, Chen Gang, Chen Xu (f.), Chen Yixin, Chen Xiaojiang, Chen Wenqing, Chen Jining, Chen Min'er, Nurlan Abelmanjen (Kazak), Miao Hua, Lin Wu, Lin Xiangyang, Yi Huiman, Yi Lianhong, Luo Wen, Jin Zhuanglong, Jin Xiangjun, Zhou Qiang, Zhou Naixiang, Zhou Zuyi, Zheng Shanjie, Zheng Xincong, Meng Fanli, Meng Xiangfeng, Zhao Long, Zhao Gang, Zhao Yide, Zhao Leji, Zhao Xiaozhe, Hao Peng, Hu Zhongming, Hu Yuting, Hu Changsheng, Hu Heping, Hu Chunhua, Hu Henghua, Zhong Shaojun, Xin Changxing, Hou Kai, Hou Jianguo, Yu Qingjiang, Yu Jianhua, He Rong (f.), He Junke, Qin Gang, Qin Shutong, Yuan Huazhi, Yuan Jiajun, Tie Ning (f.), Ni Hong, Ni Yuefeng, Xu Lin, Xu Xisheng, Xu Zhongbo, Xu Qiling, Xu Deqing, Yin Yong, Gao Xiang, Gao Zhidan, Guo Puxiao, Tang Renjian, Tang Dengjie, Huang Ming, Huang Qiang, Huang Shouhong, Huang Kunming, Huang Jianfa, Huang Xiaowei (f.), Gong Zheng, Chang Dingqiu, Tuo Zhen, Liang Yanshun, Liang Huiling (f.), Shen Yiqin (f., Bai), Dong Jun, Han Jun, Han Wenxiu, Jing Junhai,

Cheng Lihua (f.), Fu Hua, Tong Jianming, Xie Chuntao, Lan Tianli (Zhuang), Lan Fo'an, Lou Yangsheng, Lei Fanpei, Shen Haixiong, Cai Qi, Cai Jianjiang, Pei Jinjia, Pan Yue

آج کا چین

عالمی ترقی کا اقدام

چین کے صدر شی جن پنگ نے جون 2022ء میں عالمی ترقی پر ایک اعلیٰ سطحی ڈائیلاگ کی صدارت کی تھی۔ اس ڈائیلاگ کا موضوع تھا: 'ایجنڈا برائے پائیدار ترقی 2030ء کو مشترکہ طور پر نافذ کرنے کے لیے نئے دور کی عالمی ترقیاتی شراکت داری کو فروغ دینا'۔

اس اقدام کو اب تک 100 سے زیادہ ممالک اور بین الاقوامی تنظیموں کی حمایت حاصل ہو چکی ہے، اور 68 ممالک اقوام متحدہ کے 'گروپ آف فرینڈز آف دی گلوبل ڈویلپمنٹ انیشی ایٹو (GDI)' میں شامل ہو چکے ہیں۔ جی ڈی آئی مندرجہ ذیل بنیادی اقدار کی پاسداری کرتا ہے:

'ترقی کے عزم کو اولین ترجیح کے طور پر برقرار رکھنا، عوام پر مرکوز حکمت عملی، سب کے لیے فوائد، کسی ملک اور کسی فرد کو پیچھے نہ چھوڑنا یعنی سب کو ساتھ لے کر چلنا، جدت پر مبنی ترقی، فطرت اور لوگوں کے درمیان ہم آہنگی کے عزم کو برقرار رکھنا، اور نتائج پر مبنی افعال کے عزم کو برقرار رکھنا'۔

عالمی سکیورٹی کے لیے اقدام

21 فروری 2023ء کو چینی صدر شی جن پنگ کی طرف سے گلوبل سکیورٹی انیشی ایٹو (GSI) پیش کیا گیا۔ یہ انیشی ایٹو اقوام اور ممالک پر زور دیتا ہے کہ وہ یکجہتی کے جذبے کے ساتھ تیزی سے بدلتے ہوئے عالمی ماحول کے مطابق خود کو ڈھالیں اور اس سلسلے میں کامیابی کے جذبے کے ساتھ پیچیدہ اور باہم جڑے ہوئے سکیورٹی خدشات سے رجوع کریں۔ گلوبل سکیورٹی انیشی ایٹو (GSI) بین الاقوامی تنازعات کی بنیادی وجوہات کو ختم کرنے، عالمی سلامتی کے نظم و نسق کو بڑھانے،

عالمی سطح پر پائیدار امن اور ترقی کو فروغ دینے کی راہ سجھاتا ہے اور ایک ہنگامہ خیز اور بدلتے ہوئے ماحول میں استحکام اور یقین محکم فراہم کرنے کے لیے تعاون پر مبنی عالمی کوششوں کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔

شی جن پنگ کے وژن کا بنیادی مقصد مشترکہ سلامتی کے تصور کو فروغ دینا اور ہر ریاست کی سلامتی کا احترام اور تحفظ کرنا ہے۔ یہ ایک جامع نقطہ نظر ہے، جس میں روایتی اور غیر روایتی دونوں شعبوں میں سکیورٹی کو برقرار رکھنا اور اقوام متحدہ کے چارٹر اور بین الاقوامی اصولوں پر کاربند رہتے ہوئے مربوط انداز میں سکیورٹی گورننس کو بڑھانا شامل ہے۔ شی جن پنگ کا خیال ہے کہ سرد جنگ کی ذہنیت، یک رُخا نظام، بلاک پر مبنی تنازعات اور بالا دستی اقوام متحدہ کے چارٹر کی روح کے خلاف ہے اس لیے ان کی مزاحمت کی جانی چاہیے اور اسے مسترد کرنا چاہیے۔ اس کے علاوہ، کثیر جہتی تعاون کے لیے بین الاقوامی تنظیموں، جیسے آسیان (ASEAN)، بی آر آئی (BRI)، ایس سی او (SCO)، اے یو (AU) وغیرہ کو کثیر جہتی خطرات سے نمٹنے اور تعاون کے مواقع نکالنے کے لیے مضبوط اور پائیدار بنایا جانا چاہیے۔

مزید برآں، بین الاقوامی مالیاتی فنڈ کے ایک اہلکار نے فروری 2023ء میں کہا تھا کہ چین عالمی افراط زر کو بڑھائے بغیر 2023ء میں عالمی نمو میں سب سے بڑا حصہ دار بننے جا رہا ہے۔ چین میں آئی ایم ایف کے سینئر ریزیڈنٹ نمائندے سٹیون بارنیٹ نے کہا تھا کہ فنڈ کو توقع ہے کہ چین اس سال عالمی ترقی میں تقریباً ایک تہائی حصہ ڈالے گا، جس سے یہ ملک عالمی ترقی میں واحد سب سے بڑا حصہ دار بن جائے گا۔ بارنیٹ نے بتایا تھا کہ جنوری میں آئی ایم ایف کے ورلڈ اکنامک آؤٹ لک اپ ڈیٹ کے مطابق، اس سال عالمی پیداوار میں 2.9 فیصد اضافے کی پیش گوئی کی گئی ہے، جس میں چین کی طرف سے تقریباً 1 فیصد حصہ دینے کی توقع ہے۔

عرب چین سربراہی اجلاس

7 دسمبر 2022ء کو چینی صدر شی جن پنگ نے مشرق وسطیٰ کا پہلا دورہ کیا تھا۔ اس دورے کو عرب دنیا کے ساتھ ایک تاریخی سفارتی کامیابی قرار دیا جا سکتا ہے۔ شی جن پنگ نے اس موقع پر ثقافت، معیشت، سائنس اور علاقائی سلامتی کے شعبوں میں طویل مدتی سٹریٹیجک معاہدوں تک پہنچنے

اورانہیں قائم رکھنے کے لیے جی سی سی (خلیج تعاون کونسل) کے سربراہان مملکت سے بھی ملاقات کی۔ چینی وزارت خارجہ نے اسے ''چین عرب تعلقات کے فروغ کی تاریخ میں ایک عہد ساز سنگ میل'' قرار دیا تھا۔

عرب دنیا اور چین کے مابین تعلقات کا گہرا ہونا کثیر قطبی اتحاد کی طرف ایک اہم پیش رفت ہے۔ اپنی ملاقات کے دوران، چین کے صدر شی جن پنگ نے کہا کہ چین اور خلیجی ممالک کو تیل اور گیس کی تجارت یوآن کے ذریعے کرنے پر آمادگی کے لیے شنگھائی پٹرولیم اینڈ نیشنل گیس ایکسچینج کا ایک پلیٹ فارم کے طور پر بھرپور استعمال ہونا چاہیے، تاکہ امریکی ڈالر پر انحصار کم کیا جا سکے۔

2021ء میں سعودی عرب کے ساتھ چین کی تجارت بڑھ کر 87.3 بلین ڈالر تک پہنچ چکی تھی اور اس میں 2020ء کے مقابلے میں 39 فیصد اضافہ دیکھا گیا، جبکہ اس دوران امریکہ اور سعودی عرب کی تجارت گھٹ کر 2021ء میں صرف 29 بلین ڈالر رہ گئی' جو 2012ء میں 76 بلین ڈالر تھی۔ مزید برآں، بیجنگ اور ریاض کے مابین لین دین اب چینی یوآن کے ذریعے کیا جا سکے گا جس سے امریکہ اور سعودی کے مابین تعلقات میں تناؤ بڑھے گا۔

شی جن پنگ نے اپنی تقریر میں اگلے تین سے پانچ برسوں میں تعاون کے لیے دیگر شعبوں کا بھی ذکر کیا۔ ان شعبوں میں فنانس اور سرمایہ کاری، جدت کاری اور نئی ٹیکنالوجیز، ایرو سپیس، اور زبان وثقافت شامل ہیں۔

توانائی کے محاذ پر پیش رفت یہ ہے کہ چائنا انرجی کارپوریشن سعودی عرب میں 2.6 گیگا واٹ کا ایک وسیع وعریض سولر پاور سٹیشن بنا رہی ہے، اور چینی جوہری ڈویلپرز ریاض کی یورینیم کے وسیع وسائل تیار کرنے میں مدد کر رہے ہیں۔

صدر کے طور پر شی جن پنگ کی تیسری مدت کا آغاز

10 مارچ 2023ء کو شی جن پنگ نے بیجنگ کے عظیم ہال آف دی پیپل میں چین کے صدر کے طور پر اپنی تیسری مدت کا آغاز کیا، اور تاریخ کے سب سے طاقتور رہنماؤں میں سے ایک کے طور پر اپنا مقام حاصل کیا۔ 2952 متفقہ ووٹ حاصل کرنے پر ان کا والہانہ استقبال کیا گیا۔ اس

کامیابی سے ان کے اختیارات کو تقویت ملی' اور ماؤزے تنگ کے بعد کمیونسٹ چین کے سب سے طاقتور ریاستی رہنما کے طور پر ان کی پوزیشن محفوظ ہوئی ہے۔

چین کا ایران سعودی تنازع ختم کرانے میں ثالث کا کردار

10 مارچ 2023ء کو ہی چین کی جانب سے سعودی عرب اور ایران کے مابین امن مذاکرات میں ثالثی کی کوششیں کامیاب ہوئیں۔ اس روز دونوں ملک باہمی تعلقات کی بحالی پر متفق ہوئے۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ اس انکشاف سے پہلے دونوں ملکوں کے مابین دیرینہ تنازعات کو ختم کرانے میں چین کے بطور سہولت کار کردار کے بارے میں کسی کو کچھ معلوم نہیں تھا۔

چین کے سینئر ترین ڈپلومیٹ وانگ ژی نے اس بارے میں اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہا کہ چین جغرافیائی و سیاسی مسائل سے نمٹنے میں ایک میزبان کے طور پر اپنا کردار جاری رکھے ہوئے ہے اور موجودہ صورت حال میں کسی بھی طرح کی مدد کی پیشکش کے لیے ایک ملک کے طور پر ذمہ داری قبول کرتا ہے۔ وانگ نے مزید کہا کہ ''نیک نیت'' اور ''قابل اعتماد'' ثالث کے طور پر، چین نے ڈائیلاگ کے میزبان کے طور پر اپنے فرائض ہمیشہ پورے کیے ہیں۔

دونوں ممالک (سعودی عرب اور ایران) کے درمیان تعلقات 2006ء سے منقطع ہیں؛ تاہم حالیہ امن مذاکرات کے بعد مشترکہ بیان میں تعلقات کی بحالی پر زور دیتے ہوئے کہا گیا ہے کہ ''زیادہ سے زیادہ دو ماہ کے اندر اندر'' سفارت خانے دوبارہ کھولے جائیں گے۔

دونوں ملک 22 سال قبل طے پانے والے اور دستخط کیے گئے ایک سکیورٹی معاہدے کو دوبارہ نافذ کرنے کا بھی ارادہ رکھتے ہیں۔ اس معاہدے کے تحت فریقین نے دہشت گردی، منشیات کی سمگلنگ اور منی لانڈرنگ کے معاملات پر ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ دونوں 1998ء میں طے پانے والے تجارت اور ٹیکنالوجی کے معاہدے کو بحال کرنے پر بھی متفق ہوئے ہیں۔

واشنگٹن ڈی سی میں قائم عرب گلف سٹیٹ انسٹی ٹیوٹ کے سینئر ریذیڈنٹ سکالر رابرٹ موگیلنکی نے الجزیرہ کو بتایا ''ثالثی کے تحت کی گئی یہ ڈیل اس بات کے ثبوت کے طور پر سامنے آئی ہے

کہ چین مشرق وسطیٰ میں اپنی موجودگی میں اضافہ کر رہا ہے اور اس خطے میں اپنا کردار بڑھانے میں زیادہ دلچسپی ظاہر کر رہا ہے۔''

اسی انسٹی ٹیوٹ کے سکالر حسین ابیش کا کہنا ہے ''حقیقت یہ ہے کہ بیجنگ میں جس بات پر اتفاق کیا گیا ہے وہ خود چین کے لیے اور خلیجی خطے میں ایک سفارتی اور سٹریٹیجک کھلاڑی کے طور پر اس کے عروج کے لیے بہت اہم ہے۔''

یوکرین روس جنگ: 12 نکاتی امن منصوبہ

روس کی جانب سے اپنے ہمسایہ ملک یوکرین پر حملہ کرنے کے ٹھیک ایک سال بعد 24 فروری 2023ء کو چین نے روس اور یوکرین کے درمیان جاری اس تنازع پر اپنا 12 نکاتی مقالہ پیش کیا، جس میں فریقین کے درمیان مخاصمت کو روکنے اور براہ راست بات چیت کا مطالبہ کیا گیا۔ چین کے اس ایجنڈے کا شدت سے انتظار کیا جا رہا تھا۔

اس منصوبے، جس کا اعلان چینی وزارت خارجہ نے کیا تھا، کے تحت روس کے خلاف مغربی پابندیوں کو ہٹانے، شہریوں کے انخلا کے لیے انسانی ہمدردی کی بنیاد پر راہ داریوں کی تشکیل، اور گزشتہ سال رکاوٹوں کی وجہ سے اناج کی برآمدات پر پابندی عائد تھی اسے ختم کرنے کے بعد اناج کی برآمدات کو تحفظ دینے کے اقدامات کا مطالبہ کیا گیا ہے۔ عالمی سطح پر یہ بات بڑی شدت سے محسوس کی جا رہی ہے کہ اناج کی برآمدات میں رکاوٹوں کی وجہ سے دنیا بھر میں خوراک کی قیمتوں میں اضافہ ہوا ہے۔

اس تجویز کا بنیادی مقصد دیرینہ چینی اصولوں کی وضاحت کرنا ہے، جیسے کہ تمام اقوام کی ''خود مختاری، آزادی اور علاقائی سالمیت کی مؤثر ضمانت دی جائے۔'' مزید برآں، جوہری ہتھیاروں کے خطرے یا ان ہتھیاروں کے استعمال کی مخالفت کی جانی چاہیے، اور جوہری پاور پلانٹس کو محفوظ رکھا جانا چاہیے۔

اس حکمت عملی میں اس چیز کو ختم کرنے پر بھی زور دیا گیا جسے بیجنگ عام طور پر ''سرد جنگ کی ذہنیت'' قرار دیتا ہے، اور جسے وہ دنیا پر امریکی تسلط اور دوسرے ممالک کے اندرونی معاملات

میں مداخلت کے طور پر دیکھتا ہے۔

روس چین سربراہی اجلاس

20 مارچ 2023ء کو صدر شی جن پنگ نے ماسکو کا تین روزہ دورہ کیا اور کریملن میں روسی صدر ولادیمیر پوٹن سے ملاقات کی۔ دونوں رہنماؤں نے سفارتی، دفاعی اور تجارتی تعلقات کو مضبوط بنانے اور باہمی دلچسپی کے امور پر طویل گفتگو کی۔

گزشتہ برس سے جاری روس یوکرین جنگ کے بعد شی جن پنگ کا روس کا یہ پہلا دورہ تھا۔ اس ملاقات کے پہلے نصف دورانیے میں یوکرین کی جنگ پر بات کی گئی اور یہ موضوع بات چیت کا ایک مرکزی نکتہ رہا۔ پیوٹن نے شی جن پنگ کو بتایا کہ ''گزشتہ چند برسوں میں چین نے ایک زبردست چھلانگ لگائی ہے اور اس پیش رفت نے پوری دنیا میں اس کے بارے میں دلچسپی پیدا کر دی ہے، لیکن بدقسمتی سے حسد کرنے والے بھی کم نہیں ہیں۔''

شی جن پنگ، جنہوں نے پیوٹن کو اپنا ''عزیز دوست'' قرار دیا، نے اپنے روسی ہم منصب کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ ان کے ملک کی ترقی کے عمل میں ''نمایاں بہتری'' آئی ہے۔

روس اور چین نے وسعت اختیار کرتی سٹریٹیجک شراکت داری اور اقتصادی تعاون کے معاہدے پر مشترکہ بیان بھی جاری کیا۔ دونوں رہنماؤں نے ایک معاہدے پر دستخط کیے جس کا مقصد دونوں ملکوں کے تعلقات کو تعاون کے ''نئے دور'' میں لے کر آنا ہے۔ شی جن پنگ نے اس موقع پر کہا کہ چین اور روس کو باہمی طور پر سیاسی تعاون کو آگے بڑھانے کے لیے مزید قریبی طور پر مل کر کام کرنا چاہیے۔ جواب میں صدر پیوٹن نے کہا کہ ''تمام معاہدے طے پا چکے ہیں'' اور یہ کہ ماسکو اور بیجنگ کے مابین اقتصادی تعاون روس کے لیے ''ترجیح'' ہے۔

روسی توانائی کا خریدار

چین رعایتی روسی تیل اور گیس کا ایک بڑا خریدار بن کر ابھرا ہے کیونکہ مغربی خریداروں نے توانائی کی درآمدات پر پابندی لگا دی ہے۔ امسال جنوری اور فروری میں روس چین کو تیل فراہم

کرنے والا سب سے بڑا ملک تھا۔ روس چینی سامان کی درآمدات میں بھی اضافہ کر رہا ہے جن میں مشینری، الیکٹرانکس، دھاتیں، گاڑیاں، بحری جہاز اور ہوائی جہاز شامل ہیں۔ چینی کسٹمز کے اعداد و شمار کے مطابق، 2022ء میں روس کو چین کی برآمدات 76.12 بلین ڈالر تک پہنچ چکی تھیں' جو اس سے پچھلے سال کی 67.57 بلین ڈالر کی برآمدات سے زیادہ تھیں۔

کثیر جہتی فریم ورکس/لوگوں کے لوگوں سے تبادلوں' کے تحت کاوشیں

دونوں ممالک (روس اور چین) نے شنگھائی کوآپریشن آرگنائزیشن، برکس (BRICS) اور جی ٹونٹی (G20) کے اندر کام کرنے کا عہد کر رکھا ہے، تاکہ کووڈ کے بعد کی اقتصادی بحالی اور عالمی گورننس اور بین الاقوامی ترقی کو بہتر بنایا جا سکے۔ روس جہاں یوکرین جنگ سے پیدا ہونے والے بحران کے حل میں مثبت کردار ادا کرنے پر چین کی رضامندی کا خیر مقدم کرتا ہے، وہیں مغرب کی طرف سے اس بات پر شکوک وشبہات بڑھتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں کہ آیا چین امن ساز کا کردار ادا کر رہا ہے اور غیر جانبدار ہے؟ جغرافیائی و سیاسی اتحادوں کے درمیان بڑھتے ہوئے تناؤ اور تبدیلی کے باوجود شی جن پنگ اور پوٹن اقتصادی تعاون کے لیے ہر ممکن حد تک قریبی طور پر کام کرنے کے لیے اپنی بنیاد پر کھڑے ہیں اور اپنے ملکوں کے باہمی تعلقات کو اب تک کے بہترین تعلقات قرار دیتے ہیں۔

حالیہ کچھ پیش رفتوں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ چین کو سفارتی طور پر امریکہ پر برتری حاصل ہے کیونکہ وہ اپنی عدم مداخلت کی پالیسی پر عمل پیرا ہے اور امریکہ کے برعکس امن سازی کا کردار ادا کر رہا ہے، جو بڑھتے ہوئے علاقائی تنازعات میں فریق بن رہا ہے۔

عالمی تجارت میں یوآن کا عروج: ڈالر کے غلبے کو خطرات لاحق

عالمی معیشت میں اس وقت اس سوال کی بازگشت واضح طور پر سنی جا سکتی ہے کہ بین الاقوامی تجارت میں امریکی ڈالر اپنا تسلط برقرار رکھ پائے گا یا نہیں؟ اور وجہ اس کی یہ ہے کہ بین الاقوامی تجارت میں چین کی کرنسی یوآن کا اثر ورسوخ تیزی سے بڑھ رہا ہے۔ امریکہ چین تنازع کے

ماہر پروفیسر فرینک تانگ نے 27 مارچ 2023ء کو 'ساؤتھ چائنا مارننگ پوسٹ' میں شائع ہونے والے اپنے مضمون میں لکھا تھا کہ ایک دہائی قبل جب چین نے تجارتی لین دین یوآن میں کرنے کا فیصلہ کیا تھا اس وقت سے لے کر اب تک دوسرے ممالک میں یوآن کا استعمال مضبوط ہوا ہے۔

یوآن کس تیزی سے طاقت پکڑ رہا ہے اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ مارچ 2023ء کے اواخر میں چین نے یوآن کے تحت توانائی کا پہلا معاہدہ کیا۔ اس معاہدے کے مطابق چین نے یوآن کے بدلے تقریباً 65000 ٹن اماراتی مائع قدرتی گیس (LNG) خریدنا ہے۔ رائٹرز نے ٹوٹل انرجیز کے حوالے سے لکھا کہ چین یوآن کے بدلے متحدہ عرب امارات سے ایل این جی درآمد کرے گا۔

چین نے اپنی مقامی کرنسی میں تجارت کرنے کے بارے میں مشرق وسطیٰ اور شمالی افریقہ کے ممالک کے ساتھ متعدد بار بات چیت کی ہے۔ 2023ء کے اوائل میں عراق کے مرکزی بینک نے کہا تھا کہ وہ چین کے ساتھ یوآن میں تجارت کرے گا۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ عراق کو امریکی ڈالر کی کمی کا سامنا ہے کیونکہ اسے امریکی فیڈرل ریزرو کی طرف سے پابندیوں کا سامنا ہے۔ اسی سال جنوری میں، سعودی وزیر خزانہ محمد الجدعان نے ڈیووس میں ورلڈ اکنامک فورم کے موقع پر بلوم برگ کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا تھا کہ ان کا ملک ''تجارت کو بہتر بنانے'' کے حوالے سے امریکی ڈالر کے علاوہ دیگر کرنسیوں میں بھی تجارت کے لیے تیار ہے۔ تب انہوں نے یہ بھی بتایا تھا کہ ان کی مملکت یوآن میں چین کو تیل کی فروخت کی قیمتوں کا تعین کرنے پر غور کر رہی ہے۔ مصر نے اگست 2022ء میں یوآن میں بانڈز جاری کرنے کے اپنے منصوبوں کا اعلان کیا تھا جبکہ اسرائیل نے گزشتہ اپریل میں اپنے غیر ملکی ذخائر میں کینیڈین اور آسٹریلوی ڈالر کے ساتھ یوآن کو بھی شامل کیا تھا۔ گزشتہ برس دسمبر میں سعودی عرب کے دورے کے دوران، چینی صدر شی جن پنگ نے خلیجی ممالک سے مطالبہ کیا کہ وہ یوآن میں توانائی کی تجارت کے لیے شنگھائی پٹرولیم اور قدرتی گیس ایکسچینج کو استعمال کریں۔

بلومبرگ کی ایک رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ یوکرین کے حملے کے ایک سال بعد چائنیز یوآن روس میں امریکی ڈالر کی جگہ سب سے زیادہ استعمال ہونے والی کرنسی بن چکا ہے۔ ماسکو ایکسچینج

کے اعداد و شمار کے مطابق، یوآن نے فروری 2023ء میں ماہانہ تجارتی حجم میں ڈالر کو پیچھے چھوڑ دیا جبکہ مارچ میں ڈالر کے مقابلے میں یوآن کے استعمال میں مزید اضافہ ہوا۔ یاد رہے کہ یوکرین پر حملے سے قبل، روس میں یوآن کا تجارتی حجم نہ ہونے کے برابر تھا یعنی بہت کم تھا۔ روس یوکرین جنگ کے تناظر میں مغربی پابندیوں نے روس کو مجبور کیا ہے کہ وہ اپنی غیر ملکی تجارت کو ڈالر اور یورو کے بجائے ان ملکوں کی کرنسیوں سے بدل دے جنہوں نے مغربی پابندیوں کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا ہے۔ واشنگٹن پوسٹ میں شائع ہونے والے اپنے ایک آرٹیکل میں فرید زکریا نے لکھا کہ اگر ڈالر کی منفرد حیثیت کم ہوئی تو امریکہ کو مشکل صورت حال کا سامنا کرنا پڑے گا۔ امریکہ تجارتی میدان میں پہلے ہی چین سے خائف تھا' یوآن کی اڑان نے امریکی انتظامیہ کو ایک نئی فکر میں مبتلا کر دیا ہے۔

چین اور آرٹیفشل انٹیلی جنس

ایک امریکی تھنک ٹینک نے کچھ عرصہ قبل خبردار کیا تھا کہ چین کے مصنوعی ذہانت (آرٹیفشل انٹیلی جنس) کے میدان میں ترقی کرنے کے ساتھ دنیا کا اقتصادی اور عسکری توازن تبدیل ہو سکتا ہے۔ یاد رہے کہ جولائی 2017ء میں چین نے مصنوعی ذہانت کے قومی منصوبے کا اعلان کیا تھا جس میں کہا گیا تھا کہ چین اس میدان میں امریکہ سے پیچھے نہیں رہے گا اور اس کے بعد چین نے مصنوعی ذہانت کے میدان میں قابلِ قدر ترقی کی۔ اب چین نے نئی تیار ہونے والی آرٹیفشل انٹیلی جنس کی مصنوعات کے حوالے سے نیا قانونی مسودہ تیار کیا ہے' جس کے تحت ان مصنوعات کو ریلیز کرنے سے قبل ان کی سکیورٹی جانچ کی جائے گی۔ خبر رساں ایجنسی اے ایف پی کے مطابق چین کی سائبر سپیس ایڈمنسٹریشن کی جانب جاری کیے گئے ایک بیان کے مطابق عوام آرٹیفشل انٹیلی جنس کی حامل مصنوعات کی سروسز عوام کو فراہم کرنے سے قبل ان کا سکیورٹی جائزہ لیا جائے گا اور اس کا اطلاق نیشنل انٹرنیٹ کے تمام انضباطی اداروں پر ہوگا۔ بیان میں کہا گیا: اس امر کو یقینی بنایا جائے گا کہ آرٹیفشل انٹیلی جنس کے تحت بنائی گئی مصنوعات میں دہشت گردانہ یا انتہا پسندانہ پروپیگنڈا، نسلی منافرت یا کوئی بھی ایسا مواد نہ ہو جو معاشی اور سماجی نظام میں خرابی کا باعث بنے۔ اس قانونی مسودے پر عمل درآمد سے چین کی آرٹیفشل انٹیلی جنس کی مصنوعات زیادہ محفوظ اور زیادہ قابلِ

استعمال ہو جائیں گی اور مستقبل قریب میں ممکن ہے چین اس میدان میں بھی امریکہ کو پیچھے چھوڑ دے۔

چین اور موسمیاتی تبدیلیاں

اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ 2022ء کا پورا سال بڑے موسمی تغیرات کی زد میں رہا۔ اس سے جہاں یہ ثابت ہوا کہ موسمیاتی تبدیلیاں دن بدن شدید تر ہوتی جا رہی ہیں' وہیں ان تبدیلیوں سے نمٹنے کی ناگزیریت کا احساس بھی بڑھ رہا ہے۔ 30 نومبر کو چائنا انٹرنیشنل اکنامک ایکسچینج سینٹر کے زیر اہتمام سرگرمی میں شریک ماہرین نے کاربن کے اخراج کی کمی کو تیز کرنے اور موسمیاتی تبدیلیوں کے نقصانات سے نمٹنے کے حوالے سے تبادلہ خیال کیا۔ چائنا سینٹر فار انٹرنیشنل اکنامک ایکسچینج کے نائب چیئرمین اور اکیڈمک کمیٹی کے ڈائریکٹر وانگ ای مینگ نے موسمیاتی تبدیلیوں سے نمٹنے کے سلسلے میں چین کے کردار کو اجاگر کیا۔ انہوں نے کہا کہ گزشتہ دس سالوں میں چین نے عالمی موسمیاتی تبدیلیوں سے نمٹنے میں نہایت اہم کردار ادا کیا ہے' چین عالمی موسمیاتی تبدیلیوں سے مثبت طور پر نمٹ رہا ہے اور اس سلسلے میں بہترین خدمات سرانجام دے رہا ہے۔ وانگ کے مطابق ٹیکنالوجی کی ترقی کاربن کے اخراج کو کم کرنے کے لیے نہایت اہم ہے اور قابل تجدید توانائی سے وابستہ ٹیکنالوجی کی ترقی کے بڑے امکانات موجود ہیں۔ ان ساری کاوشوں کے باوجود خارج ہونے والی مضرِ صحت گیسوں کا ایک بڑا حصہ چین میں پیدا ہوتا ہے اور چینی صدر نے شی جن پنگ نے چین میں بڑے پیمانے پر ہونے والی مضر گیسوں کے اخراج میں کمی کو اپنی ترجیحات میں رکھا ہوا ہے۔

باب اوّل

آہنی بھائی چارے (آئرن برادر ہُڈ) کا پس منظر کیا ہے؟

''پڑوسیوں کے ساتھ خیر سگالی اور بہترین تعلقات، چینی سفارت کاری کی پہلی ترجیح ہے۔ چین، پاکستان کے ساتھ مل کر ایک اعلیٰ معیار کی پاک چین اقتصادی راہداری کی تعمیر جاری رکھے گا۔ اسی طرح دونوں ملک اہم علاقائی و بین الاقوامی امور پر ایک دوسرے کی حمایت اور باہمی تعاون بھی جاری رکھیں گے۔ پاک چین تعلقات کو بنی نوع انسان کے ایک مشترکہ لائحہ عمل کے تحت تشکیل شدہ، ایک مثالی معاشرہ کے طور پر جانا جائے گا۔''

ان خیالات کا اظہار، چینی صدر شی جن پنگ نے 20 فروری 2020ء کو سابق پاکستانی وزیراعظم عمران خان کے ساتھ ٹیلی فون پر گفتگو کے دوران کیا تھا۔ یہ اس آزمودہ دوستی کی توثیق و تجدید تھی جس میں دونوں ملک اچھے برے حالات میں ایک دوسرے کے شانہ بشانہ کھڑے رہے اور اب بھی ہیں۔

صدر شی جن پنگ نے وزیراعظم عمران خان کو یہ یقین دہانی بھی کرائی تھی کہ ''ہم چین میں مقیم پاکستانی بھائیوں اور بہنوں کی اپنے شہریوں کی طرح دیکھ بھال کریں گے۔''

ان کا اشارہ ان ہزاروں پاکستانی طلبا کی جانب تھا جنہیں 2019ء میں کووڈ وبا کے پھوٹ پڑنے کے بعد فوری طور پر قرنطینہ میں رکھنے کے سوا اور کچھ ممکن نہ تھا۔

اس سے قبل 2015ء میں پاکستانی اخبارات میں شائع شدہ ایک مضمون میں صدر شی جن

پنگ نے پاک چین دوطرفہ تعلقات کی تعریف ان الفاظ میں کی تھی:

''پاکستان ایک مخلص اور قابل اعتماد دوست کے طور پر جانا جاتا ہے۔ بلاشبہ پاک چین دوستی دونوں ممالک کے عوام کے دلوں کی تہہ میں موجود ہے اور محسوس کی جاتی ہے۔ عرصہ دراز سے چین اور پاکستان مختلف شعبوں میں ہمہ جہت، مثبت اور سودمند باہمی اشتراک کا مظاہرہ کر رہے ہیں جو برادر عوام کے لیے مادی ثمرات سے عبارت ہے۔ فی الوقت دونوں ملک تسلسل کے ساتھ (سی پیک) اقتصادی راہداری کو آگے بڑھانے کے لیے شانہ بہ شانہ کام کر رہے ہیں۔ ہم ایک ایسی پاک چین کمیونٹی کی تعمیر کا عزم کئے ہوئے ہیں جس کا مقصد اور مقدر ایک ہو۔ ہم باہمی مفادات کو فروغ دینے کے لیے تعاون کر رہے ہیں اور مشترکہ پیشرفت کے لیے کوشاں ہیں۔ ہم اپنے عوام کو زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچانے کی غرض سے پُرامید ہیں اور روشن امکانات پر نظر رکھے ہوئے ہیں۔''

اس مضمون کا آغاز ایک نظم کے حوالہ سے تھا جس میں صدر شی جن پنگ نے پاکستان کے لیے اپنے جذبات کی بجا طور پر ترجمانی کرتے ہوئے لکھا:

''میں نے بچپن میں پاکستان اور پاک چین دوستی کے بارے میں دل کو چھو لینے والی کہانیاں سن رکھی تھیں جن سے میں نے یہ جانا کہ پاکستانی عوام اپنے خوبصورت ملک کی تعمیر و ترقی کے لیے سخت محنت کر رہے ہیں اور یہ کہ پاکستان نے چین کو جدید دنیا سے ملانے کے لیے ایک فضائی راہداری فراہم کی تھی۔ یہ پاکستان ہی تھا جس نے مجلسِ اقوام میں چین کی جائز و قانونی نشست کی بحالی کے لیے اس کی بھرپور حمایت کی تھی۔ یہ سب واقعات میری یادوں کا حصہ ہیں۔''

چین کا پانچ ہزار سالہ قدیم ثقافتی اور تمدنی ورثہ اس بات کا مظہر ہے کہ احسان مندی کی یہ سوچ اور احساس آگے تک جاتا ہے یعنی چینی عوام اپنی تاریخ کی قدر کرتے ہیں اور اس پر فخر کرتے ہیں۔ وہ کبھی یہ نہیں بھولے کہ پاکستان نے 1949ء میں نوزائیدہ ری پبلک (چین) کے ساتھ اظہارِ یکجہتی کیا تھا۔

سابق سیکرٹری خارجہ سلمان بشیر چین میں پاکستانی سفیر کے طور پر بھی خدمات سرانجام دیتے رہے ہیں۔ انہوں نے چینی عوام کی پاکستان کے ساتھ الفت کے بارے میں اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہا تھا ''عالمی طاقتوں کی جانب سے ممکنہ مخالفت کو نظر انداز کرتے ہوئے، پاکستان

نے کراچی کو چین کے لیے دنیا کا گیٹ وے بنایا اور اس طرح بیجنگ اور باقی دنیا کے مابین ایک پل قائم ہو گیا۔ یوں پاکستان انقلاب کے بعد کے دنوں میں چین کی مدد اور اس کے ساتھ اظہارِ یکجہتی کرنے پر چینی لوک داستانوں کا حصہ بن گیا۔''

دسمبر 2010ء میں چینی وزیراعظم وین جیا باؤ نے دوطرفہ تعلقات کو ایک گھنے درخت کی گہری جڑوں کی مانند قرار دیتے ہوئے کہا تھا ''دونوں ملکوں کے عوام کی دوستی ان کے خون میں رچی ہوئی ہے۔'' درحقیقت سابق صدر ایوب خان اور ان کے وزیر خارجہ ذوالفقار علی بھٹو، چیئرمین ماؤزے تنگ اور وزیراعظم چواین لائی نے اس دوستی، تعاون اور باہمی تعلقات کی بنیاد رکھی تھی۔ تب سے دونوں اطراف کے رہنما نہایت احترام وعقیدت کے ساتھ ان تعلقات کی آبیاری کر رہے ہیں جنہیں پاکستانی عوام کی بھرپور حمایت و تائید حاصل ہے۔ اس کا منہ بولتا ثبوت عوامی تاثرات سے پُر سروے ہیں۔ مثال کے طور پر 2010ء کے پیو سروے میں حیرت انگیز طور پر 84 فیصد پاکستانی رائے دہندگان کا کہنا تھا کہ وہ چین کے بارے میں ایک مثبت سوچ رکھتے ہیں جبکہ صرف 16 فیصد نے امریکہ کے بارے میں یہی الفاظ دہرائے تھے۔ اسی طرح چین کے سرکاری میڈیا نے علاقائی تناظر میں پاکستان کو ہمیشہ مثبت کوریج دی۔ یہ مثبت سوچ پروان چڑھتی جا رہی ہے جس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ 2013ء میں 90 فیصد پاکستانی عوام چین کے لیے خیر سگالی کا جذبہ رکھتے تھے جبکہ امریکہ کے خیر خواہوں کی شرح سکڑ کر 11 فیصد رہ گئی تھی۔ اس کے بعد، چینی وزیر خارجہ وانگ یی کی جانب سے پاکستان کے آرمی چیف (سابق) جنرل راحیل شریف کے دورہ چین (26 جنوری 2015ء) کے دوران پاکستان کی تعریف چین کے ''غیر متبدل، سدا بہار دوست'' کے طور پر کی گئی تو اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں تھی۔

اسلام آباد ان قدر دانیوں کو ہمیشہ سراہتا رہا ہے اور موقع محل کے مطابق جوابی توصیف سے کبھی گریزاں نہیں رہا، مثلاً جب پورا مغربی میڈیا ہانگ کانگ اور سنکیانگ کے حوالے سے چین مخالف بیانیہ کو زور وشور سے آگے بڑھا رہا تھا تو اس وقت پاکستان چین کے ساتھ کھڑا تھا۔ جون 2020ء میں پاکستان ان 53 ممالک میں سے ایک تھا جس نے اقوام متحدہ میں چین کے ہانگ کانگ نیشنل سکیورٹی لاء کی حمایت کی تھی۔ قبل ازیں جولائی 2019ء میں پاکستان اقوام متحدہ کے ان

50 ارکان میں شامل تھا جنہوں نے چین کے مغربی مسلم اکثریت والے سنکیانگ ایغور خودمختار علاقے میں چین کی پالیسیوں کی حمایت کی تھی اور اقوام متحدہ کے انسانی حقوق کمیشن (یو این ایچ سی آر) کو مخاطب کر کے لکھے گئے ایک ایسے مراسلے پر دستخط کئے تھے جس میں اس علاقے میں انسانی حقوق کی بحالی کے حوالے سے چین کے اقدامات کی تعریف کی گئی تھی۔ اسی سال نومبر میں پاکستان ان 54 ممالک میں شامل تھا جنہوں نے چین کی سنکیانگ کے حوالے سے پالیسیوں کی حمایت میں ایک مشترکہ بیان پر دستخط کیے تھے۔

کئی مغربی ذرائع ابلاغ نے سابق وزیراعظم عمران خان کو سنکیانگ اور ہانگ کانگ کے بارے میں چینی پالیسیوں پر گفتگو میں شامل کرنے کی کوشش کی تھی لیکن عمران خان نے نہ صرف صاف انکار کر دیا بلکہ الٹا مغرب پر دوغلے پن اور دوہرے معیار کا الزام بھی لگایا۔ الجزیرہ ٹی وی کو دیئے گئے ایک انٹرویو میں عمران خان نے کہا تھا، ''ہانگ کانگ اور اس کے شہریوں کے انسانی حقوق کو جو اہمیت دی گئی ہے اس پر اگر ایک نظر ڈالیں اور پھر اس کا موازنہ مقبوضہ کشمیر میں اسّی لاکھ مسلمانوں کے ساتھ روا رکھے گئے بھارتی سلوک سے کریں تو دنیا کا دوہرا معیار عیاں ہو جائے گا۔ بھارت کا ایک بڑی مارکیٹ ہونا انسانی حقوق کے معاملے پر غالب نظر آتا ہے۔''

اسی انٹرویو میں عمران خان نے اعلان کیا تھا کہ پاکستان کا اقتصادی مستقبل اب چین کے ساتھ وابستہ ہے اور دونوں ممالک کے مابین موجودہ تعلقات، گزشتہ ہر دور کی بہ نسبت بہتر ہیں۔ انہوں نے چین کی حیران کن شرح نمو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے امید ظاہر کی تھی کہ ''پاکستان، چین کے وضع کردہ اس طریقہ سے فائدہ اٹھا سکتا ہے جس کے ذریعہ اس نے اپنے لوگوں کو غربت سے نکالا ہے۔''

پاک چین سفارتی تعلقات کی مختصر تاریخ:

1950ء کی دہائی:

پاکستان نے نوزائیدہ عوامی جمہوریہ چین کو اس کے قیام کے فوراً بعد 9 جنوری 1950ء کو تسلیم کر لیا تھا۔ اس کے بعد 1951ء میں بیجنگ میں پاکستانی سفارت خانہ کھولا گیا۔ جواب میں چین

کی مرکزی حکومت کے نائب وزیر خارجہ لی کینونگ نے خیر سگالی کا اظہار کرتے ہوئے اعلان کیا تھا کہ ''چین جلد از جلد پاکستان کے ساتھ سفارتی تعلقات قائم کرنا چاہتا ہے جو برابری کی سطح پر قومی مفادات اور علاقائی خودمختاری کے باہمی احترام سے ہم آہنگ ہوں۔''

اس حوالہ سے رسمی بات چیت کے لیے پاکستان کے نمائندے احمد علی 24 اپریل 1951ء کو بیجنگ پہنچے۔ دونوں ممالک نے کامیابی کے ساتھ مذاکرات کی تکمیل پر سفیروں کے تبادلے پر اتفاق کیا اور بیجنگ نے مسٹر ہان نیان لونگ کو پاکستان میں اپنا پہلا سفیر نامزد کیا۔ دونوں ممالک کے درمیان دوطرفہ تجارت اس سے پہلے ہی شروع ہو چکی تھی۔

50-1949ء میں پاکستان نے چین کو روئی کی 47000 گانٹھیں فروخت کی تھیں۔ 51-1950ء میں یہ تعداد بڑھ کر 109000 گانٹھوں تک پہنچ گئی۔ چین نے بھی پاکستان کو کوئلہ فراہم کیا تھا جس کی اس وقت پاکستان ریلوے اور دیگر صنعتوں کو چلانے کے لیے اشد ضرورت تھی کیونکہ بھارت نے پاکستان کو کوئلہ فراہم کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اس (پہلی) دہائی کے دوران دونوں ممالک کے باہمی تعلقات خوشگوار اور معمول کے مطابق رہے جبکہ اگلی دہائی کو ارتقا کی دہائی کہا جا سکتا ہے جب رسمی معاملات فروغ پا کر گہرے اور مضبوط تر ہوتے چلے گئے۔ اتنے مضبوط کہ بہت سے ممالک اس دوستی کو حسد کی نظروں سے دیکھنے لگے۔

1960ء کی دہائی:

دونوں ممالک کے سفارت کار 1960ء اور 1970ء کی دہائیوں کے دوران مختلف مسائل کے حل کیلئے مشترکہ طور پر کام کرتے رہے۔ خاص طور پر اقوام متحدہ اور اسی طرح کے دوسرے بین الاقوامی پلیٹ فارمز پر دونوں ممالک نے مل جل کر بہت کام کیا۔ دونوں ریاستیں یہ محسوس کر چکی تھیں کہ مغرب چین اور ایشیا میں چین کے دوستوں کے ساتھ زیادتی کر رہا ہے۔ فکر و عمل کا یہ امتزاج تخفیفِ اسلحہ، ایٹمی پھیلاؤ، خودمختاری اور ماحولیات سے لے کر بین الاقوامی تجارت اور تیسری دنیا کے ممالک میں قوم پرست تحریکوں تک پھیلا ہوا تھا۔ یہ تعاون ایک ایسے باہمی ربط سے پھوٹا تھا جو ہر طرح کے شک و شبہ سے پاک اور بالاتر اور بڑے پڑوسیوں کے جبر سے بچاؤ کے لیے لازمی تھا۔ کئی

سابق اعلیٰ سفارت کار جیسے اکرم ذکی، نجم الدین شیخ، ریاض کھوکھر اور سلمان بشیر دفترِ خارجہ اور اقوامِ متحدہ میں اپنے ادوار میں دونوں ممالک کے قریبی تعلقات کے شاہد ہیں۔

سابق سیکرٹری خارجہ ریاض محمد خان نے اس قابل ذکر دوستی کے ارتقا کو 2011ء میں 'پاکستان ہورائزن' کے ایک یادگاری شمارے میں قلمبند کیا تھا۔ ریاض محمد خان کا شمار ان سفیروں میں ہوتا ہے جن کے کیریئر کا طویل عرصہ چین کے ساتھ معاملات میں بسر ہوا۔ بیرون ملک ان کی پہلی تقرری بیجنگ میں ہوئی جہاں وہ 1970ء سے 1973ء تک تعینات رہے۔ اس کے بعد 1973ء تا 1979ء چائنا ڈیسک پر مامور رہے۔ پھر وہ 2002ء سے 2005ء تک چین میں سفیر رہے۔ وہ اپنی یادداشتوں میں 1960ء کی دہائی کے اوائل کے ریکارڈ سے دو پالیسی دستاویزات کو قابل ذکر قرار دیتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ آغا شاہی 1963ء میں پاکستان کے دفترِ خارجہ میں ایڈیشنل سیکرٹری تھے۔ اسی سال کے وسط میں انہوں نے چین کے ساتھ قریبی وسعت پذیر تعلقات کے تناظر میں ایک نئی پالیسی ڈائریکشن کے لیے ابتدائی نوٹس تیار کیے۔ صدرِ مملکت کو نوٹس پیش کرنے سے پہلے اس وقت کے وزیر خارجہ ذوالفقار علی بھٹو نے ان میں ایک سنہری اضافہ کیا ''ایشیا کی وسعت میں پاکستان اور چین تاریخ کے دھاروں سے ٹکراتے ہوئے ایک ایسے بندھن میں بندھے محسوس ہوتے ہیں جیسا بھارت اور سوویت یونین کے درمیان ہے۔''

ایک اور پیشرفت جس نے دوستی کے اس غیر معمولی سفر کی بنیاد رکھی، 1962ء میں چین کے ساتھ سرحد کا تعین تھا جس کے لیے پاکستان نے باقاعدہ مذاکرات کی تجویز بھجوائی تھی، جس کا مثبت جواب آنے میں کئی ماہ کی تاخیر ہوئی؛ تاہم باؤنڈری ایگریمنٹ کے بارے میں چین کا سنجیدہ ردعمل بھارت کے مبہم ردِعمل سے بالکل مختلف بلکہ برعکس تھا۔ ریاض محمد خان کا کہنا ہے کہ اس مثبت ردِعمل سے وہ ضروری اعتماد اور یقین حاصل ہوا جو سفارتکاری اور تعاون پر مبنی مضبوط تعلقات کے لیے ناگزیر ہوتا ہے۔

بہرحال مذاکرات کے بعد 2 مارچ 1963ء کو سرحدی معاہدے پر دستخط ہوئے جس نے دونوں ممالک کو قابلِ ذکر حد تک افہام و تفہیم اور تعاون کی راہ پر گامزن کر دیا۔ معاہدے کے پیش لفظ میں لکھا گیا ''انصاف، معقولیت، باہمی سوجھ بوجھ اور افہام و تفہیم کے جذبہ کے تحت یقین ہے کہ یہ

معاہدہ اچھی ہمسائیگی اور دوستانہ تعلقات کے فروغ کے حوالہ سے نہ صرف چین اور پاکستان کے عوام کی خواہشات کا مظہر ہے بلکہ اس سے ایشیا اور عالمی امن کے تحفظ میں بھی مدد ملے گی۔''

اس معاہدے کے تحت چین نے 1940 مربع کلومیٹر سرسبز علاقہ پاکستان کے حوالے کر دیا جو ہنزہ اور شمالی پاکستان کے چرواہوں کے زیرِ استعمال تھا۔ اسلام آباد نے بھی 5000 مربع کلومیٹر سے زائد وہ شمالی علاقہ چین کا حصہ تسلیم کر لیا جو چین سے ملحق ہے۔ اس معاہدے کے نتیجے میں چین کے مغربی سنکیانگ الیغور خودمختار علاقے اور پاکستان کے دور دراز شمالی علاقہ کے مابین مستقل سرحدی حد بندی کر دی گئی۔ یہ سرحدی معاہدہ دونوں ممالک کے درمیان تعلقات کے حوالہ سے ایک ایسی قوتِ محرکہ ثابت ہوا جس کا مشاہدہ اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ اس کے بعد ایک سال سے بھی کم عرصہ میں وزیرِ اعظم چواین لائی نے 23 فروری 1964ء کو پاکستان کا دورہ کیا جس کے بعد صدر ایوب خان مارچ 1965ء میں بیجنگ کے دورے پر گئے تھے۔

وزیرِ اعظم چواین لائی کے دورے کے اختتام پر جاری کیا گیا مشترکہ اعلامیہ اس سرحدی معاہدے کی اہمیت کو بھی اجاگر کرتا ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب چین سکیورٹی کونسل کی رکنیت حاصل کرنے کی کوششوں میں مصروف تھا۔ اعلامیہ میں کہا گیا ''صدر اور وزیرِ اعظم نے اس حقیقت پر اطمینان کا اظہار کیا ہے کہ وزیرِ اعظم کے گزشتہ دورہ پاکستان (1956ء) اور خصوصاً 1963ء میں سرحدی معاہدہ طے پا جانے کے بعد سے دونوں ملکوں کے تعلقات میں مزید بہتری آئی ہے۔'' یہ امید بھی ظاہر کی گئی کہ ''مسئلہ کشمیر کو کشمیری عوام کی خواہشات کے مطابق حل کیا جائے گا، جیسا کہ پاکستان اور بھارت نے ان سے عہد کر رکھا ہے۔''

اس بات پر بھی اتفاق کیا گیا کہ ان تنازعات کی موجودگی سے انکار اور ایک بڑا ملک ہونے کے زعم میں مبتلا ہونا اور اپنی مرضی دوسروں پر مسلط کرنا کوئی فائدہ نہ دے گا اور یہ کہ وسیع پیمانے پر فوجی تیاریاں بین الاقوامی اختلافات کا حل نہیں ہو سکتیں۔ اس سے صرف نئے تناؤ پیدا ہوتے ہیں اور عوام پر پڑنے والے بوجھ میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ اعلامیہ کے مطابق ''دونوں رہنماؤں نے ایشیا کے عوام کی بہبود اور عالمی امن کے مفاد میں ان تنازعات کے جلد از جلد حل کی ضرورت پر زور دیا۔''

مارچ 1965ء میں صدر ایوب خان کے ہفتہ بھر کے دورہ بیجنگ کے دوران بھی ایسی ہی خوشگوار فضا قائم رہی اور اس دورے کے اختتام پر جاری کئے گئے مشترکہ اعلامیہ میں ایک بار پھر اہم معاملات، جیسے ترقیات، انصاف، کشمیر، پُرامن سرحدوں اور نوآزاد ریاستوں کے سیاسی استحکام اور علاقائی خودمختاری، پر ہم آہنگی کی عکاسی ہوئی۔ اس بات پر خوشی کا اظہار کیا گیا کہ سرحدوں کی حد بندی کا کام دوستانہ انداز میں خوش اسلوبی سے مکمل کرلیا گیا ہے۔ مشترکہ اعلامیہ میں ترقی پذیر ممالک کے لیے بنڈونگ کانفرنس کے 10 اصولوں پر بھی روشنی ڈالی گئی اور کہا گیا کہ ان کے درمیان دوستانہ تعاون قائم کیا جاسکتا ہے اور ان کے سماجی نظاموں میں اختلافات سے قطع نظر اس تعاون کو فروغ دیا جاسکتا ہے۔ پاکستان اور چین کے مابین جس طرح کے قریبی ہمسایوں جیسے تعلقات موجود ہیں وہ حتمی طور پر بین الاقوامی تعلقات میں ریاست کے طرزِ عمل کے حوالہ سے ان اصولوں کی روح کو ظاہر کرتے ہیں۔

صدر اور وزیراعظم نے اطمینان کا اظہار کیا کہ ایشیا اور افریقہ کے بہت سے نوآزاد ممالک کو اقوام متحدہ کا رکن بنایا جارہا ہے تاہم انہوں نے اس یقین کا بھی اظہار کیا کہ جب تک اس عالمی تنظیم میں عوامی جمہوریہ چین کی جگہ بحال نہیں کردی جاتی یہ تسلیم نہیں کیا جاسکتا کہ یہ ادارہ نسلِ انسانی کا ایک مکمل نمائندہ ادارہ ہے۔ انہوں نے تسلیم کیا کہ اقوام متحدہ کے قیام کے بعد سے اس وقت تک اس ادارے کی رکنیت دوگنا سے بھی زیادہ ہوگئی ہے لیکن ضروری ہے کہ افریقی اور ایشیائی ممالک کو اقوام متحدہ کے ذیلی اداروں اور مخصوص ایجنسیوں میں بھی زیادہ سے زیادہ نمائندگی دی جائے۔

مسئلہ کشمیر کے حل کے لیے چین کی حمایت، غیر وابستہ تحریک، اقوام متحدہ میں چین کی شمولیت، مسئلہ فلسطین، پاکستان کی جانب سے دوٹوک 'ایک چین' کے اصول کی علمبرداری، افریقی ایشیائی یکجہتی، ویت نام میں امریکی جارحیت، باہمی اصولِ احترام، عدم مداخلت اور عدم جارحیت وغیرہ جیسے معاملات، بیانات اور اعلانات میں نمایاں جگہ پاتے رہے حتیٰ کہ چیئرمین لیوشاوکی کے مارچ 1966ء کے دورے کے اختتام پر جاری ہونے والے مشترکہ اعلامیہ اور جنرل یحییٰ خان کی بیجنگ میں ہونے والی گفتگو کے بعد جاری شدہ اعلامیہ، دونوں میں متذکرہ بالا دوطرفہ اور تشویش کا

باعث علاقائی مسائل کا خصوصی طور پر حوالہ دیا گیا۔ ''دونوں ممالک نے اس خیال کا اظہار کیا کہ چین اور پاکستان کے دوستانہ تعلقات کی مزید مضبوطی و ترقی دونوں ممالک کے عوام کی مشترکہ خواہش اور بنیادی مفادات کے مطابق ہے۔''

پاکستان نے چینی حکومت کو چینی عوام کی واحد قانونی حکومت کے طور پر تسلیم کرنے کا اعادہ کیا اور کہا کہ تائیوان عوامی جمہوریہ چین کی سرزمین کا ایک ناقابل تقسیم حصہ ہے۔ مکالمہ میں ہمیشہ کی طرح مسئلہ کشمیر کا بھی ذکر تھا جس میں چینی قیادت نے اپنے حق خودارادیت کے لیے جدوجہد میں کشمیری عوام کے حق میں اپنی مکمل حمایت کا اعادہ کیا۔ ''اس سے علاقائی تعاون، ہند چین تعلقات، اور تمام جوہری ہتھیاروں کی مکمل ممانعت اور ان ہتھیاروں کے مکمل خاتمہ کے لیے کام کرنے کے عزم جیسے معاملات پر دونوں ممالک کے مابین مسلسل بڑھتی ہوئی نظریاتی اور سیاسی قربت کی اہمیت مزید اجاگر ہوئی۔''

''آزادی کے اصول، خودانحصاری، خودمختاری، ریاستوں کی مساوات، علاقائی سالمیت کا ناقابل تسخیر ہونا، بالادستی کی مخالفت، توسیع پسندی اور تسلط کے دعووں کو مسترد کرنا'' جیسے جملے تقریباً ہر سرکاری اور عوامی رابطے کا ایک لازمی حصہ رہے اور اب بھی ہیں۔ بعض اوقات یہ جملے رسمی اور سفارتی لگتے ہیں لیکن کئی مواقع پر اور خصوصاً بحرانوں میں اس تعلق کی گہرائیوں اور خلوص کی گواہی دیتے ہیں۔

کسنجر کا دورہ بیجنگ (1970ء کی دہائی):

1965ء کے ہند پاک تنازع نے 'چین کے ساتھ دوستی' کو مزید تقویت دی کیونکہ جنگ کے دوران اور جنگ کے بعد بھی چین، پاکستان کے ساتھ کھڑا تھا۔ ایک اور فیصلہ کن لمحہ پاکستان کا امریکہ چین تعلقات کی راہ ہموار کرنے میں اہم کردار ادا کرنا تھا جس کے نتیجہ میں جولائی 1971ء میں ہنری کسنجر نے بیجنگ کا پہلا خفیہ دورہ کیا۔ سابق وزیر خارجہ خورشید محمود قصوری اپنی یادداشتوں پر مبنی تصنیف "Neither a hawk nor a dove" میں اس دورے کے بارے میں لکھتے ہیں:

''کسنجر سیاہ ہیٹ سر پر ٹکائے، برساتی کوٹ پہنے اور سیاہ چشمہ لگائے، بیجنگ کے لیے روانہ ہوئے۔ اس طرح پاکستان نے امریکہ اور چین کے مابین تعطل کو توڑنے میں اہم کردار ادا کیا اور دونوں

مما لک کے مابین کشیدہ تعلقات میں کمی لانے میں مدد کی جس کے نتیجہ میں 1972ء میں صدر رچرڈ نکسن کے دورہ بیجنگ کی راہ ہموار ہوئی۔''

اس کے بعد دونوں مما لک نے سول ایوی ایشن معاہدے پر دستخط کئے جس سے پاکستان انٹرنیشنل ایئر لائنز (پی آئی اے) کو، چین کو باقی دنیا کے ساتھ منسلک کرنے والی پہلی فضائی کمپنی بننے کا اعزاز حاصل ہوا۔ زیادہ تر چینی اب بھی ان یادداشتوں کو 'پاک چین تعلقات میں اہم لمحات' کے طور پر عزیز رکھے ہوئے ہیں اور دوران گفتگو ان کا ذکر کرتے ہیں۔ وہ اکثر ان یادوں کو پاکستان کے لیے شکر گزاری کے استعارے کے انداز میں استعمال کرتے ہیں اور وزیراعظم چواین لائی کے مشہور (تاریخی جملے) کو دہراتے ہیں جو انہوں نے ہنری کسنجر کے سامنے کہا تھا ''اس پُل (پاکستان) کو کبھی مت بھولنا جو آپ نے چین آتے ہوئے استعمال کیا تھا اور جسے آپ کو دوبارہ استعمال کرنا پڑ سکتا ہے۔'' تقریباً پانچ دہائیاں گزرنے کے باوجود چینی حکام ان ریمارکس کو یاد کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے 'ناقابل فراموش پل'۔ حتیٰ کہ اس وقت کے امریکی صدر رچرڈ نکسن نے بھی جولائی کے آخر میں کسنجر کے بیجنگ کے دورے کے بعد صدر یحییٰ خان کے نام اپنے ایک قلمی نوٹ میں اس امر کا اعتراف کرتے ہوئے لکھا تھا ''وہ لوگ جو آنے والی نسلوں تک ایک زیادہ پُرامن دنیا چاہتے ہیں آپ کے مقروض رہیں گے۔''

مشرقی پاکستان میں سیاسی ہلچل، جس کا اختتام دسمبر 1971ء میں پاکستان کے دولخت ہونے پر ہوا، چین کے پاکستان کے ساتھ تعلقات کے لیے ایک بڑا امتحان تھا۔ اسلام آباد نے 1971ء کے سیاسی بحران سے جس طرح نمٹنے کی کوشش کی اس پر چینی قیادت کو شدید مایوسی ہوئی۔ جنوری میں 1972ء میں چینی وزیراعظم چواین لائی نے پاکستان کے نومنتخب صدر ذوالفقار علی بھٹو کا رسمی طور پر استقبال کرنے کے بعد بیجنگ میں پاکستانی پریس کو بتانے کے لیے علی الاعلان یہ کہا کہ ''چین نے کسی ملک کو اپنے لوگوں کے خلاف استعمال کرنے کے لیے اسلحہ فراہم نہیں کیا۔''

یاد رہے کہ ماؤزے تنگ کے منتخب کردہ جنرل لِن بیاؤ کی ناکام بغاوت کے بعد 1971ء کے نصف آخر میں چین خود اپنی تاریخ کے سب سے مشکل دور سے گزر رہا تھا۔ لِن بیاؤ اور اس کا خاندان کئی ہم وطنوں کے ساتھ فرار ہوتے ہوئے اس وقت ہلاک ہوئے جب انہیں لے جانے والا

طیارہ منگولیا میں گر کر تباہ ہو گیا تھا۔ اس سے نہ صرف جانشینی کے مسائل پیدا ہوئے بلکہ کمیونسٹ پارٹی اور چینی مسلح افواج میں بے چینی نے بھی جنم لیا۔ اس سے چین کا سیاسی نظام اور خود چیئرمین ماؤ کی ساکھ بھی داؤ پر لگ گئی تھی۔ اپنے اندرونی مسائل میں الجھے ہوئے چین کے لیے بیرونی معاملات پر توجہ مرکوز کرنا مشکل تھا تاہم چین نے جلد ہی بیرونی معاملات میں دوبارہ دلچسپی لینا شروع کر دی اور اسی سال کے آخر میں ایک مشکل فیصلہ کرتے ہوئے بنگلہ دیش کا اقوام متحدہ میں داخلہ روکنے کے لیے پہلی بار ویٹو پاور کا استعمال کیا۔ اس کے ساتھ ساتھ چین یہ کوشش بھی کر رہا تھا کہ پاکستان کے جنگی قیدی اس کو واپس مل جائیں۔ اس معاملہ میں چین کی حمایت ذوالفقار علی بھٹو کے دورے کے دوران چیئرمین ماؤ اور اپنے چینی ہم منصب چواین لائی سے ہونے والی ملاقات کے بعد جاری ہونے والے مشترکہ اعلامیہ میں واضح تھی جس میں کہا گیا ''صدر اور وزیراعظم نے پاکستانی جنگی قیدیوں اور مشرقی پاکستان میں سویلین کے مستقبل کے بارے میں گہری تشویش کا اظہار کیا ہے جو اس وقت بھارتی فورسز کے قبضے میں ہیں۔ انہوں نے بھارت سے مطالبہ کیا ہے کہ وہ جنیوا کنونشن کے تحت اپنی ذمہ داریاں پوری کرے اور بغیر کسی تاخیر کے ان افراد کو ان کے وطن واپس بھیجے۔ ہم بھارت کی جانب سے بین الاقوامی قانون، اقوام متحدہ کے چارٹر اور بنڈونگ کانفرنس میں طے کردہ اصولوں کی خلاف ورزی کرتے ہوئے پاکستان کے خلاف ننگی جارحیت اور پاکستانی علاقوں پر قبضے کی شدید مذمت کرتے ہیں۔''

سابق سیکرٹری خارجہ ریاض محمد خان کے بقول چین کی جانب سے پڑوسی کی حمایت میں فوجی طاقت کے استعمال یا مسلح مداخلت سے نفرت اس وقت واضح ہو گئی جب وزیراعظم بھٹو نے 1974ء میں دوطرفہ دفاعی معاہدے کی تجویز پیش کی۔ اس پر وزیراعظم چواین لائی نے شائستگی کے ساتھ تامل ظاہر کرتے ہوئے کہا تھا ''دونوں ممالک کے مابین تعلقات اتنے ہی اچھے ہیں جیسے یہ اتحادی ہوں' اور یہ کہ چین کا سوویت یونین کے ساتھ ایک ایسا معاہدہ موجود ہے لیکن وہ اس کی میعاد ختم ہونے کا منتظر ہے۔ چین کے لیے شمالی کوریا اور ویت نام جیسے دوستوں کی خاطر فوجی مداخلتوں کا دور بہت پہلے ختم ہو چکا تھا۔

چین نے جب پہلی بار ویٹو کا استعمال کیا تو اس سے مستقبل کے تعلقات کے بارے میں

بہت کچھ واضح ہو گیا اور یہ بھی کہ چین کسی بحران میں فوجی طاقت کا استعمال کئے بغیر کس حد تک جانے پر رضامند ہے۔ اور یہ کہ وزیراعظم چواین لائی چار بار پاکستان تشریف لائے اور اسلام آباد کی ایک سڑک ان کے نام سے موسوم کی گئی۔ اس سے واضح ہوا کہ دونوں ممالک دوطرفہ تعلقات میں جڑے رہنے کو کس قدر اہمیت دیتے ہیں۔

یہ 83 سالہ چیئرمین ماؤزے تنگ ہی تھے جنہوں نے شدید علالت کے باوجود پاک چین دوستی کو دلوں کو گرما دینے والا خراج تحسین پیش کرتے ہوئے 27 مئی 1976ء کو ذوالفقار علی بھٹو کو اپنے آخری غیر ملکی مہمان کے طور پر خوش آمدید کہا تھا۔

ماؤ کے بعد کا دور (80ء اور 90ء کی دہائیاں):

چیئرمین ڈینگ ژیاؤ پنگ نے 'چار جدت طرازیوں' کے ساتھ ایک نئے دور کا آغاز کیا جس کے نتیجہ میں چین ڈرامائی طور پر کھل کر مغرب کے سامنے آیا تاہم یہ عمل اپنے ساتھ دوطرفہ تعلقات کے مخصوص مضمرات بھی لے کر آیا۔ ڈینگ ژیاؤ پنگ کے دور میں رسمی اور مستحکم تعلقات جاری رہے لیکن مسئلہ کشمیر پر چین کے مؤقف میں ہلکی سی تبدیلی بھی لائی گئی۔ سابق سیکرٹری خارجہ ریاض محمد خان کے الفاظ میں ''چین 1970ء کی دہائی کے وسط تک 'کشمیری عوام کے حق خودارادیت اور اقوام متحدہ کی قراردادوں پر مبنی پاکستان کے موقف کی مکمل حمایت، سے 'کشمیری عوام کی خواہشات کا احترام کرنے، کی طرف تبدیل ہوا اور پھر 1990ء کی دہائی تک آتے آتے وہ اس مسئلہ کے پُرامن حل کے لیے پاکستان اور بھارت کی دوطرفہ کوششوں کی حمایت کرنے لگا۔ سیاسی تنازعات کے بارے میں اپنے نقطۂ نظر پر قائم رہتے ہوئے دسمبر 1996ء میں پاکستانی پارلیمنٹ سے خطاب کرتے ہوئے چینی صدر جیانگ زیمن نے پاکستان کو مشورہ دیا تھا کہ ''مسئلہ کشمیر کو مؤخر کرتے ہوئے پاکستان کو اپنی اقتصادی ترقی پر توجہ مرکوز کرنی چاہئے۔''

صدر زیمن نے کشمیر کے سوال کا بالواسطہ حوالہ دیتے ہوئے کہا تھا ''ہمیں اختلافات یا تنازعات کو طویل مدتی تناظر میں دیکھنا چاہئے اور ذہن میں ایک بڑی تصویر رکھتے ہوئے مشاورت اور مذاکرات کے ذریعے ایک منصفانہ اور معقول تصفیہ کی تلاش کرنی چاہئے۔ اگر بعض مسائل کو وقتی

طور پر حل نہیں کیا جا سکتا تو انہیں عارضی طور پر طاق پر رکھ دینا چاہئے تا کہ وہ ایک ریاست کے ساتھ دوسری ریاست کے نارمل تعلقات کو متاثر نہ کر سکیں۔''

پاکستانی صدر فاروق لغاری کی موجودگی میں اپنی تقریر میں صدر زیمن نے ان عوامل کی ترتیب کا ایک خاکہ بھی پیش کیا تھا جو سیاسی استحکام اور معاشی ترقی کو ممکن بناتے ہیں۔ انہوں نے بیان کیا کہ کس طرح مؤخرالذکر یعنی معاشی ترقی بیجنگ کے تمام اقدامات میں مرکزی حیثیت کی حامل رہی جبکہ اصلاحات ترقی کی قوتِ محرکہ کی نمائندگی کرتی تھیں' ترقی یعنی خوش حالی اور سماجی استحکام کی بنیاد' جبکہ سماجی استحکام اقتصادی ترقی اور اصلاحات کے ہموار نفاذ کی پیشگی شرط ہے۔

خود مختار علاقوں کے معاملات کے حوالہ سے اور ترقی کے لیے اپنے ملک کے مثبت، باتحمل اور پُرعزم نقطۂ نظر کے بارے میں بات کرتے ہوئے چینی صدر نے ہانگ کانگ، مکاؤ اور تائیوان کا بھی ذکر کیا اور واضح کیا کہ چینی عوام ان مسائل کے حل کے لیے تمام تر مداخلتوں پر قابو پانے کے لیے پرعزم ہیں۔

جب صدر زیمن نے تجویز پیش کی کہ ''تنازعات کو عارضی طور پر طاق پر رکھ دینا چاہیے'' تو پریس گیلری میں موجود بہت سے سینئر صحافیوں نے متجسس نظروں کا تبادلہ کیا تھا۔ نیچے اسمبلی ہال میں پارلیمان کے چند ارکان کی سرگوشیاں بھی سنائی دے رہی تھیں لیکن ایسا لگ رہا تھا کہ پاکستانی سویلین اور فوجی رہنما اس وقت ایک مختلف موڈ میں تھے، چنانچہ صدر زیمن کی نصیحت سنی ان سنی کر دی گئی۔ اگر اس وقت پاکستان نے صدر زیمن کے اس مشورے پر دھیان دیا ہوتا اور داخلی ترقی اور خارجہ تعلقات کے لیے ایک رہنما اصول کے طور پر جغرافیائی سیاست سے زیادہ جیو اکنامکس پر توجہ مرکوز کی ہوتی تو آج پاکستان غالباً کچھ مختلف ہوتا۔

بہرحال 1960ء کی دہائی کے دوران اور 1970ء کی دہائی کے اوائل سے اعتماد اور تفہیم کی بنیادوں پر قائم دوطرفہ نادر تعلقات پر یہ تجویز نہ ماننے کا کوئی منفی اثر نہیں پڑا۔ دونوں فریق اہم معاملات پر باقاعدگی سے ایک دوسرے سے مشورہ کرتے ہیں اور بیجنگ نے ہمیشہ ان مسائل پر توجہ دی جن کا پاکستان کو اپنی حالیہ تاریخ کے دوران بار بار سامنا کرنا پڑا۔ ایسا ہی ایک بحران کارگل کا تنازع تھا۔ اس وقت کے وزیراعظم نواز شریف 4 جولائی 1999ء کو امریکی صدر بل کلنٹن تک رسائی

حاصل کرنے سے پہلے 27 جون 1999ء کو بیجنگ گئے تھے۔

اس سے ایک سال پہلے جب بھارت اور پاکستان دونوں نے ایک دوسرے کے مقابلے میں ایٹمی تجربات کئے تھے تو چین نے اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل کے پانچ مستقل ارکان میں سے ایک کے طور پر باقاعدہ ایک سفارتی تنقیدی تبصرہ کیا تھا جس میں جنوبی ایشیا کے تمام ممالک پر زور دیا گیا تھا کہ وہ انتہائی تحمل سے کام لیں اور فوری طور پر تمام جوہری ہتھیاروں کے ترقیاتی پروگراموں کو ترک کر دیں تاکہ حالات کو مزید بگڑنے سے بچایا جا سکے۔ کہا گیا کہ یہ کام جنوبی ایشیا کے خطہ میں امن واستحکام کی خاطر ضرور کرنا چاہیے۔

سکیورٹی کونسل کی جانب سے چین پر عائد کی گئی پابندیوں کو سمجھتے ہوئے اس وقت حکومت پاکستان نے چین کی جانب سے کی گئی تنقید پر منفی تبصرے سے گریز کیا تھا بلکہ وزیراعظم نواز شریف نے ایٹمی تجربات کے بعد قومی سطح پر نشر کی گئی اپنی ٹیلی وژن تقریر میں ''بحران کی اس گھڑی میں بیجنگ کی جانب سے کی گئی حمایت پر اس کی تعریف کی تھی'' اور زور دے کر کہا تھا کہ ''پاکستان کو اپنے اس عظیم پڑوسی پر فخر ہے۔'' یہ اس بات کا ایک اور ثبوت تھا کہ دونوں ملکوں کی قیادتیں ایک دوسرے کو کتنی اچھی طرح سمجھتی ہیں۔ اس کے علاوہ یہ اب کوئی راز نہیں ہے کہ چین نے پاکستان کی دفاعی پیداوار میں مدد دی، اس کے فروغ میں یقینی کردار ادا کیا اور اس کے جوہری پروگرام میں بھی اعانت کی۔ جس دوران پاکستان اپنے جوہری اور میزائل پروگرام پر کام کر رہا تھا تب چینی انجینئر مختلف سہولیات کے حوالہ سے خاموشی سے مدد کر رہے تھے۔

9\11 کے بعد کی دہائی:

2002ء اور 2007ء کے درمیانی عرصے میں پاکستان اور چین کے متعدد سربراہان مملکت، سربراہان حکومت اور وزرائے خارجہ نے ایک دوسرے کے ممالک کے دورے کئے۔ ان میں چینی وزیراعظم وین جیابا ؤ اور وزیر خارجہ لی ژیاؤ شنگ کی جانب سے اپریل 2005ء کا دورہ اور صدر ہوجن تاؤ کا نومبر 2006ء کا دورہ پاکستان بھی شامل ہے۔ صدر ہوجن تاؤ کا یہ چار روزہ بے مثال دورہ تھا۔ اسی طرح صدر پاکستان جنرل پرویز مشرف 2004ء اور پھر 2006ء میں بیجنگ کے

دورے پر گئے تھے۔ اس کے بعد وزیراعظم شوکت عزیز نے اپریل 2007ء میں چین کا دورہ کیا تھا جبکہ جنرل مشرف 15 اپریل 2008ء کو ایک بار پھر چین کے دورے پر گئے تھے۔ اس کے بعد وین جیابا ؤ نے دسمبر 2010ء کے وسط میں اسلام آباد کا دورہ کیا تھا۔

اس دورہ کی اہمیت اس حقیقت سے واضح ہوتی ہے کہ سی پیک کی اہمیت کا ادراک کرتے ہوئے اسے پوری قوت سے آگے بڑھانے کا تزویراتی فیصلہ اسی دوران کیا گیا۔ قراقرم ہائی وے کو اَپ گریڈ کیا گیا تاکہ اسے مال گاڑیوں کے لیے ہر موسم کی شاہراہ بنایا جاسکے۔ گوادر پورٹ تعمیر کی گئی اور اضافی ڈریجنگ (سمندر سے غیر ضروری ملبہ کو ہٹا کر صفائی کرنا) کی گئی تاکہ اسے ایک گہری بندرگاہ بنایا جاسکے۔ گوادر کو سڑکوں کے مربوط جال کے ذریعے منسلک کرنے کے تصور کو حتمی شکل دی گئی۔ گوادر ایئرپورٹ کی منصوبہ بندی کی گئی۔ جے ایف 17 لڑاکا طیاروں کی مشترکہ پیداوار اور ترقی کو عملی شکل دی گئی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ دوستی، تعاون اور اچھے پڑوسیوں والے تعلقات کے 20 سالہ معاہدے پر دستخط کئے گئے (یہ معاہدہ 2025ء میں اختتام پذیر ہو رہا ہے)۔ اس معاہدے کا مقصد دونوں آہنی برادران کے مابین تعلقات کو طویل مدت کے لیے فروغ دینا ہے۔

جب وین جیا باؤ نے دسمبر 2010ء میں پاکستان کا دورہ کیا تھا تو دونوں ممالک نے 2011ء کو 'چین پاکستان دوستی کا سال' قرار دیا تھا جس کا ایک مقصد دونوں ملکوں کے ساٹھ سالہ سفارتی تعلقات کی (60ویں) سالگرہ منانا بھی تھا۔ تجارت، ایروسپیس، سڑکیں، مواصلات، تعلیم اور دفاعی پیداوار میں تعاون بڑھانے کے عزم کا اظہار کرنے کے علاوہ چین نے سیلاب سے متاثرہ علاقوں میں ہر طرح کی مدد فراہم کرنے کا وعدہ بھی کیا۔ چین نے پاکستان کی انسدادِ دہشت گردی کی کوششوں کو بھی سراہا۔ یاد رہے کہ 2010ء میں پاکستان میں شدید سیلاب آیا تھا جس سے وسیع و عریض تباہی پھیلی تھی۔

پاکستان شنگھائی تعاون تنظیم میں پہلے بحیثیت مبصر شمولیت اور پھر مکمل رکن بنائے جانے پر چین کا ممنون تھا۔ پاکستان نے چین کا یہ احسان اسے سارک میں آبزرور کا سٹیٹس دلا کر چکایا۔ اس دوران دونوں ممالک نے 2005ء میں دوستی، تعاون اور اچھے ہمسایوں والے تعلقات کے حوالے سے طے پانے والے تاریخی معاہدے کے تحت اپنے باہمی تعلقات کو مضبوط بنانے کا سلسلہ جاری

رکھا۔ دونوں ملکوں کا خیال ہے کہ اس معاہدے کے نتیجے میں سٹرٹیجک پارٹنرشپ کے لیے اہم قانونی بنیاد قائم ہوئی ہے۔ اس کے بعد اسلامی جمہوریہ پاکستان اور عوامی جمہوریہ چین کے مابین تجارتی اور اقتصادی تعاون کا پانچ سالہ منصوبہ (2007ء تا 2011ء) طے پایا جس کا مقصد زراعت، مینوفیکچرنگ، انفراسٹرکچر، عوامی کاموں، توانائی کی معلومات، مواصلاتی ٹیکنالوجی خدمات، تعلیم اور تکنیکی تعاون کے شعبوں میں دونوں ملکوں کے مابین قریبی اقتصادی اور تجارتی تعلقات قائم کرنا تھا۔

یہ حقیقت ہے کہ چینی قیادت نے پاکستانی مہمانوں کو خوش آمدید کہنے میں کبھی ہچکچاہٹ کا مظاہرہ نہیں کیا چاہے موخرالذکر اپنے ملک میں مشکلات کا ہی شکار کیوں نہ ہو۔ اس حوالہ سے جنرل پرویز مشرف کی مثال پیش کی جاسکتی ہے کہ جب انہوں نے 2008ء میں بیجنگ کا دورہ کیا تو اس وقت ملک کے اندر ان کے خلاف وکلا تحریک زوروں پر تھی۔ ان کے جانشین صدر آصف زرداری نے چین کے تقریباً درجن بھر دورے کئے۔ ان میں سے زیادہ تر نجی نوعیت کے تھے اور کچھ دورے اس وقت بھی کئے جب انہیں داخلی سطح پر مخالفت کا سامنا تھا جیسے امریکہ اور نیٹو کی جانب سے شمال مغربی سرحدی علاقے میں پاکستانی چیک پوسٹ پر حملے سے پیدا ہونے والی گمبھیر سیاسی صورتحال اور اس کے نتیجے میں امریکہ کے ساتھ بڑھتی ہوئی کشیدگی اور میموگیٹ سکینڈل وغیرہ۔ بعدازاں 2014ء میں جب وزیراعظم نواز شریف الیکشن کے نتائج سے متعلق عمران خان کے دھرنے کے دوران متزلزل نظر آئے تو اس وقت بھی چینی دوستوں نے ان کے چھوٹے بھائی شہباز شریف کو بیجنگ میں خوش آمدید کہنے میں کسی قسم کی جھجک نہ دکھائی۔

سی پیک کی دہائی:

چین پاکستان اقتصادی راہداری (سی پیک) عظیم الشان بیلٹ اینڈ روڈ انیشی ایٹو (بی آر آئی) میں ایک انتہائی اہم لنک ہے۔ اس منصوبے کا باقاعدہ افتتاح صدر شی جن پنگ نے اسلام آباد میں 2015ء میں کیا تھا۔ اپنے دورے سے پہلے صدر شی جن پنگ نے پاکستانی اخبار میں شائع ہونے والے ایک مضمون میں اپنے جذبات کا اظہار ان الفاظ میں کیا تھا ''پاکستان ایک مخلص اور قابل اعتماد دوست کے طور پر جانا جاتا ہے۔ ظاہر ہے چین پاکستان دوستی دونوں ملکوں کے عوام کے

دلوں میں نقش ہے۔ اس طویل رفاقت میں چین اور پاکستان نے مختلف شعبوں میں باہمی طور پر مفید اور ثمر آور تعاون کیا جس سے دونوں ملکوں کے عوام بھرپور طور پر مستفید ہوئے۔ اس وقت دونوں ملک پاک چین اکنامک کوریڈور کو تسلسل کے ساتھ آگے بڑھانے کے لیے مل کر کام کر رہے ہیں۔ ہم چین اور پاکستان کو ایک ایسی مشترک کمیونٹی بنانے کے عزم سے سرشار ہیں کہ جس کی منزل ایک ہو۔ ہم وسیع تر مشترکہ مفادات کے لیے تعاون کر رہے ہیں اور باہمی ترقی کے لیے کوشاں ہیں۔ ہمارا مقصد اپنے عوام کو زیادہ سے زیادہ سہولتیں فراہم کرنا اور ترقی کے روشن امکانات کو فروغ دینا ہے۔''

سی پیک چین کو پاکستان کے ذریعہ سمندر تک رسائی فراہم کرتا اور مغربی سنکیانگ کے شہر کاشغر کو بحیرہ عرب کے ساحل پر بلوچستان میں گوادر بندرگاہ سے ملاتا ہے۔ سی پیک بڑے بھائی کی جانب سے چھوٹے بھائی کی فعال سیاسی اور معاشی شراکت داری کو ظاہر کرتا ہے اور اس منصوبے نے پاک چین دوستی کو مضبوط کیا ہے۔ اتنی مضبوط کہ اس سے پہلے کبھی اتنی مضبوط نہ تھی۔

سی پیک ایک طویل مدتی منصوبہ کے تحت شروع کیا گیا تھا جس پر 21 نومبر 2017ء کو تین بڑے اجزا کے لیے درج ذیل ٹائم لائنز اور زمروں کے تحت دستخط کیے گئے:

1: ٹرانسپورٹیشن (ریلوے اور سڑکوں کا نیٹ ورک)

2: توانائی کا شعبہ

3: خصوصی اقتصادی زونز

سی پیک: پاکستان کے لیے تبدیلی لانے والا منصوبہ؟

لانگ ٹرم پلان (LTP) کے تحت 2021ء کے اوائل میں صنعتی تعاون، زرعی تعاون اور سائنس اور ٹیکنالوجی کے شعبوں میں تعاون پر مبنی تین نئے مشترکہ طور پر کام کرنے والے گروپ قائم کئے گئے۔ 2020ء میں یاؤ جنگ کی جگہ لینے والے سفیر نونگ رونگ نے بھی سی پیک کو بہترین بنانے کیلئے معمول سے ہٹ کر اقدامات کئے۔ مثال کے طور پر ان کی رہنمائی کے ساتھ آل پاکستان چائنا فرینڈ شپ ایسوسی ایشن (اے پی سی ایف اے) کا جنوری 2021ء میں احیا کیا گیا۔ اسی طرح پاکستان اور چین نے حال ہی میں ایک نئے فورم کو متحرک کیا ہے تاکہ دونوں ملکوں کے مابین بزنس ٹو

بزنس تعاون کو گہرائی تک فروغ دینے کے لیے پہلا زرعی اور صنعتی کوآپریشن انفارمیشن پلیٹ فارم قائم کیا جا سکے۔ اس حوالے سے ہونے والی تقریب میں دونوں ممالک کے سفیروں، سی پیک اتھارٹی کے چیئرمین، پاکستان اور چین کے فرسٹ کلاس بزنس گروپوں اور دیگر ٹیکنوکریٹس نے شرکت کی۔ حکام کا ماننا ہے کہ منصوبہ بند خصوصی معاشی اور صنعتی زونز کو آباد کرنے کے لیے پُر جوش بزنس ٹو بزنس سرگرمیاں ضروری ہیں۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ پاکستان کو بھی ہنرمند کارکنوں اور تکنیکی ماہرین کے ساتھ اس حوالہ سے وابستہ توقعات پر پورا اترنا چاہئے اور اتنا ہی ضروری یہ بھی کہ پاکستان کو آہنی بھائی چارے (آئرن برادر ہوڈ) پر سارا بوجھ ڈالنے کے بجائے اپنے انفراسٹرکچر کی ترقی اور بہتری کے لیے نمایاں اور فعال کردار ادا کرنا چاہئے۔

سی پیک/ بیلٹ اینڈ روڈ انیشی ایٹو قرضوں کا جال: افسانہ یا حقیقت؟

زیادہ تر مغربی خبر رساں ادارے، بشمول امریکہ اور برطانیہ اکثر چین کی پُرعزم تجارتی کوششوں کا مذاق اڑاتے ہیں اور بیلٹ اینڈ روڈ انیشی ایٹ (بی آر آئی) کو چھوٹے ایشیائی اور افریقی ممالک کے لیے 'قرضوں کا جال' قرار دیتے ہیں۔ سری لنکا کی بندرگاہ ہم بنٹوٹا اور سی پیک کا نام استعمال کر کے اکثر یہ کہا جاتا ہے کہ اس طرح چین غریب اور ترقی پذیر ممالک پر مالی بوجھ ڈال رہا ہے۔ سابق امریکی اسسٹنٹ سیکرٹری برائے جنوبی ایشیا ایلس ویلز نے نومبر 2019ء میں واشنگٹن کے ولسن سینٹر میں چین کے بیلٹ اینڈ روڈ انیشی ایٹو کے موضوع پر ہونے والے ایک سیمینار سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا ''اب سی پیک کے علاوہ چینی قرضوں کی ادائیگی کے بوجھ کے ساتھ چین پاکستان کی معیشت پر بڑا اثر ڈالنے جا رہا ہے۔ خاص طور پر اس وقت جب ادائیگی کا بڑا حصہ چار سے چھ برسوں میں واجب الادا ہونا شروع ہو جائے گا۔ یہاں تک کہ اگر قرض کی ادائیگی موخر کر دی گئی تو بھی یہ قرضے پاکستان کی معاشی ترقی کی استعداد کو مفلوج کر دیں گے اور یوں وزیراعظم (اب سابق) عمران خان کے اصلاحات کے ایجنڈے کو اپاہج بنا دیں گے۔ یہ ملٹی بلین پروجیکٹ پاکستان کی معیشت سے اپنا خراج وصول کرے گا۔'' 2020ء کے وسط میں اپنی ریٹائرمنٹ تک وہ عوامی سطح پر ایسی ہی باتیں کرتی رہیں کہ دوسرے معاملات کے علاوہ نسبتاً زیادہ لاگت اور کنٹریکٹس میں مبینہ

عدم شفافیت کی وجہ سے پاکستان چین کے قرضوں کے جال میں پھنستا جا رہا ہے۔

حقیقت کیا ہے یہ جاننے کے لیے اس حوالہ سے دو رپورٹس پر نظر ڈالنا مناسب رہے گا۔ ایک رپورٹ کے ذرائع امریکی جبکہ دوسری کے ذرائع آسٹریلوی ہیں۔ ان رپورٹس کا جائزہ لینے سے چین کے بیلٹ اینڈ روڈ انیشی ایٹو (بی آر آئی) کے تناظر میں معاشی پھیلاؤ کے بارے میں پروپیگنڈا کرنے والے امریکی اور بھارتی حکام کے شکوک وشبہات کو غلط ثابت کرنا آسان ہو جائے گا۔

ہمبنٹوٹا کا عجیب وغریب کیس:

ہمبنٹوٹا کی بندرگاہ کے بارے میں یہ کہانی امریکہ نے پھیلائی اور بھارتی حکام اس کو اس طرح پڑھتے ہیں کہ سب سے پہلے بیجنگ نے سری لنکا کو مجبور کیا کہ وہ اس پروجیکٹ کے اخراجات کے لیے چینی بینکوں سے قرضہ لے۔ ایک ایسا منصوبہ جس کی تجارتی کامیابی کا کوئی امکان نہیں تھا۔ دوسرا سخت شرائط اور آمدنی کے کمزور ذرائع نے آخر کار سری لنکا کو دیوالیہ کر دیا اور اس موقع پر بیجنگ نے بندرگاہ کے مشترکہ کنٹرول کا مطالبہ کیا اور سری لنکا کی حکومت کو مجبور کیا کہ ضمانت کے طور پر بندرگاہ چینی فرم کے حوالے کر دے۔

2018ء میں اس وقت کے امریکی نائب صدر مائیک پینس تو اس حد تک چلے گئے کہ اس ساری پیش رفت کو 'قرضوں کے جال کی ڈپلومیسی' قرار دے دیا۔ یہ جملہ وہ اپنی انتظامیہ کے آخری دنوں تک چین کے فوجی عزائم کے ثبوت کے طور پر دہراتے رہے۔ یہاں تک کہ سابق امریکی اٹارنی جنرل ولیم بار نے بحث کے لیے یہ کیس اٹھایا کہ بیجنگ ''غریب ملکوں پر قرضوں کا بوجھ لاد رہا ہے، شرائط پر دوبارہ گفت وشنید سے انکار کر رہا ہے اور پھر بنیادی ڈھانچہ کا کنٹرول خود سنبھال رہا ہے۔''

اس طرح چین کو مطعون کرنا تمام امریکی حکام اور یورپ اور دنیا کے دوسرے خطوں میں ان کے اتحادیوں کا وتیرہ بن چکا تھا۔ اگرچہ چینی حکام مخصوص مقاصد کے تحت جاری کی گئی ان تنبیہات اور تجاویز کو مسترد کرتے رہے لیکن حقائق پر مبنی بہترین جواب آسٹریلوی اور امریکی محققین کی جانب سے آیا جنہوں نے قرضوں کے جال میں پھنسانے کی کہانیاں کو واہمہ قرار دے کر مسترد کر

دیا۔ امریکہ میں جو بائیڈن کے اقتدار سنبھالنے کے فوری بعد جونز ہاپکنز یونیورسٹی کے برنارڈ شوارز اور ڈیبورہ براٹیگام، اور ہارورڈ بزنس سکول کے میگ رتھ مائر نے امریکی میگزین 'دی اٹلانٹک' میں لکھا ''ہماری تحقیق سے پتا چلا ہے کہ چینی بینک موجودہ قرضوں کی شرائط کی ری سٹرکچرنگ کے لیے تیار ہیں اور انہوں نے کبھی کسی ملک کا اثاثہ ضبط نہیں کیا۔ ایک چینی کمپنی کی جانب سے بندرگاہ کے اکثریتی حصص کا حصول ایک تنبیہی کہانی ہے لیکن یہ وہ کہانی نہیں جو ہم اکثر سنتے ہیں۔ اب واشنگٹن میں نئی انتظامیہ ہے اور ہمبنٹوٹا پورٹ کے حوالے سے غلط طور پر سمجھے گئے معاملے کے بارے میں سچائی کو آشکار کرنا ابھی باقی ہے۔''

سری لنکا کے ایک عظیم مورخ مائیکل اونداتجے (Michael Ondaatje) نے ایک بار کہا تھا ''سری لنکا میں ایک اچھے طریقے سے بولا گیا جھوٹ ایک ہزار حقائق کے برابر ہوتا ہے۔'' ان کی جانب سے لکھی گئی رپورٹ کا اختتامیہ ان الفاظ میں تھا ''قرضوں کے جال کی داستان ایسا ہی ایک جھوٹ ہے، ایک سفید جھوٹ۔''

''دی اٹلانٹک'' کی رپورٹ کے مطابق ہمبنٹوٹا شہر سری لنکا کے جنوبی سرے پر اور بحر ہند کی مصروف بحری راہ گزر سے چند سمندری میلوں کے فاصلے پر واقع ہے۔ ایشیا اور یورپ کے مابین تقریباً تمام تر تجارت اسی راستے سے ہوتی ہے جبکہ عالمی سطح پر سمندروں کے ذریعے جتنی بھی تجارت ہوتی ہے اس کا 80 فیصد اسی سمندری گزرگاہ سے گزرتا ہے۔ جب ایک چینی فرم نے شہر کی بندرگاہ کی تعمیر کا معاہدہ کیا تو اس نے خود کو پہلے سے جاری مغربی مسابقت میں گھرا پایا اگرچہ امریکہ نے اس مسابقت کو بڑی حد تک ترک کر چکا تھا۔

''دی اٹلانٹک'' نے فروری 2021ء میں ایک مطالعاتی رپورٹ شائع کی تھی جو کینیڈین انٹرنیشنل ڈویلپمنٹ ایجنسی کے تعاون سے مرتب کی گئی تھی۔ اس رپورٹ میں یہ نتیجہ اخذ کیا گیا تھا کہ ہمبنٹوٹا بندرگاہ کی تعمیر قابل عمل تھی اور معاون دستاویزات ظاہر کرتی ہیں کہ کینیڈا والوں کا بڑا خوف یہ تھا کہ وہ کہیں اس منصوبے کو یورپی مسابقت کاروں کے ہاتھوں کھو نہ دیں۔ کینیڈا کا منصوبہ آگے بڑھنے میں ناکام رہا جس کی بڑی وجہ سری لنکا کی سیاست کے اندر موجودہ مسلسل اتار چڑھاؤ تھا لیکن ہمبنٹوٹا میں بندرگاہ بنانے کا منصوبہ راجاپاکساؤں کے دورِ حکومت میں توجہ حاصل کرتا گیا۔ مہندا راجا

پاکسا جو 2005ء سے 2015ء تک سری لنکا کا صدر رہا اور اس کا بھائی گوٹابایا راجا پاکسا جو سابق وزیر دفاع ہونے کے علاوہ 2019ء سے 14 جولائی 2022ء تک سری لنکا کا صدر رہا گوٹابایا میں ہی پلے بڑھے تھے۔

مذکورہ رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ انہوں یعنی پاکسا حکمرانوں نے اس علاقے میں بڑے بحری جہازوں کو متوجہ کرنے کا وعدہ کیا تھا تاکہ تجارت کو بڑھایا جا سکے۔ یہ ایک ایسی کال تھی 2004ء کے تباہ کن سونامی کی وجہ سے سری لنکا کے ساحل اور مقامی معیشت کو ہونے والے نقصان کے بعد جس کی فوری ضرورت مزید بڑھ گئی تھی۔ اسی مضمون کے مطابق ایک اور تحقیق کی بنیاد پر سری لنکن حکومت نے امریکہ اور بھارت سے اس سلسلے میں مدد کے لیے رابطہ کیا لیکن دونوں ممالک نے انکار کر دیا۔ اس صورت حال نے چینی تعمیراتی فرم ''چائنا ہاربر گروپ'' کو حوصلہ دیا کہ وہ اس منصوبے کے حصول کے لیے لابنگ کرے۔ چین کے ایگزم بینک نے اس منصوبے کو فنڈ دینے پر رضامندی ظاہر کی۔ یوں چین نے 2007ء میں یہ منصوبہ حاصل کیا تھا یعنی صدر شی جن پنگ کی جانب سے بیلٹ اینڈ روڈ پروجیکٹ پیش کئے جانے سے چھ سال پہلے سری لنکا اپنی طویل خانہ جنگی کے سب سے خونیں مرحلے سے گزر رہا تھا اور دنیا مالی بحران کے دہانے پر کھڑی تھی۔

رپورٹ یہ بتاتی ہے کہ یہ تفصیلات عالمی سطح پر بولے گئے اس جھوٹ کی کہانی کو بے نقاب کرنے کے لیے بہت اہم ہیں۔ چائنا ایگزم بینک نے 307 ملین ڈالر قرضے کی پیشکش کی تھی۔ یہ قرضہ 15 سال کی مدت کے لیے تھا جبکہ چار سال کا گریس پریڈ الگ تھا۔ اس کے علاوہ سری لنکا کو یہ پیشکش کی گئی تھی کہ وہ درج ذیل دو آپشنز میں سے کسی ایک کا انتخاب کر لے۔ پہلا: 6.3 فیصد فکسڈ شرح سود قبول کر لے اور دوسرا: لندن انٹر بینک آفرڈ ریٹ (LIBOR) کے مطابق شرح سود میں کمی بیشی کے مطابق اس قرضے پر شرح سود کے لیے رضامند ہو جائے۔ یاد رہے کہ LIBOR ایسی معیاری شرح سود ہے جس پر بڑے عالمی بینک ایک دوسرے کو قرض دیتے ہیں۔ LIBOR انٹر کانٹینٹل ایکسچینج کے زیر انتظام ہے، جو بڑے عالمی بینکوں سے دریافت کرتا ہے کہ چھوٹی مدت کے قرضوں پر وہ دوسرے بینکوں سے کتنا سود وصول کریں گے؟ یعنی سود کا فلوٹنگ ریٹ کیا ہوگا۔ کولمبو نے پہلے والے آپشن کا انتخاب کیا'' اس حقیقت کے تناظر میں کہ جس دوران بات چیت کا عمل جاری

تھا'' عالمی سطح پر سود کی شرح میں اضافہ ہوتا رہا۔ کولمبو کو یہ بھی امید تھی کہ سازگار شرائط کے ساتھ اس معاملہ کو حتمی شکل دی جا سکے گی۔ بندرگاہ کا پہلا مرحلہ شیڈول کے مطابق تین سالوں میں مکمل کر لیا گیا۔

ایک داخلی تنازعہ کا شکار ملک جو ٹیکسوں سے ریونیو پیدا کرنے کی جدوجہد میں مصروف ہو اس کے لیے یہ قرضہ مناسب محسوس ہوتا ہے جبکہ حالات یہ تھے کہ سری لنکا پورٹ اتھارٹی کے ایک سابق چیئرمین وکرما سوریا نے ایک دفعہ بتایا تھا کہ جنگ کے دوران 300 ملین ڈالر جیسا بڑا کمرشل قرضہ حاصل کرنا آسان نہ تھا جبکہ اسی سال سری لنکا نے اپنا پہلا بین الاقوامی بانڈ بھی جاری کیا تھا جس پر شرح سود 8.25 فیصد تھی۔ 2009ء میں جب سری لنکا کی خانہ جنگی ختم ہوگئی تو مہندا راجاپاکسا نے پورٹ کے فیز ٹو کو آگے بڑھایا تاکہ ہمبنٹوٹا کو ایک کنٹینر پورٹ میں تبدیل کیا جا سکے۔ 2012ء میں سری لنکا نے چائنا ایگزم بینک سے مزید 757 ملین ڈالر کا قرضہ لیا لیکن اس بار مالیاتی بحران کے بعد والے کم شرح سود پر جو 2 فیصد تھی

2014ء تک ہمبنٹوٹا میں پیسہ ضائع ہو رہا تھا۔ یہ ادراک کرتے ہوئے کہ وہاں مزید تجربہ کار آپریٹرز کی ضرورت ہے سری لنکا پورٹ اتھارٹی نے چائنا ہاربر اینڈ چائنا مرچنٹ گروپ کے ساتھ ایک معاہدہ کیا جس کی رو سے انہیں اگلے 35 برسوں کیلئے اس بندرگاہ کو مل کر مشترکہ طور پر ترقی دینا اور چلانا تھا۔ چائنا مرچنٹس گروپ کولمبو بندرگاہ پر پہلے ہی ایک نیا ٹرمینل چلا رہا تھا اور چائنا ہاربر نے کولمبو پورٹ سٹی میں 1.4 بلین ڈالر کی سرمایہ کاری کر رکھی تھی۔ یہ ایک منافع بخش رئیل اسٹیٹ پروجیکٹ تھا جس میں زمین کی بحالی بھی شامل تھی لیکن جب وکلا نے اس حوالہ سے کنٹریکٹس پر توجہ دی تو اس معاملے نے سیاسی ہلچل کی شکل اختیار کرنا شروع کر دی تھی۔

راجاپاکسا نے جنوری 2015ء میں اچانک حیرت انگیز طور پر الیکشن کرانے کا اعلان کر دیا تھا اور انتخابی مہم شروع ہوگئی تھی لیکن انتخابی مہم کے آخری مہینوں میں وزیر صحت میتھری پالا سری سینا نے راجاپاکسا کو چیلنج کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ ملائیشیا، مالدیپ اور زیمبیا میں مخالف امیدواروں کی طرح سری سینا نے بھی چین کے ساتھ مالیاتی معاملات کو اپنی انتخابی مہم کے لیے استعمال کیا اور حکومت پر کرپشن کے الزامات لگائے۔ حیرت انگیز طور پر سری سینا یہ الیکشن جیت گیا۔

بین الاقوامی سویرین بانڈز پر بھاری ادائیگیوں ''جو ملک کے بیرونی قرضوں کے تقریباً 40 فیصد پر مشتمل تھیں'' نے سری سینا کی حکومت کو فوری طور پر سنگین مالیاتی بحران میں ڈال دیا۔ جب سری سینا نے عہدہ سنبھالا تو سری لنکا چین کی نسبت جاپان، ورلڈ بینک اور ایشین ڈویلپمنٹ بینک کا زیادہ مقروض تھا۔ 2017ء میں قرض پر واجب الادا 4.5 بلین ڈالر کی ادائیگیوں میں سے صرف 5 فیصد ہمبنٹوٹا بندرگاہ کے حوالے سے تھیں۔ راجاپاکسا اور سری سینا، دونوں کے ادوار میں سنٹرل بینک کے گورنر بہت سے معاملات سے اتفاق نہیں کرتے تھے لیکن انہوں نے بتایا کہ سری لنکا کے مالی مسائل کی وجہ ہمبنٹوٹا اور چینی سرمایہ کاری نہیں تھیں۔

ان سارے مسائل کے باوجود ڈیفالٹ کی نوبت نہیں آئی تھی اور کولمبو نے آئی ایم ایف سے بیل آؤٹ پیکیج حاصل کرنے کا اہتمام کرلیا اور فیصلہ کیا کہ انتہائی ضروری ڈالر اکٹھے کرنے کے لیے کم کارکردگی دکھانے والی ہمبنٹوٹا پورٹ کو کسی تجربہ کار کمپنی کے حوالے کر دیا جائے، جیسا کہ کینیڈا والوں نے تجویز کیا تھا۔ کوئی کھلا ٹینڈر نہیں تھا اور صرف دو بولیاں آئی تھیں۔ چائنا مرچنٹس اور چائنا ہاربر کی جانب سے اور سری لنکا نے چائنا مرچنٹس کا انتخاب کرلیا۔ اسے اکثریتی شیئر ہولڈر بناتے ہوئے بندرگاہ 99 سال کے لیز پر اس کے حوالے کر دی گئی اور اس سے حاصل ہونے والے 1.12 بلین ڈالر اپنے غیر ملکی زرمبادلہ کے ذخائر میں رکھے۔

کولمبو میں قائم ایک آزادانہ طور پر کام کرنے والے تھنک ٹینک ویریٹی ریسرچ (Verité Research) کے ریسرچ ڈائریکٹر سبھاشینی ابے سنگھے نے بتایا کہ بندرگاہ کے اس سارے واقعہ سے پہلے سری لنکا بحر ہند میں ڈوب سکتا تھا اور زیادہ تر مغربی دنیا اس کا نوٹس بھی نہ لیتی لیکن پھر جزیرے پر رہنے والی یہ قوم اچانک نمایاں ہوگئی اور اتنی کہ واشنگٹن میں خارجہ پالیسی کی تقاریر میں اس کا ذکر ہونے لگا اور اس وقت کے امریکی نائب صدر مائیک پینس نے تشویش کا اظہار کیا تھا کہ ہمبنٹوٹا چین کے لیے 'فارورڈ ملٹری بیس' بن سکتا ہے۔

یہ باتیں اپنی جگہ لیکن ہمبنٹوٹا کا محل وقوع صرف کاروباری نقطۂ نظر سے تزویراتی ہے۔ بحر ہند کے پھیلاؤ سے بچنے کے لیے بندرگاہ کو کاٹ کر ساحل میں تبدیل کیا گیا۔ اس کے تنگ چینل سے ایک وقت میں صرف ایک سمندری جہاز گزر سکتا ہے اور وہ بھی روایتی طور پر ایک ٹگ بوٹ کے

ذریعے۔ کسی فوجی تصادم کی صورت میں وہاں تعینات بحری جہاز ایک بیرل میں پھنسی مچھلی کی طرح ہوں گے۔ لہٰذا چین کی بحریہ کے جہاز اس بندرگاہ کا استعمال نہیں کر سکتے، البتہ یہ سری لنکا کی اپنی بحریہ کی جنوبی کمان کے لیے بیس بن سکتی ہے۔

''قرضوں کے جال کی ڈپلومیسی'' کا تصور چین کو ایک سازشی قرض دہندہ اور سری لنکا جیسے ممالک کو اس کے سیدھے سادے شکار کے طور پر پیش کرتی ہے لیکن ان معاملات پر ایک قریبی اور گہری نظر ڈالی جائے تو صورت حال کہیں زیادہ پیچیدہ نظر آتی ہے۔ داخلی ترقی کی طرح چین کا باہر کی جانب مارچ بھی ایک جانچ پڑتال پر مبنی تجرباتی عمل ہے، یعنی معاملات کو آگے بڑھانے اور ان سے سیکھنے کا عمل جاری رہتا ہے اور منصوبوں میں بار بار ایڈجسٹمنٹس کی جاتی ہیں تاکہ ان کو زیادہ سے زیادہ بہتر بنایا جا سکے۔ مثال کے طور پر ہمبنٹوٹا میں بندرگاہ کی تعمیر کے بعد چینی بینکوں اور فرموں نے یہ سیکھا کہ سری لنکا میں مضبوط آدمیوں کی کمی ہے۔ چنانچہ انہوں نے سیاسی خطرات سے نمٹنے کے لیے بہتر حکمت عملیاں مرتب کیں۔ اب وہ ان حکمت عملیوں کو آگے بڑھا رہے ہیں اور قابلِ فہم کاروباری مواقع سے بہتر طور پر فائدہ اٹھا رہے ہیں جبکہ جہاں انہیں یہ اندازہ ہو جائے کہ جیتا نہیں جا سکتا، وہاں وہ قدم پیچھے ہٹا لیتے ہیں۔ پھر بھی دونوں اطراف سے امریکی رہنما اور مفکر چین کے ''جدید دور کے استعمار'' ہونے کے بارے میں تقریریں کرتے رہتے ہیں۔

اس اصطلاح کی ستم ظریفی کے وہ خود شکار ہو سکتے ہیں لیکن چین یا پاکستان نہیں۔

پچھلے 20 سالوں میں چینی فرموں نے بہت کچھ سیکھا ہے کہ بین الاقوامی تعمیراتی کاروبار میں کیسے کھیلا جائے اور اپنی جگہ بنائی جائے جس پر یورپ کا غلبہ برقرار رہا ہے اور صورت حال یہ ہے کہ اس وقت چین کی 27 فرمیں 100 بڑے عالمی ٹھیکے داروں میں شامل ہیں۔ یہ ایک حیرت انگیز ترقی ہے کیونکہ 2000ء میں ایسی چینی فرموں کی تعداد محض 9 تھی جبکہ یورپ کی 41 فرمیں تھیں۔ اب یورپ کی فرموں کی تعداد گھٹ کر 37 ہو چکی ہیں۔ امریکہ کی بات کی جائے تو دو دہائیاں پہلے اس کی عالمی حیثیت کی فرموں کی تعداد 19 تھی جو اب کم ہو کر محض 7 رہ گئی ہے۔

صرف چینی فرمیں ہی چین کی مالی اعانت سے چلنے والے منصوبوں سے فائدہ اٹھانے والی واحد کمپنیاں نہیں ہیں۔ ہمبنٹوٹا کی ترقی سے بھارت سے زیادہ گھبراہٹ کا شکار کوئی اور ملک نہیں

ہوا ہوگا۔ وہ اس خطے کا ایک بڑا ملک ہے جس نے سرمایہ کاری اور مساوات کی بنیاد پر پارٹنرشپ کے لیے سری لنکا کی درخواست متعدد بار مسترد کر دی تھی۔ اس کے باوجود بھارتی نگرانی میں چلنے والی کاروباری کمپنی میگھراج نے برطانیہ کی انجینئرنگ فرم ایٹکنز لمیٹڈ میں شمولیت اختیار کی۔ یہ ایک ایسا بین الاقوامی کنسورشیم ہے جو ہمبنٹوٹا بندرگاہ اور ایک نئے کاروباری زون کی ترقی کے لیے قائم کیا گیا۔ فرانسیسی فرمیں Bolloré اور CGM-CMA نائیجیریا، کیمرون اور دوسری جگہوں پر چائنا مرچنٹس اور چائنا ہاربر کے ساتھ شراکت داری میں بندرگاہوں کی تعمیرات کے لیے کام کرتی رہی ہیں۔

''قرضوں کے جال کے افسانے'' کا دوسرا رخ مقروض ممالک پر مشتمل ہے۔ سری لنکا، کینیا، زیمبیا یا ملائیشیا جیسے مقامات جیو پولیٹیکل گیمز کے لیے کوئی اجنبی نہیں ہیں اور وہ ان امریکی تصورات کی وجہ سے پریشان ہیں کہ انہیں اتنی آسانی سے دھوکہ دیا گیا۔ ملائیشیا کے ایک سیاست دان نے نام پوشیدہ رکھنے کی شرط پر ہمیں بتایا کہ چینی فنانس ملک کے سیاسی ڈرامہ میں کیا کردار ادا کرتا ہے۔ ''کیا امریکی محکمہ خارجہ نہیں بتا سکتا کہ امریکی مہم کے دوران کی جانے والی اس بیان بازی کا کیا مطلب ہے کہ ہمارے مخالفین چین کے غلام ہیں اور دراصل چین کے غلام بن رہے ہیں؟''

ایک اور رپورٹ، جو چیتھم ہاؤس کی شائع کردہ ہے، اور جو آسٹریلین تھنک ٹینک لووی انسٹی ٹیوٹ نے بھی جاری کی، میں شہر حمیری اور لی جونز کا استدلال ہے کہ بی آر آئی کے بارے میں آسٹریلیا کے ردعمل کے بارے میں قائم کئے گئے مفروضے غلط ہیں اور یہ کہ چین کی ''قرضوں کے جال کی سفارت کاری'' ایک افسانہ ہے۔ رپورٹ کے مصنفین کا کہنا ہے ''یہ بیانیہ بالکل غلط ہے۔ منصوبہ سری لنکا کے سابق صدر مہندا راجاپاکسا کی طرف سے تجویز کیا گیا تھا بیجنگ کی جانب سے نہیں اور یہ تجویز بھی حکومت کے کرپٹ اور غیر پائیدار ڈویلپمنٹ پروگرام کے تناظر میں دی گئی تھی۔ سری لنکا کے قرضوں کی پریشانی نے چینی قرضے کی وجہ سے جنم نہیں لیا بلکہ اس کا سبب مغرب کے غلبہ والی کیپیٹل مارکیٹوں سے ضرورت سے زیادہ قرض لینا ہے۔''

مختصراً یہ کہ ہمبنٹوٹا پورٹ کیس اس کے بہت کم ثبوت دکھاتا ہے کہ جو کچھ ہوا وہ چینی حکمت عملی کا نتیجہ تھا بلکہ یہ بتاتا ہے کہ یہ سب قرضے لینے والوں کی ناقص گورننس کی وجہ سے ہوا، لیکن سب

سے اہم بات یہ ہے کہ یہ بیان بازی کی جنگ کو بے نقاب کرتا ہے جس میں دنیا بھر میں سب سے بلند بانگ غنڈوں کا غلبہ ہے۔ یہ کوئی انوکھی بات نہیں ہے؟ چین پیسیفک کے ممالک پر قرضوں کا بوجھ بڑھانے کا بھی ذمہ دار نہیں تھا۔ جب امریکی فیڈرل ریزرو نے اپنے کوانٹی ٹیٹو ایزنگ پروگرام کو بتدریج کم کرنا شروع کر دیا تو اچانک سری لنکا کی قرض لینے کی لاگت بڑھ گئی جس کی وجہ سے اسے بین الاقوامی مالیاتی فنڈ سے مدد لینے پر مجبور ہونا پڑا۔

چیتھم ہاؤس کی رپورٹ آسٹریلوی پالیسی سازوں کو خبردار کرتی ہے کہ وہ بی آر آئی کے بارے میں یہ ظاہر کرنے سے گریز کریں کہ جیسے یہ منصوبہ تزویراتی طور پر مرتب کیا گیا ہے۔ رپورٹ مصنفین اس بات پر قائم ہیں کہ چین کی ڈویلپمنٹ فنانسنگ وصول کنندہ کی ایما پر ہوتی ہے اور سیدھی سی بات ہے کہ چین دوسرے ممالک کو مجبور نہیں کر سکتا کہ وہ اپنی سرزمین پر اس کے منصوبوں کو قبول کریں۔ جب تک منصوبہ قبول کرنے والے چین کے سرکاری اداروں کو منصوبے شروع کرنے، ان کے کاموں کو محفوظ بنانے اور منصوبوں کے لیے قرضوں کی منظوری نہ دیں بی آر آئی کے منصوبے آگے نہیں بڑھ سکتے۔ اس طرح بی آر آئی کو دوطرفہ تعاملات کے ذریعے آہستہ آہستہ آگے بڑھایا جاتا ہے۔ یہ صرف چین کی کسی حکمت عملی کے تحت نہیں ہے۔

بیلٹ اینڈ روڈ انیشی ایٹو کا کوئی منصوبہ چین اور منصوبے کو قبول کرنے والے ملک کے مابین تعامل سے حتمی شکل پاتا ہے، محض چین کے تیار کردہ بنیادی خاکہ کے تحت نہیں۔ بعض ممالک کی جانب سے قرضے یا امداد حاصل کرنے والے ممالک پر بی آر آئی کو مکمل طور پر مسترد کرنے کے لیے دباؤ ڈالنے والی یہ پالیسی کام نہیں کرے گی کیونکہ بہت سے ممالک چینی فنانس حاصل کرنے کے آپشن کو برقرار رکھنا چاہیں گے۔ اس کے بجائے آسٹریلیا اور دوسرے ممالک کو متبادل قرضے حاصل کرنے والے ممالک کو قابلِ عمل ڈویلپمنٹ فنانسنگ فراہم کرنی چاہئے جیسے آسٹریلیا کی پیسیفک کے خطے کے لیے فنانسنگ سہولت کا پروگرام (AIFFP)۔ رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ ان ممالک کے ایسے اقدامات سے قرضے حاصل کرنے والے ممالک اور چین، دونوں کی بی آر آئی گورننس کو بہتر بنانے اور بڑے منصوبوں میں شفافیت برقرار رکھنے پر توجہ مرکوز رہے گی۔

سی پیک کا ملتا جلتا معاملہ:

بی آر آئی کے تحت چلنے والے سی پیک منصوبے کو بھی اسی طرح کی تنقید کا سامنا کرنا پڑا کیونکہ وزیراعظم نواز شریف کی قیادت میں اس وقت کی حکومت بھی اس منصوبے کے بنیادی ڈھانچے میں سرمایہ کاری کی خواہاں تھی کیونکہ سیاسی حمایت کو فروغ دینے، سرپرستی کے نیٹ ورک کو فیڈ کرنے اور کک بیکس حاصل کرنے کا یہ ایک آسان طریقہ ہے۔

ناقدین اب بھی سمجھتے ہیں کہ پاکستانی حکومت نے ادائیگیوں کی تفصیلات پر مناسب توجہ دی نہ ہی اس کے حکام نے چینی سرمایہ کاریوں کے حوالے سے بہتر شرائط طے کرنے کے لیے بات چیت کی۔ حکام نے سوچا ہوگا کہ کون سا ملک ہوگا جو اربوں ڈالر کی سرمایہ کاری اور تجارتی قرضوں سے انکار کرے گا جب اسے بڑے پیمانے پر بیروزگاری اور کم پیداوار کا سامنا کرنا پڑ رہا ہو؟ عام طور پر حکومت کے سربراہ کی ترجیح ہوتی ہے کہ روزگار، سرمایہ کاری اور صنعتی پیداوار میں اضافے کے ذریعہ حکومتی ریونیو بڑھایا جائے اور اس کے ساتھ ساتھ غیر قانونی کاموں کی روک تھام میں بھی مصروف رہا جائے۔ حقیقی سیاست میں یہ اقدامات ایک ادراک کردہ قومی ضرورت ہوتے ہیں جن کے بارے میں خیال کیا جاتا ہے کہ یہ ترپ کے پتوں جیسے تصورات ہیں ویسے ہی ''جیسے اخلاقیات اور شفافیت'' لیکن بیرون ملک مفادات کو آگے بڑھانا ہو تو یہ تصورات پیچھے چلے جاتے ہیں جیسا کہ ہم نے نائن الیون کے بعد کی جنگوں میں دیکھا کہ امریکہ اور برطانیہ نے ملی بھگت سے وسیع پیمانہ پر تباہی پھیلانے والے ہتھیاروں کو بنیاد بنا کر عراق کو تاخت و تاراج کیا، لیبیا میں مداخلت (جو جنگ کرنے والے گروہوں تک محدود تھی) اور شام میں جنگ شروع کی جن سے ان ممالک کے سماجی و اقتصادی انفراسٹرکچر کو بہت زیادہ نقصان پہنچا اور سیاسی انتشار پھیلا۔

مذکورہ بالا تفصیلی بحث کا مقصد یہ بتانا اور اس امر کی جانب توجہ دلانا ہے کہ سرمایہ کاری اور اقتصادی تعاون کا چینی ماڈل کس طرح کام کرتا ہے اور یہ کہ قرضوں کے جال کی نام نہاد ڈپلومیسی ایک واہمہ ہے جو بڑی حد تک غلط تصورات اور خدشات پر مبنی ہے۔ مغربی تنقید اور شکوک وشبہات ایک بنیادی معاشی حقیقت کو نظر انداز کرتے ہیں اور وہ حقیقت یہ ہے کہ سرمائے کی کمی کے شکار ایشیائی اور

2010ء میں سری لنکا کے اس وقت کے صدر مہندا راجا پکسا (درمیان میں) ہمبنٹوٹا میں
چینی فنڈ سے تعمیر ہونے والی بندرگاہ کی افتتاحی تقریب کے موقع پر۔

افریقی ترقی پذیر ممالک ہمیشہ تجارتی سرمایہ کاری اور ڈویلپمنٹ فنانسنگ کا خیر مقدم کرتے ہیں۔ جیسا کہ چیتھم ہاؤس کی رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ مغربی مالیاتی وسائل کی عدم موجودگی اور بڑی مغربی کارپوریشنوں کی جانب سے ان ممالک میں سرمایہ کاری سے ہچکچاہٹ کی وجہ سے مؤخرالذکر (ترقی پذیر ممالک) چینی سرمایہ کاری کا بخوشی خیر مقدم کریں گے جیسا کہ سی پیک منصوبوں سے ظاہر ہے۔ ان منصوبوں کے آغاز کے بعد پہلے پانچ سالوں کے اندر پاکستان میں 30 بلین ڈالر سے زائد رقم آئی جو زیادہ تر توانائی اور انفراسٹرکچر پروجیکٹس پر صرف ہوئی اور جس کے نتیجے میں ملک کو بجلی کی کہنہ بندشوں سے نجات ملی اور ہائی ویز/موٹرویز نیٹ ورک کو وسعت دی گئی۔

سری لنکا کے برعکس پاکستان نے زیادہ رعایتی قرضے لیے جن کی میعاد 25 سال تھی اور مزید پانچ سال رعایتی مدت بھی تھی۔ 2021ء کے اوائل تک حکومتی سطح پر پاکستان پر چینی قرضہ 8 بلین ڈالر سے کچھ زیادہ تھا جو ملک کے کل غیر ملکی قرضوں کا 8 فیصد بنتا ہے۔

مجھے سابق سفیر یاؤ جنگ کے 2020ء کے اوائل میں دل تڑپا دینے والے وہ ریمارکس آج بھی یاد ہیں جو انہوں نے مجھے دیئے گئے ایک انٹرویو کے دوران دیئے تھے۔ انہوں نے کہا

تھا ''اگر پاکستان مشکل میں ہے تو ہم کبھی بھی اپنے قابل اعتماد دوست پر دباؤ نہیں ڈالیں گے کہ وہ واجب الادا قرضے واپس کرے جن کی واپسی کے لیے 25 سال کی مدت رکھی گئی ہے اور جو پاکستان کے بیرونی قرضوں کے 6 فیصد سے بھی کم ہیں۔''

اگست 2020ء تک چینی قرضے اور ادائیگیوں کے توازن کے حوالے سے پاکستان کی امداد 8.5 بلین ڈالر کے ہندسے پر کھڑی تھی جس میں کم وبیش وہ 3 بلین ڈالر بھی شامل ہیں جو ادائیگیوں کے توازن کے حوالے سے فراہم کئے گئے تھے۔

دوسروں کو ساتھ لے کر چلنے کا چینی انداز جغرافیائی معاشیات کا ایک ایسا دوستانہ نسخہ ہے جس میں بغیر کسی جغرافیائی یا سیاسی جبر کے اور بغیر بازو مروڑے چند متفقہ اصولوں پر کایا پلٹ سکتی ہے اور انسانیت کا بھلا ہوسکتا ہے۔

باب دوئم

چین کیا ہے؟

''ہمیں کون سا راستہ اختیار کرنا چاہیے؟ یہ پارٹی کے مستقبل اور پارٹی کے مقصد کی کامیابی کے لیے ایک اہم سوال ہے۔ چینی خصوصیات والا سوشل ازم، سائنسی سوشل ازم اور چینی تاریخ کی سماجی ترقی کے نظریوں کے انضمام پر مبنی ہے۔ سوشل ازم چین میں جڑ پکڑ چکا ہے۔ یہ عوام کی خواہشات کی عکاسی کرتا ہے اور ملک کی ترقی کی ضروریات اور وقت کے تقاضوں کو پورا کرتا ہے۔ یہ ہر لحاظ سے ایک معتدل اور آسودہ معاشرہ تشکیل دینے کے لیے یقینی راستہ ہے۔ سوشلسٹ جدیدیت کی دوڑ میں، اور چینی قوم کی عظیم تجدید کے حوالے سے۔''

(صدر شی جن پنگ، 5 جنوری 2013ء)

کون سا راستہ اختیار کرنا ہے

چینی کردار کی تعریف کیا ہے؟

چین اجتماعی حقوق اور سماجی حقوق کا میلان رکھتا ہے چنانچہ مغرب اور چین کے مابین بڑا فرق ''میں'' اور ''ہم'' کا ہے۔ صدر شی جن پنگ کی مذکورہ بالا کہانی بھی چینی معاشرے میں خاندان کی اہمیت کو واضح کرتی ہے جہاں خاندانی اقدار اب بھی بہت مضبوط ہیں۔ یہ چینیوں کے کردار کا حقیقتاً ایک اہم عنصر ہے۔ زیادہ تر مغربی ممالک اب بھی اس جدوجہد میں ہیں کہ چینی معاشرے کی اس خصوصیت کو ڈی کوڈ کر سکیں۔ چینی ذہنیت کی جڑیں کنفیوشس کی فکر میں پیوست ہیں اور قومیت کا گہرا

احساس، ملک سے وابستگی اور ہزاروں سال پُرانی ثقافت کی مجموعی میراث پر فخر اس کی قوت محرکہ ہیں۔ یہ ایک ایسی ذہنیت یا سوچ ہے جو ہم عصر شہریوں کے لیے حساس ہے۔ نپی تلی، محتاط اور تزویری، دوسرے لفظوں میں یہ طویل مدتی ہونے کے لیے ڈیزائن کی گئی ہے۔

چینیوں کے ساتھ اپنی تمام بات چیت میں، میں نے ان میں سے زیادہ تر کو جبلی طور پر تفصیل پر دھیان دینے والا، منصوبہ بندی میں انتہائی حکمت کار، نپا تُلا لیکن عمل درآمد میں یقینی، مہمانوں کی حساسیت کا خیال رکھنے والا، اور پُرعزم دوست پایا۔ وہ کسی صورت حال پر فوری ردعمل سے پرہیز کرتے ہیں، اور اس وقت تک کوئی پوزیشن نہیں لیتے جب تک وہ کسی مسئلے یا کسی صورت حال کو اندرونی شکل نہ دے لیں یعنی اپنا نہ لیں۔ یہ خاصیت چینیوں اور ان کے ہمسایوں یعنی جاپانیوں میں مشترک ہے۔ وہ عموماً شیخی بگھارنا پسند نہیں کرتے، غیر ضروری بیانات نہیں دیتے۔ اس کے بجائے وہ اپنے مقاصد پر نظر رکھتے ہیں اور وہ مقاصد حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ چینی لوگ خاموشی سے اپنے مشن یا تفویض کردہ کام کو آگے بڑھانا پسند کرتے ہیں۔ ان کا طرز عمل یہ ہے کہ کوئی چیز حقیقی طور پر حاصل کرنے سے پہلے غیر ضروری شور نہ مچایا جائے۔

میں نے یہ سبق اپریل 2009ء میں چائنیز اکیڈمی آف سوشل سائنسز کی ایک کانفرنس میں سیکھا تھا۔ کانفرنس کے آغاز میں، میں فوری طور پر اس حقیقت سے آگاہ ہو گیا تھا کہ ہمارے چینی ہم منصبوں نے اپنا مکمل ہوم ورک کر رکھا ہے۔ انہوں نے پاکستان کی تازہ ترین خبریں تک پڑھ رکھی تھیں، اور کانفرنس کے مرکزی ایجنڈے کے نکات سے واضح طور پر آگاہ تھے۔ اس کے بالکل برعکس پاکستانی بالکل تیار نہیں تھے اور یہ چیز میرے لیے شرمندگی کا باعث تھی۔ پاکستانیوں کی تیاری ناقص تھی اور جس موضوع پر بات کرنا تھی اس سے وہ نمایاں طور پر انحراف کر رہے تھے۔ مثلاً وہاں موجود حیرانی میں مبتلا ایک دوست نے صدر آصف زرداری کی جانب سے جنوبی وزیرستان میں چھپے دہشت گردوں کے خلاف کریک ڈاؤن کے اعلان کا حوالہ دیتے ہوئے مجھ سے یہ سوال کیا کہ ''پاکستان کو ایسا اعلان کرنے کی کیا ضرورت تھی کہ وزیرستان میں فوجی آپریشن کیا جا رہا ہے؟'' پھر اس نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا ''کیا آپ واقعی چوروں کے خلاف کارروائی کرنے سے پہلے انہیں خبردار کرتے ہیں؟'' اس کی اصل تشویش یہ تھی کہ اگر ایسے کریک ڈاؤنز کا سرکاری اور پرائیویٹ میڈیا پر

بڑے پیمانے پر اعلان کیا جا رہا تھا تو ایسی صورت میں کیا پاکستان واقعی اپنے اس عمل میں سنجیدہ ہے؟

چینی لوگ درپیش تمام مسائل کے حل کے لیے عملی نقطۂ نظر اپناتے ہیں جو بنیادی طور پر ان کے تجربے کی بنیاد پر ہوتا ہے اور وہ اس قول کو پیش نظر رکھتے ہیں 'جب آپ دریا عبور کریں تو کنکریاں محسوس کریں۔' یہ قول چین کی حکمت عملیوں اور پالیسیوں میں بہت اہم کردار ادا کرتا ہے۔ پہلے سے سوچی سمجھی تھیوریاں نہیں ہوتیں، اس کے بجائے وہ پائلٹ پروجیکٹس کے ذریعے بڑے آئیڈیاز کی جانچ کرتے ہیں۔

جنگوں کے بجائے اقتصادی رابطہ

ان معاملات میں بہت واضح فرق ہے۔ چینی حکمت نفاست کے ساتھ کام کرتی ہے۔ وہ خطرے کی گھنٹیاں نہیں بجاتے۔ گھمنڈ کرنا ان کا کام نہیں ہے۔ آپ چینی اعلیٰ حکام کو چین کو اگلی سپر پاور قرار دینے یا بیجنگ کی دنیا کے ایک نئے لیڈر کے طور پر تصویر کشی سے سختی سے گریز کرتے ہوئے دیکھیں گے۔ وہ زیادہ تر دوسروں سے بھی کہیں گے کہ ایسی بات نہ کریں۔ اس طرح چین خود کو منفیت کے ریڈار سے دور رکھنا چاہتا ہے۔ اس کے علاوہ چینی فراست جنگیں شروع کرنے اور انہیں جیتنے کے گرد نہیں گھومتی بلکہ ان سے گریز کو اپنا مرکز و محور بناتی ہے۔ غالباً وہ اپنی توانائیاں بیکار گندے کھیلوں پر ضائع نہیں کرنا چاہتے اور ایسے تعاون کے خواہاں رہتے ہیں جس میں تمام سٹیک ہولڈر اتفاق رائے سے قائم کئے گئے انتظامات سے فائدہ اٹھا سکیں۔ مثال کے طور پر 30 سال پہلے ہانگ کانگ سے آگے جنوب میں شینز ین نام کا ایک چھوٹا سا گاؤں تھا جہاں زیادہ تر ماہی گیری ہوتی تھی۔ آج یہ جدت طرازی کا مرکز ایک وسیع و عریض شہر بن چکا ہے۔ شینز ین نے خصوصی اقتصادی زونز (SEZs) کی افادیت کو ثابت کیا ہے۔ اس کے بعد بہت سے اور بھی ایسے شہر بن رہے ہیں۔ چین گوادر کے ذریعے پاکستان کے لیے بھی یہی طریقہ تجویز کر رہا ہے، یعنی معاشی ترقی کے لیے خصوصی اقتصادی زونز قائم کئے جائیں، یہ ترقی سیاسی استحکام کا باعث بنے گی۔

صدر ڈونلڈ ٹرمپ کی ٹیرف وار کے بعد بھارت اور چین کی باہمی لڑائی سے پہلے ہندوستان میں چینی سفیر لوو چاؤ ہوئی مسلسل ایک ایسا اہم ترین باہمی ریلیشن شپ قائم کرنے کی

کوشش کرتے رہے جو دونوں ممالک کو ایک باہمی طور پر مفید اور قابل پیمائش راستے پر رکھے۔ اپنی کئی تقاریر اور عوامی اجلاسوں میں، جن کے بارے میں وہ ٹویٹ بھی کرتے رہے، چاؤ ہوئی نے بھارت میں چینی سفیر ہونے کے ناتے اپنے مشن کی وضاحت ان چار نکات میں کی:

1: آزاد تجارت کے معاہدے (FTA) پر گفت وشنید کرنا اور تجارتی خسارے کے مسئلے کا حل تلاش کرنا۔

2: سرحدی مسائل حل کرنے کے لیے کاوش کرنا۔

3: رابطے اور باہمی تعاون کو بڑھانا۔

4: دوستی اور تعاون کے معاہدے پر دستخط کرنا۔

بدقسمتی سے بدصورت جغرافیائی سیاست چاؤ ہوئی کے راستے کی دیوار بن گئی اور بھارت کے ساتھ تعلقات مختلف وجوہات کی بنا پر خراب ہوتے چلے گئے جن میں لداخ کا تنازع بھی شامل ہے۔

اسلام آباد میں سفیر سن وئی ڈونگ (جون 2013ء تا اکتوبر 2017ء)، ان کے جانشین سفیر یاؤ جِنگ (14 دسمبر 2017ء تا ستمبر 2020ء) اور غیر معمولی طور پر فعال ڈپٹی چیف آف مشن لی جیان چاؤ (2015ء تا اگست 2019ء)، جواب وزارت خارجہ کے محکمہ اطلاعات کے ڈپٹی ڈائریکٹر ہیں، نے پاکستان کا دفاع کیا، اور آئرن برادر ہڈ کے اصولوں کے ساتھ اپنی وابستگی سے کبھی ڈگمگائے نہیں۔ چین پاکستان اقتصادی راہداری (CPEC) سمیت پاک چین تعلقات کے حوالے سے خود مصروف رہنے کے ساتھ ساتھ ان سفارت کاروں نے سی پیک کے دفاع اور پاکستان کی حمایت کا کوئی موقع ضائع نہیں جانے دیا جبکہ وہ مغربی ذرائع سے آنے والی مذموم معلومات کا راستہ روکنے کے لیے بھی ہر دم تیار رہے۔

لی جیان چاؤ، جنہوں نے صدر شی جن پنگ کے دورہ اسلام آباد کے کچھ ہی عرصے بعد چارج سنبھالا تھا، سوشل میڈیا کے ذریعے پبلک ڈپلومیسی کو ایک نئی سطح پر لے گئے تھے۔ وہ دوطرفہ تعلقات کے دفاع میں خاصی تیزی دکھاتے تھے حتیٰ کہ باہر سے پاکستان کے بارے میں ہونے والی اشتعال انگیزی کو روکنے کے لیے بھی۔ انہوں نے سابق سفیر حسین حقانی کے ساتھ ٹویٹر پر ایک جنگ

بھی لڑی جنہوں نے چاؤ کے چینی مسلمان ہونے کی صداقت پر سوال اٹھایا تھا۔ سوشل میڈیا پر اپنی موجودگی کے ساتھ ساتھ لی جیان چاؤ نے اپنے سفارت کار ساتھیوں کے لیے نئی مثالیں بھی قائم کیں۔ انہوں نے مبینہ طور پر بہت سی چینی کمپنیوں کو اس حوالے سے متاثر کیا کہ وہ پاکستان میں اپنی کارکردگی کو اجاگر کرنے کے لیے میڈیا پلیٹ فارمز کو استعمال کریں۔

مزید برآں چینی دانش عالمی برادری پر یقین کے اس عقیدے میں لنگر انداز ہے جس کی منزل بنی نوع انسان کا مشترکہ مستقبل ہو جیسے بڑا خاندان، جس میں خاندان کے ارکان کسی اتفاق رائے تک پہنچ جاتے ہیں، اور مشترکہ مفادات کی مکمل عقلی تفہیم رکھتے ہیں۔ وہ ایک دوسرے پر بھروسہ کرتے ہیں اور ایک دوسرے کے منتظر رہتے ہیں۔ اب تک ان طریقوں پر عمل نے کامیابی کے ذریعے قابل ذکر نتائج پیش کیے ہیں۔

اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ چینی انفرادی طور پر سودے بازی اور مول تول نہیں کریں گے یا اپنے لیے بہترین حاصل کرنے کی کوشش نہیں کریں گے اور جو ملے گا اسی پر اکتفا کر لیں گے۔ اگر آپ ان کو اجازت دیں تو وہ بہتر سے بہتر حاصل کریں گے۔ وہ اعلیٰ درجے کے تاجر اور ہوشیار کاروباری ہیں۔ ہمیشہ اپنے لیے بہترین ڈیل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ پورے چین میں مجھے کئی مارکیٹوں میں اس کا ذاتی طور پر تجربہ بھی ہو چکا ہے۔

کووڈ کی عالمی وبا پر چین کا ردعمل

فروری 2020ء میں یہ سمجھا جاتا تھا کہ کووڈ 19 محض چین کا مسئلہ ہے۔ باقی دنیا بے یقینی کے ساتھ یہ سب کچھ دیکھتی اور خاموش تماشائی بنی رہی۔ اس سلسلے میں عالمی برادری کی کوئی تیاری بھی نہ تھی۔ سابق امریکی صدر ڈونلڈ ٹرمپ تو کووڈ 19 کے لیے چینی وائرس یا ووہان وائرس کی اصطلاح استعمال کرتے رہے۔ پھر بھی پھیلتی ہوئی وبائی بیماری کے درمیان چینی مشینری اسے محدود کرنے کی کوششوں میں مصروف رہی۔ اس مشن کا مرکزی نکتہ یہ منتر تھا ''اس بحران میں سب ایک ہیں اور اس بحران پر قابو پانے کے لیے سب کو مل کر کام کرنے کی ضرورت ہے۔''

ابتدائی طور پر یہ محسوس ہوا کہ معلومات کا بہاؤ روکا جا رہا ہے تاکہ چین سے باہر ابھرنے

والے تاثرات کو مینیج کیا جا سکے۔ چین کا اصرار ہے کہ اس نے جنوری 2020ء میں ڈبلیو ایچ او کو آگاہ کر دیا تھا کہ آنے والی وبائی بیماری کی نوعیت اور دائرہ کار کیا ہو سکتا ہے۔ یہ واقعی ایک آفت تھی جس نے سرکاری حکام اور عوام کے باہمی اعتماد کو آزمایا۔ چینی حکومت کی جانب سے ووہان کے لاک ڈاؤن کے حوالے سے جاری کی گئی ہدایات پر ایس او پیز کے طور پر عمل کیا گیا جیسے ماسک پہننا اور بعد میں ٹریکنگ اور ٹریسنگ کے لیے ڈیجیٹل ٹولز کا استعمال۔ چین میں ان اقدامات کے خلاف کوئی مزاحمت نہیں کی گئی۔ عالمی قبولیت اور حکومتی مینڈیٹس کے ذریعے ہدایات پر عمل درآمد کی یقین دہانی کرائی گئی تھی۔ چینی عوام کا ردعمل ایک اکائی جیسا تھا۔ آبادی کی وسیع اکثریت پر عیاں تھا کہ ایس او پیز کی پیروی کرنا ان کے لیے بہتر ہے، لہٰذا ایس او پیز پر عمل درآمد کے لیے کوئی قابل ذکر قانون نافذ کرنے کی ضرورت نہیں پڑی لیکن کچھ لوگوں کے لیے ان پر عمل کرنا تکلیف دہ بھی تھا۔ زیادہ تر چینیوں نے اجتماعی مقصد کے لیے اس تکلیف کو برداشت کیا۔ اس کا اظہار اس حقیقت سے بھی ہوتا ہے کہ 2022ء کے اوائل میں بھی چینیوں کی غالب اکثریت نے ایس او پیز پر عمل کرنا جاری رکھا ہوا تھا کیونکہ لوگ بدیہی طور پر تسلیم کرتے تھے کہ عالمی وبا کو شکست دینے کے لیے یہ بے حد ضروری ہے۔ دنیا میں بہت سے لوگ چین کو ایک آمرانہ ریاست قرار دیتے ہیں، کیونکہ ان لوگوں کی عینک کو عوام الناس کے اس طبقے نے دھندلا دیا ہے جو مشترکہ وژن اور تقدیر کے تصور کو سمجھ نہیں پاتا۔ ہم میں سے ان لوگوں کے لیے، جو چین کو جانتے اور سمجھتے ہیں، یہ کہہ دینا ہی کافی ہے کہ عالمی وبا کے خلاف چین کی کامیابی حکمرانوں اور عوام کے مابین موجود اعتماد کے بندھن کو اجاگر کرتی ہے۔

وبائی مرض، جس نے سب سے پہلے چین کو اپنی لپیٹ میں لیا اور پھر پوری دنیا کو، پر قابو پانے کے بعد چین نے ووہان میں وبا کے حوالے سے فوری ردعمل ظاہر کرنے والے مراکز قائم کیے اور باقی جگہوں پر وبا کے سلسلے میں سہولیات میں اضافہ کیا۔ چین کی جانب سے شائع کردہ ایک وائٹ پیپر کے مطابق وبا پر ردعمل اور پیش رفت کو پانچ مراحل میں تقسیم کیا گیا تھا۔

پہلا مرحلہ: صحت عامہ کے حوالے سے ایمرجنسی پر تیز ردعمل (27 دسمبر 2019ء تا 19 جنوری 2020ء)

دوسرا مرحلہ: وائرس پر قابو پانے میں ابتدائی پیش رفت (20 جنوری تا 20 فروری

2020ء)

تیسرا مرحلہ: چین کی سرزمین پر نئے تصدیق شدہ داخلی کیسز کی تعداد کم کر کے سنگل ڈیجٹ پر لائی گئی۔(21 فروری تا 17 مارچ 2020ء)

چوتھا مرحلہ: ووہان اور ہوبی- ایک تشویشناک جنگ میں ابتدائی فتح (18 مارچ تا 28 اپریل 2020ء)

پانچواں مرحلہ: جاری روک تھام اور کنٹرول (29 اپریل 2020ء سے آگے)

مارچ 2020ء میں جب چین داخلی سطح پر وبا کو کچھ نہ کچھ کنٹرول کرنے کے قابل ہوا تو اس نے پوری دنیا میں دوسرے ممالک کی مدد کرنا شروع کر دی تھی تا کہ کورونا وائرس کے پھیلاؤ کو روکا جا سکے۔ اس سلسلے میں چین نے کمبوڈیا، پاکستان، اٹلی، فرانس، فلپائن، سپین، ایران اور عراق سمیت متعدد دیگر ممالک کو ماسک، طبی سامان اور ادویات عطیہ کیں۔

اسی سال اپریل میں یہ اطلاع ملی کہ چینی ارب پتی جیک ما نے ایتھوپیا کے ذریعے، مختلف افریقی ممالک کو 500 وینٹی لیٹر اور 200000 ذاتی حفاظتی آلات بھیجے ہیں۔ یہ جیک ما کی طرف سے دیا گیا دوسرا بڑا عطیہ تھا۔ قبل ازیں انہوں نے مارچ 2020ء میں دس لاکھ سے زیادہ ٹیسٹ کٹس اور 600000 ماسک افریقہ کو عطیہ کیے تھے۔ 28 مارچ کو یہ بھی بتایا گیا کہ جیک ما فاؤنڈیشن نے 20000 ٹیسٹنگ کٹس، 100000 فیس ماسک اور 1000 حفاظتی سوٹ بوٹسوانا کو عطیہ کئے ہیں۔

وبائی مرض پر چین کے شاندار ردعمل کو اندرون اور بیرون ملک دونوں جگہ سراہا گیا۔ ووہان میں زیر تعلیم فجی کے ایک 42 سالہ طالب علم ایرونی دوائیبے کا کہنا ہے کہ کووڈ 19 پر کامیابی سے قابو پانا ''عوام پر توجہ مرکوز رکھنے والے اور اپنے لوگوں کی ضروریات زندگی پورے کرنے والے حکومتی نظام کے ذریعے'' ممکن ہوا۔ اس نے وائرس کے خلاف چین کی لڑائی کے بعض پہلوؤں پر مزید روشنی ڈالی، جس سے دوسرے ممالک بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔ اس کے مطابق کامیاب روک تھام میں اہم کردار ادا کرنے والا عامل چین کا گورننگ سسٹم تھا۔ ایرونی نے بتایا کہ وہاں عوام اور اس جیسے عارضی طور پر چین کے باشندے بننے والے لوگوں کی فلاح و بہبود کی حقیقی خواہش پائی جاتی ہے۔

دوسری جانب پاکستان سے تعلق رکھنے والے مالیکیولر بائیولوجی ایکسپرٹ ناصر جلال کو

یقین ہے کہ وبا پر چینی ردعمل بہت ''پرسکون اور بڑا کیلکولیٹڈ'' تھا۔ ناصر جلال کا استدلال یہ ہے کہ یہ ایک ایسا ردعمل تھا جس کی وہ کسی ایسے ملک یا ایسی انتظامیہ سے توقع کریں گے جو سائنسی تحقیق پر یقین رکھتی ہو اور وہ اپنے وبائی امراض کے ماہرین اور سائنس دانوں کی بات سنتی ہو۔ یہ وائٹ ہاؤس کے وباؤں پر پوائنٹ پرسن ڈاکٹر انتھونی فاؤ کی کے استدلال کے بالکل برعکس ہے جن کے بقول جب لوگوں کو ماسک پہننے کا کہا گیا تو انہیں جان سے مار دینے کی دھمکیاں موصول ہوئیں۔

وبائی مرض کے آغاز سے ہی چینی حکومت نے اس پر قابو پانے کے لیے عالمی سطح پر تعاون کی اپنی کوششوں کو تیز کر دیا تھا تاکہ وائرس کے پھیلاؤ کو روکا جا سکے۔ اسی حکمت عملی کے تحت صدر شی جن پنگ نے دنیا بھر سے 50 سے زیادہ رہنماؤں کے ساتھ ٹیلی فون پر اپنی بات چیت میں اس امر کی وضاحت کی تھی کہ چین نے اس بیماری پر قابو پانے کے لیے کیا حکمت عملی اختیار کی اور وائرس کے پھیلاؤ کا مقابلہ کرتے ہوئے کیا کیا کامیابیاں حاصل کیں۔ انہوں نے زور دے کر بتایا کہ چین نے وائرس پر قابو پانے، متاثرہ مریضوں کے علاج کے حوالے سے کیے گئے اقدامات کے بارے میں معلومات جاری کرنے اور عالمی برادری کے ساتھ اپنی معلومات شیئر کرنے میں ذمہ دارانہ اور شفاف طرزِ عمل اپنایا۔ دوسرے ممالک اس وبا کی وجہ سے جن مشکلات کا سامنا کر رہے تھے صدر شی جن پنگ نے اس پر ہمدردی کا اظہار بھی کیا اور کہا کہ چین ان کی مدد کرنے کی ہر ممکن کوشش کرے گا۔ مزید برآں، کووڈ19 پر جی20 کے رہنماؤں کے غیر معمولی سربراہی اجلاس میں چین کے تجربے کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے صدر شی جن پنگ نے تعاون کے اقدامات کے ایک سلسلے کے حوالے سے چار اہم تجاویز پیش کیں:

1: کووڈ19 کے خلاف ایک بھرپور عالمی جنگ کا آغاز کیا جائے۔

2: وبا کے کنٹرول اور علاج کے لیے بین الاقوامی سطح پر اجتماعی ردعمل ظاہر کیا جائے۔

3: اس سلسلے میں بین الاقوامی تنظیموں کو اپنا کردار ادا کرنے میں مدد دی جائے۔

4: بین الاقوامی میکرو اکنامک پالیسیوں میں ہم آہنگی کو بڑھایا جائے۔

یہاں تک کہ کورونا وائرس کی وبا سے متعلق ابتدائی مسائل کے باوجود چین نے صورت حال پر قابو پانے کے لیے تیزی سے کام کیا اور اپنی معیشت کو بحال کیا۔ اگست 2020ء میں یہ اطلاع

دی گئی کہ چین کی برآمدات میں 9.5 فیصد اضافہ ہوا ہے۔ اس سے چین کے مینوفیکچرنگ سیکٹر اور سپلائی چین پر عالمی برادری کے اعتماد کا پتا چلتا ہے۔ مزید یہ کہ اس ترقی کا مطلب یہ بھی ہے کہ ان ممالک بالخصوص پاکستان، جو بیلٹ اینڈ روڈ انیشی ایٹو (بی آر آئی) میں سرگرمی سے حصہ لے رہے ہیں، نے اس منصوبے کے حوالے سے ہونے والی پائیدار ترقی سے بھی فائدہ اٹھایا ہوگا۔

چین کا قومی جذبہ

ورلڈ بینک کی رپورٹ کے مطابق چین میں گزشتہ 43 سالوں میں 800 ملین لوگوں کو غربت سے نکالا گیا ہے۔ یہ آبادی دنیا کے 77 ممالک کی مشترکہ آبادی کے برابر اور دنیا کی کل آبادی کا تقریباً 10 واں حصہ بنتی ہے۔ اکانومسٹ کے ڈیوڈ رینی بی بی سی کی ایک سٹوری میں بتاتے ہیں کہ ''اس میں کوئی شک نہیں کہ پچھلے 40 سالوں میں جو کچھ ہوا وہ غیر معمولی ہے۔ چینی لوگوں نے انتھک محنت کر کے خود کو غربت سے نکالا ہے۔''

چین کی تیز رفتار ترقی دیکھ کر کئی سوال ذہن میں ابھرتے ہیں، جیسے چین موجودہ قابلِ رشک حالات تک کیسے پہنچا؟ کس طرح اس نے اپنی بقا کی جنگ لڑی، کیسے ترقی کی اور کیسے خوش حالی کی یہ منزل پائی؟ آیا یہ چیئرمین ماؤ کی کمیونسٹ پارٹی ہے جس نے کسی طاقت ور گوند کی طرح کام کرتے ہوئے اس وسیع و عریض ملک کو مضبوطی سے جوڑے رکھا یا یہ اس 5000 سال پرانی تہذیب کی دانش مندی، اور اس کے تاریخی اور گہرے سماجی اعتقادات کے نظام ہیں جنہوں نے اسے دوسروں سے ممتاز رکھا؟ یا یہ حیرت انگیز ترقی مندرجہ بالا تمام عوامل کا مشترکہ نتیجہ ہے؟ اس کا جواب ہے 'ہاں'۔ یقیناً یہ ایک جذبہ ہی ہے جس نے ہزاروں برسوں کا سفر طے کیا اور اس منزل تک پہنچا جہاں یہ آج ہے۔ اس سفر میں اس نے قدرتی آفات کا دلیرانہ مقابلہ کیا، معاشرتی بدحالیوں پر قابو پایا، جغرافیائی و سیاسی طوفانوں سے نبرد آزما ہوا اور کامران ٹھہرا۔ یہ غیر متزلزل خود اعتمادی، یقین محکم اور آگے بڑھنے کا عزم ہے جس نے کمیونسٹ پارٹی آف چائنا کی سرپرستی میں ملک کو یکجا رکھا۔ یہی کمیونسٹ پارٹی آف چائنا چینی عزم اور جذبے کی مشعل بردار ہے۔

بہت سے چینی قوم پرستوں اور چیئرمین ماؤ کے پُرجوش مداحوں کے نزدیک ''قومی جذبہ''

کسی ملک کی روح اور قومیت کی بنیاد ہوتا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ قومی جذبہ اجاگر کرنے کے لیے دیانت، ملک سے وفاداری، خود اعتمادی، ایثار اور سب سے بڑھ کر اخلاقی استحکام کی ضرورت ہوتی ہے۔ ماؤ کے لانگ مارچ سے لے کر آج تک کے عہد کی کہانیاں ادب اور میڈیا کی تمام صورتوں میں وافر مل جاتی ہیں۔ ان میں وہ کہانیاں بھی شامل ہیں جن کی سرکاری سطح پر تشہیر کی گئی تا کہ چین کی حیرت انگیز ترقی کے لیے کی جانے والی محنت اور ارتکاز کو واضح کیا جا سکے۔

بیجنگ اولمپکس

'چینی جذبے' کا اعتراف اپنوں کے ساتھ ساتھ غیروں نے بھی کیا۔ تھامس فرائیڈ مین معروف امریکی مصنف اور تجزیہ کار ہیں۔ بیجنگ اولمپکس میں شرکت کے بعد انہوں نے جن خیالات کا اظہار کیا وہ 'چینی جذبے' کے لیے بہترین خراج تحسین ہے۔ اولمپک مقابلوں کے دنوں میں انہوں نے جو کچھ مشاہدہ کیا، اس سے متاثر ہو کر اور مقابلوں کی حیرت انگیز اختتامی تقریب دیکھنے کے بعد وہ اس شاندار تقریب کی تعریف کیے بنا نہ رہ سکے۔

بیجنگ اولمپکس کی شاندار اختتامی تقریب میں شرکت اور سینکڑوں چینی ڈھولچیوں کے ڈھولوں سے پیدا ہونے والے ارتعاش کو اپنے سینے کی دھڑکن میں محسوس کرنے کے بعد، میں یہ نتائج اخذ کرنے پر مجبور ہوں کہ ''اس ملک سے جو توانائی ہویدا ہو رہی ہے، اس کا کوئی ثانی نہیں'' اور دوم ''ہم اتنے پکے ہو چکے ہیں کہ اب اپنے بچوں کو مینڈارن (چینی زبان) کی تعلیم دینی شروع کرنی چاہئے۔''

تھامس فرائیڈ مین نے مزید کہا کہ اولمپکس تاریخ کو تبدیل نہیں کرتے' وہ تو محض ایک سرسری سی تصویر ہوتے ہیں' جس میں کوئی ملک اپنی بہترین چیزیں پیش کرتا ہے کہ ساری دنیا بھی دیکھے، لیکن اولمپکس کے ذریعے چین کی جو تصویر ابھر کر سامنے آئی، وہ بے حد طاقت ور تھی، اور یہ ایسی ہے کہ امریکیوں کو اس انتخابی موسم میں جس کا عکاس بننے کی ضرورت ہے۔

چین کو اچانک کہیں تیل کا کوئی ذخیرہ نہیں مل گیا تھا جس کی بنیاد پر اس نے ان کھیلوں کے لیے 43 بلین ڈالر کا عمدہ انفراسٹرکچر تعمیر کر لیا یا بے مثال افتتاحی اور اختتامی تقاریب کا انعقاد کر لیا بلکہ

یہ سات سال کی قومی سرمایہ کاری، منصوبہ بندی، مرتکز ریاستی طاقت، قومی تحریک اور محنت کی انتہا تھی جس کے نتیجے میں یہ شاندار کارنامہ سرانجام دیا گیا، سات برسوں کی محنت۔ چین کو یہ اولمپک کھیل 13 جولائی 2001ء کو تفویض کئے گئے تھے، نائن الیون سے صرف دو ماہ قبل۔

امریکی مصنف نے نہ چاہتے ہوئے بھی چین اور اپنے ملک امریکہ کے مابین موازنہ بھی کیا تاکہ دونوں کے نقطہ ہائے نظر کے فرق کو واضح کیا جا سکے:

''جب میں اپنی نشست پر بیٹھا اختتامی تقریب میں ہزاروں چینی رقاصوں، ڈھولچیوں، گلوکاروں اور کرتب دکھانے والوں کو اپنے فن کا جادو جگاتے دیکھ رہا تھا تو یہ جائزہ لینے پر مجبور ہو گیا کہ چین اور امریکہ نے اپنے آخری سات سال کیسے گزارے ہیں۔ اس عرصے میں چین اولمپکس کی تیاری کرتا رہا جبکہ ہم امریکی لوگ القاعدہ کے لیے تیاری کرتے رہے۔ وہ بہتر سٹیڈیم، سب ویز، ہوائی اڈے، سڑکیں اور پارکس بناتے رہے اور ہم امریکی لوگ دھات کے بہتر ڈیٹیکٹر، بکتر بند تیز رفتار کثیر المقاصد گاڑیاں اور پائلٹ کے بغیر چلنے والے ڈرون تیار کرتے رہے؟''

دو مختلف نقطۂ ہائے نظر کے اس موازنے نے ایک سادہ حقیقت آشکار کی ہے۔ یہ کہ چینی قیادت نے خصوصی طور پر معاشی ترقی کے لیے مستقل جدوجہد کی ہے جس کا مرکزی نقطہ ہمیشہ عوام رہے۔ شہریوں کی فلاح و بہبود کمیونسٹ پارٹی کی پالیسیوں کا مرکز رہی ہے۔

ہیروازم اور نیشنل ازم

ایک اور پہلو بھی ہے'' چینی جذبے کا داخلی پہلو'' لوک کہانیاں اور کامیاب لوگوں کی حقیقی زندگی کی داستانیں.....سیاست دانوں، فنکاروں، فوجی افسروں، ماہرینِ تعلیم اور سائنس دانوں کے عزم اور جذبوں کی داستانیں.....جو ادب اور پرفارمنگ آرٹس کی مختلف شکلوں میں سرایت کر چکی ہیں۔ چینی ادب مشہور شخصیات، قومی ہیروز، کمیونسٹ پارٹی کے کارکنوں کی زندگیوں کی کیس سٹڈیز کے ساتھ قومی جذبے اور قومی روح کو اجاگر کرتا ہے۔ اپنی قربانی پیش کرنا چینی کہانی کا مرکزی اصول ہے۔ ایسی ہی داستان تونگ کُنروئی (Dong Cunrui) کی ہے۔ وہ 19 سال کا ایک سپاہی تھا، جس نے اپنے دھماکہ خیز آلے کو دشمن کے بنکر کے نیچے تھامے رکھا تھا، اور آخر کار اس نے اپنے ساتھی

فوجیوں اور اس مہم کو بچانے کے لیے خود کو بھی اڑا لیا تھا۔ ان گنت نظمیں اور گیت نوجوان چینیوں کو اس نوجوان کی بہادری کی یاد دلاتے ہیں جس کا مظاہرہ ڈونگ کنروئی نے جنگِ آزادی کے دوران کیا تھا۔

قومی جذبہ کہاں ہے؟ یہ جذبہ اس جنرل کی آنکھوں میں اُمڈتے آنسوؤں میں ہے جس نے 1998ء میں آنے والے تباہ کن سیلاب سے اپنے عوام کو بچانے کے لیے اپنی فوج کی قیادت کی تھی۔ جنرل کے ماتحت فوجیوں نے دریائے یانگسی میں چھلانگ لگائی اور قطار میں ایک دوسرے کو مضبوطی سے تھامے کھڑے رہے تاکہ سیلاب کے دھارے کی رفتار کو کم کیا جا سکے اور علاقے کے وہ لوگ جو راستے میں ہیں محفوظ طریقے سے پار جا سکیں۔

قومی جذبہ کیا ہے؟ یہ جذبہ بوڑھے سائنس دان کی اپنے کام سے عقیدت اور وابستگی میں پنہاں ہے۔ اس 86 سالہ فوجی پروفیسر گاؤ بولونگ (Gao Bolong) نے چین کی لیزر ریسرچ ٹیم کی بنیاد رکھی تھی۔ پروفیسر اس وقت مارا گیا جب وہ 86 سال کی عمر کے باوجود ابھی پروگرامنگ کوڈز میں مصروف تھا، اور وہ اپنے پیچھے ان یادوں کو چھوڑ گیا چینی اب بھی جن پر فخر کرتے ہیں۔

ایسا جذبہ اس سائنس دان میں نظر آتا تھا جس کا نام لِن جُنڈے (Lin Junde) تھا۔ چین نے جتنے میں ایٹمی تجربات کئے لِن جُنڈے نے ان سب میں حصہ لیا اور جب اس کی وفات ہوئی تو وہ تب بھی اپنے اس کام میں مصروف تھا۔

یہ کسان جیسے حلیے والا شخص چین کی سائنس اکیڈمی سے تعلق رکھنے والے لی شیاؤوین (Li Xiaowen) نامی ایک ماہر تعلیم ہے جس نے چین کی چائنا نیشنل سپیس ایڈمنسٹریشن (CNSA) ریسرچ کی میزبانی کی تھی۔ مرنے سے چند روز قبل ہی اس نے ایک لیکچر دیا تھا۔ یہی چینی عزم اور جذبہ ہے۔

سائنس دان نان ہوائرین نے FAST پروگرام کی میزبانی کی، 14 سال تک پہاڑوں میں رہا اور آخر کار دنیا کی چوٹی کی دوربین بنا ڈالی۔

ماہرِ تعلیم لُو یونگن (Lu Yonggen) نے انتقال سے قبل اپنی تمام بچت 8809446.44rmb نظامِ تعلیم کے لئے عطیہ کر دی تھی۔ (یاد رہے کہ RMB، Ren Min

Bi کا مخفف ہے جس کے معنی ہیں عوام کی دولت۔ اس کا بنیادی یونٹ یوآن ہے)

ان عظیم انسانوں کے علاوہ، بہت سارے عام شہری بھی ہیں جو اپنے اندر قومی روح، عزم اور جذبہ رکھتے ہیں۔ مثال کے طور پر، ایک سیف گارڈ نے اونچی عمارت سے گرتی ہوئی ایک خاتون کو اپنے بازوؤں سے تھامنے کی کوشش کی تھی۔ اس کوشش میں وہ خاتون اس کے اوپر گری اور وہ مر گیا۔ ایک 96 سالہ شخص نے 2 سال کے بچے کو بچانے کے لیے برفیلے پانی والے دریا میں چھلانگ لگا دی تھی۔ روشن لوگوں کے اس طرح کے اور کئی حقائق چینی معاشرے میں عام سننے میں آتے ہیں۔

ملک سے بے لوث محبت، قوانین کا احترام، چینی ثقافت کی پاسداری اور سماجی و ثقافتی اقدار پر فخر، یہی ہے جسے بیشتر چینی قومی عزم اور جذبہ سمجھتے ہیں۔ چینی عوام اپنی قومی علامتوں جیسے عظیم دیوارِ چین، چوپ سٹکس، خوراک، رنگوں کے انتخاب کے بارے میں انتہائی حساس ہیں۔ آپ ان کے ساتھ ان معاملات میں کوئی گڑبڑ نہیں کر سکتے۔

ابھرتی ہوئی اداکاراؤں اور ماڈلز کے بارے میں

چینی قوم اپنی قومی علامتوں اور شناخت کے بارے میں کس قدر حساس ہے اس کی ایک جھلک اس وقت نظر آئی جب عالمی سطح پر مشہور برانڈ ڈولس اینڈ گبانا نے (نومبر 2018ء میں) سپر ماڈل زوئے ای کی تین ویڈیوز جاری کیں جن میں وہ چوپ سٹکس کے ساتھ اطالوی کھانا کھانے کی کوشش کرتی نظر آتی ہے جس میں کینولی اور پیزا بھی شامل تھے۔ پورے چین میں عوام نے ویڈیو جاری کرنے کے اس عمل کو جارحانہ اور نسل پرستانہ عمل کے طور پر دیکھا۔ کئی خوردہ فروشوں نے برانڈ کی مصنوعات اپنی دکانوں سے ہٹا دیں اور ویڈیوز اپ لوڈ کیے جانے پر چین میں عوامی سطح پر احتجاج کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ چینی سوشل میڈیا نیٹ ورک ویبو (Weibo) نے ویڈیوز پوسٹ ہونے کے بعد 24 گھنٹے سے بھی کم عرصے میں ان ویڈیوز کو ہٹا دیا۔ سوشل میڈیا پر تنقید کرنے والوں نے کہا کہ چوپ سٹکس کا استعمال ''غیر مناسب اور ناقابلِ احترام'' نہیں ہے بلکہ یہ ''چین کی صدیوں پرانی ثقافت کو معمولی سمجھنے اور چینی خواتین کو دقیانوسی، بلکہ نسل پرستانہ انداز میں پیش کرنے کے مترادف ہے۔''

بعدازاں زوئے ای نے بتایا کہ اسے بڑی شرم محسوس ہوئی تھی لیکن پھر اُسے اپنے کیریئر کو مکمل تباہی سے بچانے کی کوشش میں معاملات کو سمجھنے کے لیے کہا گیا۔ جنوری 2019ء میں ایک طویل پوسٹ میں، مس زوئے نے لکھا تھا کہ عام طور پر ڈی اینڈ جی جیسے بین الاقوامی برانڈ کے لیے کام کرنا کیریئر کے حوالے سے ایک ولولہ خیز قدم ہوسکتا ہے لیکن اس معاملے نے میرے ماڈلنگ کیریئر کو تقریباً ختم ہی کر دیا تھا۔ جب اس واقعہ پر ردعمل بتدریج کچھ کم ہوا تو زوئے نے لکھا کہ وہ سمجھتی ہے 'یہ چین اور چینی ثقافت کے قومی امیج کو پیش کرنے کا معاملہ ہے' چنانچہ وہ خود کو اس سے بھی زیادہ قصوروار سمجھتی ہے اور شرمندہ ہے۔

اس غم و غصے کی وجہ سے جب چین کی مشہور شخصیات نے اس فیشن چین (Chain) کا بائیکاٹ کرنے کا اعلان کر دیا، اور متعدد ماڈلز نے شو میں واک سے انکار کر دیا تو ڈولس اینڈ گبانا نے اپنا آئندہ شنگھائی فیشن شو منسوخ کر دیا۔ متعدد معروف چینی شخصیات نے اعلان کر دیا کہ وہ اس شو میں شرکت نہیں کریں گی۔ اداکارہ لی بنگبنگ (Li bingbing) نے اپنے 42 ملین مداحوں کو بتایا، ''میں اپنی مادرِ وطن سے محبت کرتی ہوں۔'' لڑکوں کے بینڈ ٹی ایف بوائز کے گلوکار وانگ جن کائے نے اپنے خیالات کا اظہار ان الفاظ میں کیا ''میری مادرِ وطن سب چیزوں سے زیادہ اہم ہے۔'' اداکار ٹالووانگ نے ویبو پر لکھا: احترام کسی بھی چیز سے زیادہ اہم ہے۔

یہ پہلا موقع نہیں تھا جب اس مشہور فیشن ہاؤس کو چین کے خلاف نسل پرستی کے الزامات کا سامنا کرنا پڑا۔ اپریل 2018ء میں، ویبو پر اس کی ایک مہم میں کیٹ واک سے پہلے بیجنگ میں ہی بیجنگ کے غریب لوگوں کی ڈی اینڈ جی ماڈل کے ساتھ تصاویر کھینچی گئی تھیں۔ ڈی اینڈ جی 2016ء میں بھی وسیع پیمانے پر غم و غصے کا باعث بنا تھا جب اس نے جوتے کے ایک برانڈ کا نام slave sandal رکھا تھا، جسے مختلف لوگوں نے قوم پر حملہ تصور کیا تھا۔

وسیع و عریض پیمانے پر ظاہر ہونے والے اس ردعمل نے اس اطالوی فیشن ہاؤس کو اپنے سرکاری انسٹاگرام اکاؤنٹ اور شریک بانی اسٹیفنو گبانا کے اکاؤنٹ پر پوسٹ کیے گئے اپنے جارحانہ پیغامات کے سلسلے پر معافی مانگنے پر مجبور کر دیا۔ #DGLovesChina ہیش ٹیگ کے تحت، متعدد پوسٹس بنائی گئی تھیں، جن میں چینی عوام کو تنقید کا نشانہ بنایا گیا تھا۔ اس برانڈ نے دعویٰ کیا تھا کہ اس

کے مذکورہ دونوں اکاؤنٹ ہیک ہو گئے ہیں۔ فیشن ہاؤس کے ذاتی انسٹاگرام اکاؤنٹ پر یہ معافی نامہ پوسٹ کیا گیا، ''ہمارے پاس چین اور چین کے عوام کے لیے احترام کے سوا کچھ نہیں ہے۔''

گبانا نے انسٹاگرام پر جارحانہ پیغامات کا سکرین شاٹ پوسٹ کیا جس کے بارے میں اس کا دعویٰ تھا کہ یہ ایک ہیکر نے اس کے اکاؤنٹ کو غلط استعمال کرتے ہوئے بھیجا تھا۔ اس پر معذرت کی گئی تھی۔

آن لائن لگژری کنزیومر پبلی کیشن جِنگ ڈیلی نے اس معاملے پر تبصرہ کیا تھا کہ ویڈیوز نے ''لہجے اور ذائقے میں بڑی غلطیاں'' کی ہیں۔

بائیکاٹ کا یہ معاملہ درحقیقت ہزاروں لوگوں کی مداخلت کے ساتھ پورے چین میں ایک وسیع مباحثے میں تبدیل ہو گیا تھا۔ یہ بحث ویبو پر چلتی رہی۔ میلبورن میں آر ایم آئی ٹی یونیورسٹی کے میڈیا اور مواصلات کے شعبے میں کام کرنے والی ڈاکٹر جولی بلبی نے میڈیا کو بتایا کہ چینی صارفین سادہ لوح نہیں ہیں، وہ تصنع اور ٹوکن ازم کو دور سے پہچان جاتے ہیں اور اس پر بھرپور ردعمل ظاہر کرتے ہیں۔

مجھے جو تجربات ہوئے ان میں یہ بات بالکل درست ثابت ہوئی ہے۔ میں نے چینیوں سے جو سوالات کیے وہ قومیت، چینی شناختوں، ثقافتی اقدار کے بارے میں حساسیت کے حوالے سے تھے۔ یہ بات چیت زیادہ تر چینی دکانداروں، حکام، ریستورانوں میں کام کرنے والے بیروں یا ہوٹل کے عملے کے ساتھ میری معمول کی ملاقاتوں میں ہوئی۔ قطع نظر اس کے کہ وہ بیجنگ تھا یا شنگھائی، شینزین تھا یا گوانگ زو، سب نے ایک جیسے جذبات کا اظہار کیا۔ ان سوالات پر حساسیت کی سطح تقریباً ایک جیسی تھی۔ جہاں ثقافتی اقدار یا قومی فخر کا معاملہ ہو، کوئی سمجھوتہ نہیں ہو سکتا۔

چین کی تاریخ پر ایک نظر

چین آج دنیا بھر میں اپنی اقتصادی، تکنیکی اور ایک حد تک فوجی برتری کی وجہ سے جانا جاتا ہے۔ یہ جنگلات اور زرعی زمینوں پر مبنی وسیع و عریض خطوں کی کہانی ہے جنہیں ہائی ٹیک اور مصنوعی ذہانت کے پارکوں کے مراکز میں تبدیل کیا جا رہا ہے اور جنہوں نے چین کو امریکہ کے

برابر لا کھڑا کیا ہے۔ فرانسیسی صدر فرانسواں متراں کے مشیر کے طور پر کام کرنے والے ''یورپی بینک برائے تعمیر نو و ترقی'' کے پہلے سربراہ جیکوئس اٹالی نے نکی ایشیا ریویو میں لکھا ''اس (چین) میں عالمی معیار کی کمپنیاں ہیں، یہ مستقبل کی بہت سی ٹیکنالوجیز بشمول مصنوعی ذہانت میں پوری دنیا کا لیڈر رہے۔ اس کے پاس سٹریٹیجک مواد کے دنیا بھر میں سب سے بڑے ذخائر ہیں۔ اس کے پاس خاصے مالیاتی ذخائر بھی ہیں۔''

قدیم تاریخ

ایک عالمی معیشت کے طور پر چین کا طوفانی ابھار اور زبردست سیاسی قوت نہ تو نئی بات ہے اور نہ ہی یہ حادثاتی ہے۔ اس کے پیچھے قوم پرستی، ریاضت، اعتماد، اور بہترین کی جستجو کی ایک طویل تاریخ ہے۔ یہ ملک خود کو تین ہزار سال سے زیادہ عرصے پر مشتمل تاریخی ریکارڈ کے ساتھ چار قدیم تہذیبوں میں شمار کرتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ چین کے ابتدائی شاہی حکمران شیا (Xia) خاندان سے تھے، جو 2100 قبل مسیح سے 1600 قبل مسیح تک اقتدار میں رہا لیکن اتنی طویل حکمرانی کے باوجود اس کے بارے میں زیادہ ثبوت موجود نہیں ہیں۔

معاصر تاریخ اور چند اہم واقعات

افیون کی جنگیں

عصری چینی سیاست میں قدیم چین کو ایک اہم تاریخی حوالہ سمجھا جاتا ہے۔ 19ویں صدی کے وسط میں دریائے پرل کے کناروں پر برطانوی حملے چنگ بادشاہت کے خاتمے کا باعث بنے۔ اس کے بعد چین میں اقتدار کی راہداریوں میں واضح تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ بعدازاں ایسی صورت حال پیدا ہوئی جس کے نتیجے میں برطانیہ کے خلاف افیون کی جنگیں لڑی گئیں۔ پہلی جنگ (1842ء-1839ء) برطانیہ کے خلاف جبکہ دوسری جنگ (1860ء-1856ء) فرانس اور برطانیہ کے خلاف لڑی گئی۔ دوسری جنگ کو تیر کی جنگ (Arrow War) بھی کہا جاتا ہے۔ ان

جنگوں نے کئی حوالوں سے اس چین کی بنیادیں رکھیں جو بعد ازاں ابھر کر سامنے آیا۔

چینی یہ دونوں جنگیں ہار گئے تھے، اور فاتح بیرونی طاقتیں تجارتی استحقاق اور علاقائی مراعات حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئی تھیں۔ چین غیر ملکی جارحیت اور داخلی انتشار کے اندھیروں میں ڈوب گیا۔ اس کے عوام جنگوں سے تباہ حال تھے۔ انہوں نے اپنا وطن ٹکڑوں میں بٹتے دیکھا تھا۔ وہ غربت اور مایوسی میں زندگی گزار رہے تھے۔ تنازعات اور جنگوں نے چین کو غیر ملکی تجارت کے لیے بھی کھول دیا اور یوں یہ ملک غیر قانونی سرگرمیوں کا مرکز بن گیا۔ اکتوبر 2017ء میں 19ویں نیشنل کانگریس کے موقع پر چین کی کمیونسٹ پارٹی (CPC) کے صدر شی جن پنگ نے افیون کی جنگ کو جدید چینی تاریخ میں ایک نازک موڑ قرار دیا تھا۔

چینی عوام کا خیال ہے کہ ان جنگوں کے نتیجے میں ان کے ملک کی خودمختاری کو ذلت آمیز حد تک نقصان پہنچا۔ غیر ملکی طاقتوں نے کئی ایسے معاہدے کئے جو چینیوں کے مفادات کے خلاف تھے۔

افیون کی جنگیں چار وجوہات کی بنا پر شروع ہوئیں

1: سب سے پہلی بات یہ ہے کہ افیون کی جنگیں کیپٹل ازم کا ناگزیر نتیجہ تھیں جو بیرونی توسیع، نوآبادیات اور سمندر پار منڈیوں کی تلاش میں تھا۔ 19ویں صدی کے پہلے نصف میں صنعتی انقلاب برپا ہونے کے بعد برطانیہ دنیا کی سب سے مضبوط سرمایہ دارانہ طاقت بن گیا تھا اور اس نے چین کا دروازہ کھٹکھٹانے کی مادی طاقت بھی حاصل کر لی تھی۔

2: شدید طبقاتی تضادات کے ساتھ چنگ حکومت پہلے سے زوال کا شکار تھی۔

3: 1837ء سے 1838ء تک دوسرے مالیاتی بحران سے شدید طور پر متاثر ہونے کے بعد برطانیہ میں سرمایہ دار طبقہ مشکلات کا شکار تھا، اتنا زیادہ کہ داخلی مشکلات سے چھٹکارا پانے اور بحران کو کہیں اور منتقل کر دینے کا خواہش مند تھا۔ اس طبقے کی شدید خواہش تھی کہ سمندر پار وسعت اختیار کی جائے۔

4: مقامی اہل کار لن زیکسو نے جون 1839ء میں ہیومن گوانگ تونگ میں افیون کی خاصی بڑی مقدار کو تباہ کر دیا اور جلا ڈالا تھا، (1150000 کلوگرام سے زیادہ) تاکہ برطانوی افیون

کی سمگلنگ کو ختم کیا جا سکے۔ برطانوی حکومت نے اس واقعہ کو چین پر حملہ آور ہونے کے لیے بہانے کے طور استعمال کیا۔ اس حملے کی منصوبہ بندی برطانیہ نے طویل عرصہ پہلے سے کر رکھی تھی۔

افیون کی پہلی جنگ (42-1839ء)

چین میں صدیوں سے افیون کو دوا کے طور پر استعمال کیا جا رہا تھا لیکن جب غیر ملکی تاجر (بنیادی طور پر برطانوی) ہندوستان سے غیر قانونی طور پر افیون چین کو برآمد کرنے لگے تو چین میں یہ ایک وبائی شکل اختیار کر گئی اور وہاں وسیع پیمانے پر افیون کا نشہ کیا جانے لگا جو سنگین سماجی اور معاشی خلل پیدا کرنے کا باعث بنا۔ اس کے علاوہ حکمران چنگ حکومت کی تنہائی پسندانہ پالیسیوں اور کرپشن نے معاشرے کو تباہی کے دہانے پر پہنچا دیا تھا۔ 1839ء میں چینی حکومت نے ٹھوس اقدامات کیے اور افیون کی 20000 پیٹیاں اور 1400 ٹن منشیات کے طور پر استعمال ہونے والی اشیا ضبط کر لیں جنہیں برطانوی تاجروں نے کینٹون (جنوبی چین میں ایک ساحلی صوبہ) میں ایک گودام میں رکھا ہوا تھا۔ اس کے نتیجے میں دونوں حکومتوں کے درمیان کشیدگی پیدا ہو گئی۔

یہ مخاصمت اس وقت شدت اختیار کر گئی جب برطانوی جنگی جہازوں نے ہانگ کانگ میں دریائے پرل (ژو جیانگ) کی کھاڑی میں کی گئی ایک چینی ناکہ بندی کو تباہ کر دیا۔ 1841ء میں برطانوی بحری بیڑے دریائے پرل کے کنارے پر کینٹون کی طرف آگے بڑھے۔ دونوں حکومتوں کے مابین باہمی مذاکرات ناکام ہونے کے بعد برطانوی افواج نے حملہ کر کے شہر پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد انگریزوں نے چین میں کمزور چنگ فورسز پر حملے کیے۔ انہوں نے چین کے مشرقی جیانگ سو صوبے کے دارالحکومت نانجنگ پر قبضہ کر لیا، یوں 1842ء میں جنگ کا خاتمہ ہو گیا۔ فوری طور پر امن مذاکرات ہوئے اور 1843ء میں معاہدہ نانجنگ پر دستخط ہوئے۔

اس شکست کی شرائط چنگ حکومت کے لیے کڑوی گولیاں تھیں کیونکہ یہ معاہدہ برطانوی حکومت اور اس کے اتحادیوں کو غیر معمولی فوائد دیتا تھا اور اس میں برطانیہ کو چین کی بندرگاہوں بشمول شنگھائی، گوانگزو، ننگبو، فوزو اور زیامین میں رسائی فراہم کرنا اور ہانگ کانگ جزیرے کو برطانویوں کے حوالے کرنا بھی شامل تھا۔ یہ طے پایا کہ برطانوی حکومت اور تاجروں کو بھاری معاوضہ بھی ادا کیا

جائے گا۔مزید یہ کہ ایک موسٹ فیورٹ نیشن کی شق بھی شامل تھی، جس میں کہا گیا تھا کہ کسی دوسرے ملک کو جو حقوق دیئے جائیں گے وہ خود بخود برطانیہ کو بھی حاصل ہو جائیں گے۔معاہدہ مغربی ممالک کے باشندوں کو گرجا گھروں کی تعمیر اور ملحقہ بندرگاہوں پر عیسائیت کو پھیلانے کی اجازت بھی دیتا تھا۔مغربی سامراج اور آزاد تجارت نے اس جنگ کے ساتھ چین میں پہلی بڑی فتح حاصل کی تھی۔ مختصر یہ کہ معاہدہ نانجنگ نے چین کو کوئی فائدہ نہیں دیا تھا۔حقیقت یہ ہے کہ 1879ء میں افیون کی چینی درآمدات عروج پر تھیں، یعنی 87000 پیٹیاں، کیونکہ افیون کی غیر ملکی پیداوار بے حد بڑھ گئی تھی تاہم دوسری تجارت میں زیادہ توسیع نہیں ہوئی تھی اور غیر ملکی تاجروں نے چینی حکومت کو اس کا ذمہ دار ٹھہرایا تھا۔ جنگ کے نتیجے میں حکومت کے دو دھڑوں کے درمیان ایک تلخ سیاسی کھینچا تانی شروع ہوگئی۔امن پسند گروہ افیون کی تجارت کی بحث میں صارف دھڑے کے ساتھ ہم آہنگ تھا جبکہ جنگی دھڑا اس بحث میں افیون کے خاتمے کے حامی گروہ کے ساتھ منسلک تھا۔

اس کے علاوہ معاہدہ نانجنگ نے کینٹون سسٹم کو ختم کر دیا جو 17ویں صدی سے قائم تھا۔ 1850ء میں چینی شہنشاہ کے انتقال کے بعد اس کے جانشین نے لِن زیکسو (چنگ خاندان کا سرکاری چینی سکالر) کے حق میں امن دھڑے کو برطرف کر دیا اور چین کی نئی حکومت نے غیر ملکی سفارت کاروں کو دارالحکومت بیجنگ سے باہر رکھنے کے لیے قوانین منظور کر لیے جبکہ جانشین کی طرف سے معاہدوں کی تعمیل بھی مغربی ممالک کی توقعات کے مطابق نہیں ہو رہی تھی۔پہلی جنگِ افیون کے بعد جو کچھ ہوا اسے چینی مؤرخین ملک کی ذلت آمیز صدی قرار دیتے ہیں۔

نوآبادیاتی فوجی مشغولیت کا ایک سلسلہ اور اس کے ساتھ ساتھ 1930ء کی دہائی میں جاپانیوں کا حملہ

پہلی جنگِ افیون میں چنگ حکومت کی شکست کے بعد ایک بغاوت شروع ہوئی جو ''تائپنگ موومنٹ'' کے نام سے جانی جاتی ہے۔چینی لفظ''Taiping'' کا مطلب امن ہے۔اس موومنٹ یا تحریک کے شروع ہونے کی وجہ جنگ کے دوران چنگ حکومت کی جانب سے ہتھیاروں پر کئے گئے بھاری اخراجات تھے۔چینی عوام نے عائد کیے گئے بھاری ٹیکسوں کی ادائیگی سے انکار کر دیا تھا۔ نتیجے کے طور پر عوام کا حکومت پر سے اعتماد ختم ہو گیا۔اگر چہ تائپنگ کی تحریک ناکام ہوگئی اس کے باوجود چینی لوگوں کو اس سے بڑا فائدہ ہوا۔یہ فائدہ جاگیرداری کے خلاف پہلی بغاوت کی صورت میں تھا۔اس بغاوت کی منصوبہ بندی کسانوں نے کی تھی جو پرانے چینی معاشرے کا سب سے نچلا طبقہ تھے۔مزید یہ کہ عوام نے جاگیرداری کو چین کے اندر بڑے پیمانے پر بدنام کر دیا تھا۔

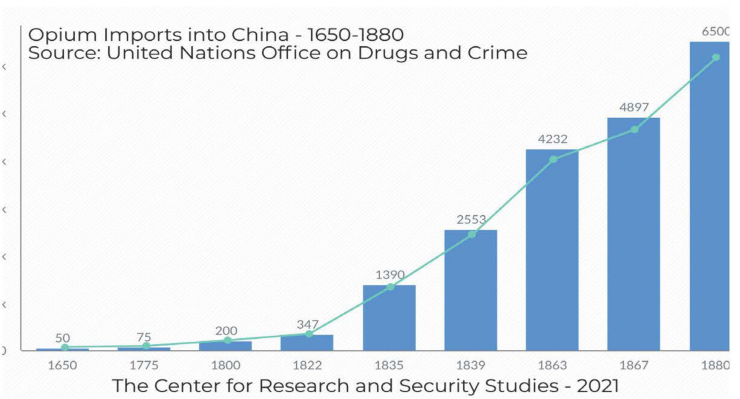

چین میں افیون کی درآمدات کا چارٹ (1650ء تا 1880ء)

دوسری جنگِ افیون (60-1856ء) (تیر کی جنگ)

1856ء میں افیون کی دوسری جنگ جسے اینگلو فرنچ مہم یا تیر کی جنگ بھی کہا جاتا ہے، شروع ہوگئی اور 1860ء تک جاری رہی۔ جنگ کی وجوہات میں معاہدہ نانجنگ سے برطانوی عدم اطمینان بھی شامل تھا۔ برطانیہ مزید مراعات حاصل کرنے کا خواہش مند تھا۔ وہ تجارت کے لیے چین میں مزید بندرگاہیں کھولنا چاہتا تھا اور یہ بھی کہ چین افیون کی تجارت کو قانونی حیثیت دے دے۔ علاوہ ازیں وہ چین پر سب سے پسندیدہ قوم کا اصول بھی مسلط کرنے کا خواہش مند تھا۔

1850ء کی دہائی میں کشیدگی بڑھ رہی تھی، جو 1856ء میں حد سے بڑھ گئی جب چینی حکام نے اس چینی عملے کو گرفتار کرلیا جو انگریزوں کے تحت چلنے والے ایک بحری جہاز پہ کام کرتا تھا۔ انگریزوں نے اسے چین کو فوجی لحاظ سے مزید دباؤ میں لانے کا ایک بہترین موقع جانا تاکہ اسے خود کو برطانوی تجارت اور تاجروں کے لیے مزید کھولنے پر مجبور کیا جاسکے۔ ایک فرانسیسی عیسائی مشنری کی چین میں پھانسی کا بہانہ بنا کر فرانس بھی اس لڑائی میں انگریزوں کے ساتھ شامل ہوگیا۔ اتحادی فرانسیسی اور برطانوی افواج نے شمال کی طرف تیاجن کی طرف بڑھنے سے پہلے گوانگ زو پر قبضہ کر لیا۔ 1858ء میں چینیوں نے کاغذ پر مغربی مطالبات کی ایک سیریز پر اتفاق کیا۔ اس حوالے سے دستاویزات موجود ہیں جیسے ٹائینٹسین (Tientsin) کا معاہدہ لیکن اس کے بعد انہوں نے معاہدوں کی توثیق کرنے سے انکار کردیا، جس کی وجہ سے صورت حال مزید تشویش ناک ہوگئی۔

اگرچہ پہلی جنگِ افیون کے بعد برطانوی تاجروں کے لیے نئی بندرگاہیں کھول دی گئیں لیکن چینیوں نے ان معاہدوں پر عمل درآمد کے سلسلے میں اپنے ہاتھ کھینچ لیے اور یوں چین کے ساتھ قانونی تجارت محدود رہی۔ 1860ء میں برطانوی اور فرانسیسی فوجی بیجنگ کے قریب اترے اور لڑتے ہوئے شہر میں داخل ہوگئے۔ مذاکرات کا عمل فوری طور پر ٹوٹ گیا اور چین میں برطانوی ہائی کمشنر نے فوجیوں کو امپیریل سمر پیلس کو لوٹنے اور تباہ کرنے کا حکم دے دیا۔ یہ ایک کمپلیکس اور ایک باغ تھا جہاں بیٹھ کر چنگ خاندان کے شہنشاہ روایتی طور پر ملک کے سرکاری معاملات چلاتے تھے۔ انگریزوں اور فرانسیسیوں نے بیجنگ پر زبردستی قبضہ کرلیا اور چین پر غیر مساوی معاہدوں، معاوضوں

اور مزید 11 بندرگاہیں کھولنے کے لیے دباؤ ڈالنے لگے۔ اس سارے عمل کا نتیجہ عیسائی مشنری کے کام میں وسعت اور افیون کی تجارت کو قانونی حیثیت ملنے کی صورت میں بھی نکلا۔ اس کے تھوڑے عرصے بعد چینی حکومت نے بات چیت کی جو بیجنگ کنونشن پر منتج ہوئی، جس میں Tientsin کے معاہدے کی توثیق کرنے کے علاوہ، مزید ہرجانہ ادا کرنے کی ہامی بھری گئی اور ہانگ کانگ سے آگے، آبنائے کے پار جزیرہ نما کولون برطانیہ کو سونپ دیا گیا۔ جنگ کا خاتمہ تو ہو گیا لیکن تب تک چنگ شاہی خاندان پہلے سے زیادہ کمزور ہو چکا تھا اور اسے اب بیرونی دنیا کے ساتھ اپنے تعلقات پر نظر ثانی کرنے اور اپنی فوج اور سیاسی و معاشی سٹرکچر کو جدید بنانے کی ضرورت کا سامنا تھا۔

چنگ حکمرانی کے خاتمے کے ساتھ ہی ماؤزے تنگ جیسا بصیرت والا رہنما چین کے سیاسی منظر نامے پر ابھرا۔ ماؤزے تنگ نے نوٹ کیا کہ ''افیون کی جنگیں جارحیت کی جنگیں تھیں جن سے یہ مشکل سبق ملا کہ اگر آپ پسماندہ ہیں اور کمزور ہیں تو مار کھائیں گے۔'' انہوں نے نشاندہی کی کہ ''بہادر سامراج دشمن قوم کو بچانے کا واحد راستہ ہیں۔'' ان اسباق نے سامراج اور جاگیرداری، جو دہائیوں پہلے ابھریں اور کامیاب ہوئیں کے خلاف چینی انقلاب کے لیے عقلیت پسندی کو فروغ دیا۔ افیون کی جنگوں نے چین کو ایک نیم جاگیردارانہ، نیم نوآبادیاتی معاشرے میں تبدیل کر دیا تھا اور ملک کے بند دروازے قوم کی تباہی کا باعث بن سکتے تھے۔ 1920ء تک بھی قوم پرست حکومت منافع کمانے کے لیے افیون پر انحصار کرتی تھی۔ اس صورت حال نے ماؤزے تنگ کو ''لوگوں کی بے حسی اور ہیروز جیسی جدوجہد'' کے عنوان سے ولولہ انگیز مضامین لکھنے پر مجبور کر دیا۔ انہوں نے اس سلسلے کے 15 مضامین لکھے۔ یہ مضامین لکھنے کا مقصد لوگوں کو یہ یاد دلانا تھا کہ انہیں قوم کی شرمساری کو کبھی بھی بھولنا نہیں چاہیے۔

جنگوں کے اختتام پر اور چین میں ماؤ کی قیادت میں نئی لیڈر شپ کے ظہور کے ساتھ یہ احساس اجاگر ہوا کہ ملک باقی دنیا سے مزید الگ تھلگ نہیں رہ سکتا۔ چینی دانشوروں نے محسوس کیا کہ انہیں مغربی ثقافت کو سمجھنے کی کوشش کرنا پڑے گی۔ خاص طور پر اگر وہ مغرب کے ہم قدم آگے بڑھنا چاہتے ہیں تو اس کے لیے مغربی ثقافت کو سمجھنا بے حد ضروری ہے۔ افیون کی جنگوں کے علاوہ 1930ء اور 1940ء کی دہائی کے واقعات کے حوالے دیتے ہوئے چینی قائدین آج بھی ایک زیادہ بین

الاقوامیت پسند چین سے جڑے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ایسا چین جو باہر کی طرف دیکھ رہا ہے اور زیادہ اوپن ہے۔ جنگوں نے چین میں شاہی خاندان پر عوام کے اعتماد کو کم کر دیا تھا، اس لیے کہ حکمران نہ صرف ملک کی حفاظت کرنے میں ناکام رہے تھے بلکہ معاشی بحرانوں پر قابو پانے میں بھی کامیاب نہیں ہو سکے تھے۔ معیشت کو سنبھال نہ سکنے کا سبب بھی واضح تھا یعنی برطانیہ کو چاندی کا بھاری خراج ادا کرنے کے لیے عوام پر زیادہ ٹیکس عائد کرنا۔ لوگ محسوس کرنے لگے تھے کہ ملک کی معیشت چنگ حکمرانوں کے ہاتھوں میں محفوظ نہیں ہے۔ علاقے پر حکمران خاندان کا کنٹرول اور بھی کمزور ہو گیا تھا۔

1911ء کے انقلاب میں چنگ خاندان کے زوال کا مطلب یہ تھا کہ چین کی تاریخ میں پہلی مثال تھی جب ایک شاہی خاندان کی جگہ کسی دوسرے شاہی خاندان نے نہیں لی تھی بلکہ کوشش کی گئی کہ چین کو ایک جمہوری ملک بنایا جائے۔

جمہوریہ چین

چنگ خاندان کے تابوت میں آخری کیل 1911ء کا شہائی انقلاب تھا۔ یہ بغاوت 15 صوبوں تک پھیل گئی تھی اور پھر آزادی کا اعلان کر دیا گیا۔ انقلابیوں نے سن یات سین (Sun Yat-sen) کو جمہوریہ کے عارضی صدر کے طور پر منتخب کیا۔ مذاکرات کے بعد 1912ء میں آخری چنگ شہنشاہ نے اپنا عہدہ چھوڑ دیا۔ سن یات سین نے بعد میں اقتدار یوآن شیکائی (Yuan Shikai) کو سونپ دیا، جو طاقتور بیانگ فوج (Beiyang army) کا سربراہ تھا۔ بیانگ آرمی ایک غالب فوجی قوت تھی جس کی بنیاد چنگ شاہی خاندان نے رکھی تھی۔ یوآن شیکائی بعد ازاں جمہوریہ چین کا صدر بن گیا، لیکن یوآن شیکائی اور انقلابیوں کا یہ اتحاد زیادہ دیرنہ چل سکا۔ متعدد مسائل پر دونوں کے درمیان بداعتمادی برقرار رہی۔ ان میں سے ایک مسئلہ ملک کے دارالحکومت کا تعین بھی تھا۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یوآن شیکائی، بیانگ آرمی کی حمایت سے، سن یات سین کو اس کے آبائی صوبے کوانگ تنگ تک محدود کرتے ہوئے زیادہ طاقتور بن گیا۔ ملک نے اپنے پہلے انتخابات 1913ء میں کرائے تھے جس میں کومنتانگ (Kuomintang) (چینی نیشنلسٹ پارٹی) نے

کامیابی حاصل کی۔ سانگ جیاؤرین (Song Jiaoren)، جو وزارت عظمیٰ کے عہدے کا امیدوار تھا، کو قتل کر دیا گیا، جس کے بعد اس کی پارٹی پر کریک ڈاؤن کیا گیا۔ سن یات سین جاپان فرار ہو گیا اور یوآن شیکائی نے خود کو مزید مضبوط کر لیا۔ اتنا زیادہ طاقتور کہ خود کو شہنشاہ قرار دے دیا اور یہ تصور کیا کہ اس کے اس اقدام کو ملکی اور بین الاقوامی حمایت حاصل ہو گی لیکن اس کی بدقسمتی یہ رہی کہ اسے مخالفت کا سامنا کرنا پڑا، حتیٰ کہ اپنے حامیوں کی جانب سے بھی مخالفت ہوتی رہی اور اسے مجبور کیا جانے لگا کہ وہ اپنے اس ٹائٹل کو ترک کر دے، لیکن ہوا یہ کہ اس کے کچھ ہی عرصے بعد 1916ء میں وہ مر گیا۔ اس کی بیا نگ فوج بکھر گئی اور ملک مزید انتشار کی طرف چلا گیا۔ علاقائی کمانڈروں نے اپنی پرائیویٹ فوجوں کے ساتھ اپنے اپنے علاقوں میں اختیارات سنبھال لیے۔ ملک کے شمال کا بیشتر حصہ خانہ جنگیوں میں الجھ گیا۔ ہر وار لارڈ اقتدار کے حصول کے لیے لڑ رہا تھا۔ چین میں اس سے پہلے بھی انتشار پھوٹتا اور تقسیم پیدا ہوتی رہی تھی اور یہ کام طاقتور شاہی خاندانوں کے دور میں بھی جاری رہا تھا۔ چنگ خاندان اپنے آخری دور میں کچھ بھی ہو گا لیکن طاقتور نہیں رہا تھا۔ اس زوال نے مقامی وار لارڈز کو بااختیار بنا دیا، خاص طور پر تین حریف دھڑے فینگ کوؤ چینگ (Feng Guozhang) کی قیادت میں زیلی گروہ، تو آن چی روئی (Duan Qirui) کا انہوئی گروہ اور ژانگ ژولین (Zhang Zuolin) کی سربراہی میں فینگٹیان گروہ کچھ زیادہ ہی طاقتور ہو گئے۔ اسی دوران وار لارڈز کی فوجوں کی تعداد میں اضافہ ہوا، اور اس کی وجہ مالی مسائل تھے۔ زیادہ تر لوگ معاشی مشکلات کی وجہ سے ان گروہوں میں شامل ہو رہے تھے۔ ایک دہائی کے دوران ان فوجوں کا حجم 1916ء میں 500000 سے بڑھ کر 1928ء میں دو ملین ہو گیا۔ اگرچہ بیجنگ میں ایک قومی حکومت بین الاقوامی سطح پر تسلیم شدہ تھی لیکن جائز یا قانونی نہیں تھی تاہم وہ غیر ملکی تجارت اور ٹیکسوں سے فائدے حاصل کر رہی تھی، اور اس صورت حال نے وار لارڈز کی حوصلہ افزائی کی کہ وہ اس پر یعنی حکومت پر قبضہ کر لیں۔ 1920ء اور 1924ء کے درمیانی عرصہ میں بیجنگ کئی وار لارڈز کے ہاتھوں میں آیا اور ہر کسی نے بیا نگ حکومت کو کنٹرول کرنے کی کوشش کی۔

جنگی سرداروں کے دور میں چین کو انتظامی، سماجی اور اقتصادی طور پر مشکلات کا سامنا رہا، خاص طور پر کسانوں کو خاصے نقصان کا سامنا کرنا پڑا۔ اس دوران سن یات سین نے کومنتانگ کو دوبارہ

منظّم کیا اور سوویت یونین تک رسائی حاصل کر لی جس نے 1923ء کے اوائل میں میخائل بوروڈن کی قیادت میں مشیروں کی ایک ٹیم، پارٹی کی مدد کے لیے گوانگزو (Guangzhou) بھیجی۔ سوویت یونین نے سن یات سین سے چینی کمیونسٹ پارٹی سے ہاتھ ملانے کو کہا اور اس پیشرفت نے پہلے یونائیٹڈ فرنٹ کی بنیاد رکھی۔ چینی اور روسی کمیونسٹوں کی حمایت سے 1924ء میں گوانگزو میں ایک اکیڈمی قائم کی گئی جو ہوانگپو ملٹری اکیڈمی (Huangpu Military Academy) کے نام سے جانی جاتی ہے۔ افسروں کی ٹریننگ کے لیے سوویت ٹرینر بھیجے جاتے تھے اور 1925ء تک وہاں ایک فوج تیار ہوگئی۔ چار صوبوں کی شمولیت سے اس فوج کی طاقت مزید بڑھ گئی یوں چیانگ کائی شیک (جسے جیانگ جیشی بھی کہا جاتا ہے) کی کمان میں قومی انقلابی فوج تشکیل پائی۔

مارچ 1925ء میں سن یات سین کا انتقال ہو گیا۔ اس کا دیرینہ ساتھی چیانگ کائی شیک جانشین بنا۔ اس نے کومنتانگ کی کمان اپنے ہاتھ میں لے لی اور ملک کے مشرقی علاقوں میں مہم کی قیادت کی۔ اس نے چین کے بیشتر حصے کو دوبارہ متحد کیا اور وار لارڈز کے دور کا خاتمہ کر دیا۔ اس نے نانجنگ میں قومی حکومت قائم کی اور اس طرح 'نانجنگ دہائی' کا آغاز ہوا۔ یہ دور 1928ء سے 1937ء تک کے عرصے پر محیط ہے۔ یہ نسبتاً ایک مستحکم حکومت کا دور تھا۔ اس دور میں ایسی پالیسیاں متعارف کرائی گئیں جو معاشی ترقی، صنعت کاری اور سرمایہ کاری کو سپورٹ کرتی تھیں۔ 1928ء میں سنٹرل بینک آف چائنا قائم کیا گیا اور چاندی کے سکوں کے بجائے کاغذی بینک نوٹوں پر مبنی قومی کرنسی جاری کی گئی۔ حکومت نے انفراسٹرکچر میں سرمایہ کاری کی لیکن ان سب کاوشوں کے باوجود اس حکومت کو کچھ چیلنجز بھی درپیش تھے۔

جاپان نے 1931ء میں چین کے شمال مشرق میں منچوریا کے علاقے پر حملہ کر دیا تھا۔ یہ ایک چھوٹا حملہ تھا لیکن 1937ء میں اس نے چین پر مکمل حملے کا آغاز کر دیا تھا۔ قوم پرستوں اور کمیونسٹوں نے اس وقت ابھی اتحاد قائم ہی کیا تھا جو دوسرا متحدہ محاذ کہلاتا ہے۔ اس متحدہ محاذ کی افواج نے مزاحمت کی، لیکن یہ افواج جاپان کی ٹیکنالوجی کے حوالے سے برتری میں کوئی مماثلت نہیں رکھتی تھیں۔ قومی حکومت کو اپنی بیس (Base) مغربی چین میں نانجنگ سے چونگ کنگ منتقل کرنا پڑی۔ جاپانی تمام تر کوششوں کے باوجود پورے ملک کو زیر نہ کر سکے، اور چین اور جاپان کے

مابین جنگ تعطل کا شکار رہی۔ 1940ء تک، جاپانیوں نے شمال مشرقی ساحل اور اس کے اندر کے 400 میل تک کے علاقوں پر قبضہ کر لیا۔ یہاں تک کہ انہوں نے نانجنگ میں چیانگ کائی شیک کے سیاسی حریف وانگ جنگ وئی کے ماتحت ایک کٹھ پتلی حکومت قائم کر دی تھی۔

کوششوں کے باوجود 1941ء تک چین کو غیر ملکی امداد نہیں مل سکی تھی۔ پھر جاپانیوں نے پرل ہاربر پر حملہ کر دیا جس نے امریکہ کو دوسری عالمی جنگ کا حصہ بنا دیا۔ امریکہ نے چین کو اپنا اتحادی بنا لیا۔ 1945ء میں جاپان کی شکست کے بعد چین کا دوسرا متحدہ محاذ ٹوٹ گیا اور چین 1946ء میں شروع ہونے والی خانہ جنگی میں الجھ کر رہ گیا۔ آخر کار کمیونسٹوں (جن کی قیادت ماؤزے تنگ کر رہے تھے) نے 1949ء میں فتح پائی اور عوامی جمہوریہ چین قائم کیا۔ چیانگ اور باقی ماندہ کومنتانگ افواج تائیوان بھاگ گئیں جہاں انہوں نے جلاوطنی میں حکومت قائم کر لی۔ ماؤزے تنگ نے کمیونسٹ پارٹی آف چائنا کے چیئرمین کی حیثیت سے ملک پر 1949ء سے لے کر 1976ء میں اپنی وفات تک حکومت کی۔

چینی انقلاب (1948ء-1935ء)

لانگ مارچ کا انعقاد کمیونسٹ پارٹی آف چائنا کی ریڈ آرمی نے کیا تھا۔ یہ تعاقب کرنے والی چینی نیشنلسٹ پارٹی کی کومنتانگ آرمی سے بچنے کے لیے ایک طرح کی فوجی پسپائی تھی۔ یہ ایک منظّم اور مربوط کوشش نہیں تھی بلکہ یہ کئی مارچز تھے، جن میں سب سے نمایاں وہ تھا جو کیانگسی صوبے سے شروع ہوا اور یانان، شانشی صوبے میں ختم ہوا۔ لانگ مارچ نے ماؤزے تنگ کو چین میں طاقت کی اعلیٰ راہداریوں میں پہنچا دیا لیکن اس کامیابی کے لیے بھاری قیمت چکانا پڑی تھی۔ جتنے لوگوں نے مارچ شروع کیا تھا ان کا صرف بارہواں حصہ ہی مارچ کے ختم ہونے تک زندہ رہا۔

چراغِ راہ: یانان

لانگ مارچ کا اختتام پریفیکچر کی سطح (Prefecture-level) کے شہر یانان میں ہوا، جو چینی کمیونسٹ انقلاب کا نقطۂ آغاز بن گیا۔ اسے جدید چین کی جائے پیدائش بھی کہا جاتا ہے۔

Prefecture-level چینی نظام حکومت میں ایک انتظامی تقسیم ہے، Prefecture-level سے مراد وہ شہر یا علاقہ ہے جو کاؤنٹی سے بڑا لیکن صوبے سے چھوٹا ہو) شانشی گانسو ننگشیا سرحدی علاقے کا صدر دفتر یانان میں ہے۔ (شان گان ننگ، یا پوسٹل رومنائزیشن میں شین کان ننگ، ایک تاریخی ابتدائی نوعیت کی ریاست تھی جسے چینی کمیونسٹ پارٹی نے دوسرے متحدہ محاذ کی پالیسی کے ایک حصے کے طور پر کومنتانگ کے ساتھ معاہدے میں چینی سوویت جمہوریہ کے خاتمے کے بعد تشکیل دیا تھا۔) 1935ء سے 1948ء تک، چینی کمیونسٹ پارٹی کی مرکزی کمیٹی یانان میں ہی قائم رہی۔ یہی مقام نئے تجرباتی جمہوری نظام کا مرکز بن گیا، چینی انقلاب کے لیے چراغِ راہ اور چینی عوام کی آزادی کی جدوجہد کا عقبی ہیڈ کوارٹر۔

یانان کے دور میں چینی کمیونسٹوں (جن کی نمائندگی ماؤزے تنگ نے کی) نے نئے جمہوری انقلاب کے لیے خاکہ تشکیل دیا اور یہ کام مارکسسٹ، لیننسٹ بنیادوں کو چینی انقلاب کے ٹھوس اصولوں کے ساتھ جوڑ کر کیا گیا۔ چینی کمیونسٹوں نے چینی انقلاب کو منظّم طریقے سے کمزور سے طاقتور میں اور ناکامیوں کو فتح میں تبدیل کر دیا۔ انہوں نے دشمنوں کو شکست سے دوچار کرنے کے لیے تین جادوئی ہتھیار ایجاد کیے: متحدہ محاذ، مسلح جدوجہد اور پارٹی کی تعمیر۔ انہوں نے پارٹی اصلاح اور بڑھوتری کے حوالے سے تحریکوں کے لیے لیڈرشپ فراہم کی۔ ایسا کرتے ہوئے انہوں نے عمدہ کام کے تین انداز اپنائے:

نظریے کا پریکٹس کے ساتھ انضمام، لوگوں کے ساتھ قریبی رابطہ اور تنقید و خود احتسابی۔

اس عمل کے دوران انہوں نے بڑی تعداد میں تنظیم کے لیے کلیدی افراد کے گروپ تیار کئے، جو دیانت داری اور قابلیت دونوں میں مضبوط تھے۔ ان گروپوں نے حالات سے نبرد آزما ہونے اور سخت محنت کے یانان والے جذبے کو اپنے مقاصد کے لیے بنیادی مواد کے طور پر فروغ دیا؛ چنانچہ چینی کمیونسٹ پارٹی میں ماؤزے تنگ کی رہنمائی کرنے والی سوچ پروان چڑھی اور یانان میں قائم رہتے ہوئے اس پارٹی نے ایک نئے جمہوری انقلاب کی کامیابی اور نئے چین کے قیام کے لیے مضبوط بنیاد رکھی۔ یوں یانان ایک مینارۂ نور بن گیا۔

جب مزاحمت کی جنگ (جاپانیوں کے خلاف) تعطل کا شکار رہی (خاص طور پر 1941ء

میں) تو شانشی، گانشو، ننگشیا کا سرحدی علاقہ اور دشمن کے عقب میں بیس والے علاقوں میں لوگوں کو شدید مشکلات کا سامنا کرنا پڑا کیونکہ جاپانی فوجیوں کی طرف سے بڑے پیمانے پر علاقے کو دشمنوں سے صاف کرنے کا عمل جاری تھا۔ کومنتانگ کی طرف سے گھیراؤ کیا جا رہا تھا۔ اقتصادی ناکہ بندی کی گئی تھی اور شدید قدرتی آفات بھی بھرپور ستم ڈھا رہی تھیں۔ سنگین مالی اور معاشی مشکلات پر قابو پانے کے لیے پارٹی، حکومت اور تمام حلقوں کے لوگوں نے کمیونسٹ پارٹی آف چائنا کی مرکزی کمیٹی کی کال پر پیداوار اور اقتصادی تعمیر کے لیے ایک عظیم تحریک کے آغاز کے حوالے سے لبیک کہا تھا۔ زرعی پیداوار کے فروغ کو اہمیت دیتے ہوئے صنعتیں لگانے، ٹرانسپورٹیشن، منڈیوں اور تجارتی کاروبار کو ترقی دینے کے ساتھ ساتھ سائنس اور ٹیکنالوجی کو بھی خاصی اہمیت دی گئی۔ ان ساری کوششوں نے مشکل دور سے گزرنے اور مزاحمت کی طویل اور تعطل کا شکار جنگ کو سپورٹ کرنے کے حوالے سے ایک مادی بنیاد فراہم کی تھی۔

کمیونسٹ پارٹی آف چائنا، نارتھ ویسٹ بیورو (NWB)

پورے چین میں تمام ارتقائی بنیادوں کے درمیان ایک منفرد تاریخی کردار کے ساتھ کمیونسٹ پارٹی آف چائنا کے شمال مغربی بیورو (NWB-CPC) کو پارٹی کی مرکزی کمیٹی کی جانب سے براہ راست قیادت ملی اور پارٹی کے ہر طرح کے کاموں میں رہنمائی بھی میسر آئی، جبکہ سی پی سی کے دوسرے بیوروز کو یہ سہولیات میسر نہیں تھیں۔ پھر جو انتظامی تجربہ اور کامیابیاں کمیونسٹ پارٹی آف چائنا کے شمال مغربی بیورو نے سرحدی علاقوں میں حاصل کیں وہ بھی اہمیت کی حامل تھیں کیونکہ اس سے پارٹی کو پورے ملک کے لیے لیڈرشپ تیار کرنے کا موقع ملا۔ نئے چین کی تاریخ کا جائزہ لیتے ہوئے آیئے تاریخ کے ایک نئے نقطہ آغاز سے تیزی کے ساتھ آگے بڑھتے ہیں اور چینی خصوصیات کے ساتھ سوشلزم کے بینر کو بلند تر رکھتے ہوئے احیاء کے چینی خواب کو عملی جامہ پہنانے تک پہنچتے ہیں۔

یونائیٹڈ فرنٹ ورک ڈیپارٹمنٹ یانان میں اپریل 1939ء میں قائم کیا گیا تھا جو مارچ 1947ء تک کام کرتا رہا۔ کمیونسٹ پارٹی آف چائنا کے کچھ سرکردہ رہنما اس ڈیپارٹمنٹ کے وزیر لگائے گئے جیسے وان منگ، پینگ جین، لیوشاؤچی، چواین لائی اور لی وئی ہان۔ اس ڈیپارٹمنٹ نے جاپان

مخالف متحدہ محاذ اور عوامی جمہوری متحدہ محاذ، دونوں کے قیام اور ترقی کے لیے اہم کردار ادا کیا۔ علاوہ ازیں اس نے قومی آزادی، عوام کی آزادی اور عوامی جمہوریہ چین کے قیام میں بھی اہم کردار ادا کیا۔

مزاحمت کی جنگ

شانشی، گانسو، ننگشیا سرحدی علاقے نے تربیتی کیڈر کے لیے اہم بیس کے طور پر کام کیا۔ مزاحمت کی جنگ کے ابتدائی دور میں ہزاروں محبِّ وطن نوجوان اور بیرون ملک مقیم چینی ہزاروں میل کا سفر طے کر کے یانان پہنچے تا کہ جاپانی جارحیت کا مقابلہ کیا جا سکے اور ملک کو بچایا جا سکے۔ اس سفر میں انہیں بے انتہا مشکلات اور خطرات کا سامنا کرنا پڑا۔ یہیں پر سی پی سی سنٹرل کمیٹی اور شانشی، گانسو، ننگشیا سرحدی علاقے نے 20 سے زیادہ سکول شروع کیے اور چلائے، اور سیاسی دیانت کے ساتھ باصلاحیت کیڈرز کو بڑی تعداد میں تربیت دی۔ اس سے جاپان کے خلاف جنگ میں حتمی فتح کے ساتھ ساتھ قومی جنگِ آزادی میں کامیابی حاصل کرنے میں بھی بڑی مدد ملی۔

جاپان کے خلاف مزاحمت کے سخت سالوں میں فوج اور لوگوں نے شانشی، گانسو، ننگشیا کے سرحدی علاقے میں پیداوار بڑھانے کے لیے ایک زبردست تحریک کا آغاز کیا۔ نانیوان میں زمین کی بازیافت کے لیے تعیناتی کے دوران آٹھویں روٹ کی فوج کے بریگیڈ 359 نے نہ صرف وافر مادی دولت بلکہ بیش قدر روحانی دولت بھی پیدا کی۔ مشکل وقت میں ایک مضبوط جذبۂ خود انحصاری، انقلابی ہیروازم (جس نے مشکلات پر قابو پانے کی ہمت پیدا کی) اور انقلابی امید رجائیت پسندی کے ساتھ نانیوان میراث، یانان جذبے کی سب سے نمایاں علامت بن گئی۔

چینی کمیونسٹ پارٹی کی ساتویں قومی کانگریس تاریخ میں 'اتحاد اور فتح کی کانگریس' کے طور پر امر ہو چکی ہے۔ جدید چینی تاریخ اور عوام کی انقلابی جدوجہد میں ہونے والی پیش رفت میں یہ ایک ناگزیر انتخاب تھا کہ ماؤزے تنگ کا خیال پارٹی کے بارے میں سوچتے ہوئے سرکاری رہنما اصول بن جائے اور پارٹی کے آئین میں لکھا جائے۔ یہ کمیونسٹ پارٹی آف چائنا کی ساتویں نیشنل کانگریس کی طرف سے کی گئی ایک تاریخی اعانت تھی، جس کی قابلِ قدر اور دوررس اہمیت تھی۔ اس نے پارٹی کی نظریاتی اور سیاسی پختگی کو بھی ظاہر کیا۔

جب خانہ جنگی جاری تھی تو اس وقت سی پی سی کی مرکزی کمیٹی نے ملک کے اندر اور بین الاقوامی صورت حال کا واضح طور پر اندازہ لگایا اور اپنے دفاع کے ذریعے کومنتانگ کے حملوں کو روکنے کی پالیسی اپنائی۔ کمیٹی نے آزاد کرائے گئے علاقوں میں لوگوں کو اور فوج کو لیڈر شپ فراہم کی اور دشمن کی مؤثر فورسز کو نیست و نابود کر کے کومنتانگ کے بھرپور حملوں کو ناکام بنایا۔ اس طرح انقلاب کو وسیع پیمانے پر فروغ ملا۔

شانشی، گانسو، ننگشیا سرحدی علاقے پر کومنتانگ فوج کے مرتکز حملوں کا زور توڑنے کے لیے کمیونسٹ پارٹی آف چائنا کی مرکزی کمیٹی نے یانان کو خالی کرنے کا قصد کیا۔ اس مقصد کے لیے منصوبے کے تحت مقامی لوگوں اور مانوس علاقے جیسے سازگار حالات پر انحصار کرتے ہوئے شمالی شانشی کے اردگرد متحرک رہتے ہوئے لڑائی جاری رکھنے کا فیصلہ کیا گیا۔ سی پی سی کی مرکزی کمیٹی نے ناردرن فیلڈ آرمی میں مٹی کے ایک غار میں دنیا کی سب سے چھوٹی کمانڈ پوسٹ کے ذریعے لوگوں کو آزادی دلانے کے لیے دنیا کی سب سے بڑی جنگ لڑی۔ اس سرحدی علاقے کے بہادر عوام نے اس جنگ میں بے مثال شراکت کی۔ کومنتانگ کی حکومت والے علاقوں میں گہرے ہوتے ہوئے سیاسی اور اقتصادی بحران مختلف حلقوں سے تعلق رکھنے والے لوگوں کے شدید عدم اطمینان اور ان کی طرف سے مزاحمت کا باعث بنے۔ یوں کومنتانگ کے خلاف دوسرا محاذ تشکیل پایا جس میں طلبہ کی تحریک پیش پیش تھی۔

2014ء میں اس حوالے سے عام لوگوں کے لیے ایک یادگار تعمیر کی گئی تھی تاکہ وہ یانان میں قیام کے دوران جاپانی حملے کے خلاف آزادی کی جنگ میں نارتھ ویسٹ بیورو کی تاریخ، کامیابیوں اور شراکت کے بارے میں جان سکیں۔ 4000 مربع میٹر جگہ اور 1000 میٹر طویل نمائش کی جگہ میں تاریخی آثار، تصاویر، گراف اور چارٹ، ترتیبات، مجسّموں اور پینٹنگز کی شکل میں تفصیلی معلومات ظاہر کی گئی ہیں۔ نارتھ ویسٹ بیورو کی سابقہ سائٹ کے ساتھ مل کر، میموریل یانان انقلابی ثقافت کے ایک ناگزیر حصے کے طور پر کھڑا ہے اور حب الوطنی، انقلابی روایت اور یانان کے جذبے کے لیے قومی تعلیم کی بنیاد کے طور پر کام کرتا ہے۔

کمیونسٹ پارٹی آف چائنا، نارتھ ویسٹ بیورو شمالی شانشی میں (1950ء-1945ء)

کمیونسٹ پارٹی آف چائنا کے نارتھ ویسٹ بیورو کے سرکردہ ارکان کو جاپان مخالف جنگ میں کامیابی کے بعد جزوی طور پر ایڈجسٹ کیا گیا تھا۔ شی ژونگ شُن نے اکتوبر 1945ء میں کمیونسٹ پارٹی آف چائنا نارتھ ویسٹ بیورو کے سیکرٹری کے طور پر خدمات سرانجام دیں۔ جون 1946ء میں وسیع پیمانے پر خانہ جنگی شروع ہوگئی تو کمیونسٹ پارٹی آف چائنا نارتھ ویسٹ بیورو نے ایک حکم جاری کیا کہ ''متحرک ہو جاؤ اور سرحدی علاقے کے دفاع میں جنگ کے لیے تیار ہو جاؤ۔'' اس حکم نے پیداوار اور فوجی تربیت کے حوالے سے تیزی پیدا کر دی۔ ژونگ گا یو آن فوجی کمان میں لی شیانیان (Li Xiannian) اور وانگ زین (Wang Zhen) کے تحت فوجی جنوبی شانشی کے علاقے میں بریگیڈ نمبر 359، جس کی قیادت وانگ زین کر رہے تھے، میں داخل ہوئے اور انہیں سرحدی علاقے میں واپس جانے کی ہدایت کی گئی۔

شانشی، گانسو، ننگشیا سرحدی علاقوں میں کومنتانگ فوج کے شدید حملوں کا سامنا کرنے کے بعد مارچ 1947ء میں کمیونسٹ پارٹی آف چائنا نارتھ ویسٹ بیورو اور بارڈر رجن گورنمنٹ نے یانان کو خالی کر کے اور شمالی شانشی کے گرد گھومتے ہوئے جوابی حملے کا اقدام کیا۔ اکتوبر 1947ء میں سی پی سی کی سنٹرل کمیٹی نے چینی لینڈ قوانین کا خاکہ جاری کیا تاکہ زمین کے بارے میں نیشنل کانفرنس کی قرارداد پر عمل درآمد کا حکم دیا جا سکے۔ کمیونسٹ پارٹی آف چائنا نارتھ ویسٹ بیورو نے نومبر میں Yihezhen کی Suide کاؤنٹی میں ایک میٹنگ کی تاکہ لینڈ ریفارمز اور سرحدی علاقے میں پارٹی کی اصلاح کے حوالے سے کام کے سلسلے میں خاکہ مرتب کیا جا سکے۔

عوام کا جمِ غفیر ایک ایسا ناقابل تسخیر قلعہ تھا جس نے کمیونسٹ پارٹی آف چائنا کی مرکزی کمیٹی اور سرحدی علاقوں کا دفاع کیا۔ لڑائی کے دوران لاکھوں لوگوں نے سرحدی علاقے میں پارٹی کی مرکزی کمیٹی اور چیئرمین ماؤ کے دفاع کے سلسلے میں اہم کردار ادا کیا۔ سرحدی علاقے میں کومنتانگ کے حملوں کا مقابلہ کرنے کے لیے 20000 کی گوریلا فورس کے ساتھ ساتھ ایک بڑی ملیشیا کو منظّم کیا گیا جو وسیع گوریلا جنگ کو انجام دینے میں مصروف، مین یا مرکزی فوج کو مدد فراہم کر

سکے۔ مارچ سے دسمبر 1947ء کے درمیانی عرصے میں مقامی مسلح افواج نے سرحدی علاقے میں 3064 بڑی اور چھوٹی لڑائیاں لڑیں، جن میں دشمن کے 14000 فوجیوں کو ختم کر دیا گیا۔ سرحدی علاقے کے مرد و خواتین، بوڑھوں اور جوانوں نے سٹریچر لانے لے جانے، فوج کے لیے اناج پہنچانے کی ڈیوٹی دے کر اور فوجیوں کے لیے جوتے بنا کر اس محاذ پر سرگرم کردار ادا کیا۔

عظیم تر نارتھ ویسٹ کی طرف پیش قدمی اور ایک نئے چین کا ظہور (1948ء-1950ء)

مئی 1948ء میں نارتھ ویسٹ فیلڈ آرمی نے تو جی، لوچوان کاؤنٹی میں فرنٹ کمیٹی کی دوسری بڑی میٹنگ کا انعقاد کیا۔ Xifu مہم سے سبق حاصل کرتے ہوئے انہوں نے Guanzhong میں آگے بڑھنے اور کومنتانگ کے زیر کنٹرول علاقوں میں جنگ کی قیادت کرنے کے لیے سٹریٹیجک رجحان کا تعین کیا۔ اگست تا نومبر 1948ء نارتھ ویسٹ فیلڈ آرمی نے Heyang-Changcheng نارددرن ڈالی (Northern Dali) اور یونگ فینگ میں یکے بعد دیگرے تین بڑی فتوحات حاصل کیں۔ شیان (Xian) کو 20 مئی 1949ء کو آزاد کرا لیا گیا اور 25 مئی 1949ء کو کمیونسٹ پارٹی آف چائنا نارتھ ویسٹ بیورو کے دفاتر شیان منتقل کر دیئے گئے۔ جون میں نیا کمیونسٹ پارٹی آف چائنا نارتھ ویسٹ بیورو قائم کیا گیا۔ اس کے بعد نارتھ ویسٹ فیلڈ آرمی نے گریٹر نارتھ ویسٹ چائنا کی طرف پیش قدمی کی اور لان جو (Lanzhou)، شی ننگ (Xining)، ینچوان (Yinchuan) اور دیگر شہروں کو آزاد کرایا اور ستمبر میں سنکیانگ (Xinjiang) کی پرامن آزادی کے بعد یکم اکتوبر کو عوامی جمہوریہ چین قائم کیا گیا۔ جنوری 1950ء میں شمال مغربی ملٹری اور انتظامی کمیٹی کا قیام شانشی، گانسو، ننگشیا بارڈر ریجن کی حکومت کی طرف سے اپنے تاریخی مشن کی شاندار تکمیل کا سنگ میل ثابت ہوا۔

پاکستان عوامی جمہوریہ چین کو تسلیم کرنے والا پہلا مسلمان اور تیسرا غیر کمیونسٹ ملک بنا اور اس نے 4 جنوری 1950ء کو ایک اعلیٰ سطحی وفد چین روانہ کیا۔ اس طرح اس آہنی بھائی چارے کی بنیاد رکھی گئی جو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مضبوط ہوتی چلی جا رہی ہے۔ عوامی جمہوریہ چین کو تسلیم کرنے میں امریکہ کو 30 سال لگے۔ یہ کام اس نے یکم جنوری 1979ء کو کیا۔

چین: صدر شی جن پنگ کے دور میں (2013ء سے آگے)

صدر شی جن پنگ کو 14 مارچ 2013ء کو عوامی جمہوریہ چین کا صدر منتخب کیا گیا۔ وہ بیجنگ میں ہونے والی 12 ویں نیشنل پیپلز کانگریس کے توثیقی ووٹ سے صدر منتخب ہوئے تھے۔ شی جن پنگ نے 2952 ووٹ حاصل کئے تھے۔ ایک ووٹ ان کے خلاف پڑا جبکہ تین نے اپنا ووٹ استعمال نہیں کیا تھا۔ انہوں نے ہو جن تاؤ کی جگہ لی تھی، جو دو میعادوں تک اس عہدے پر رہنے کے بعد ریٹائر ہوئے تھے۔ صدر شی جن پنگ کے تحت ہی چین نے بیلٹ اینڈ روڈ انیشی ایٹو (BRI) اور پاک چین اقتصادی راہداری (CPEC) جیسے منصوبے شروع کئے۔

باب سوئم

گورننس کا ''چینی ماڈل''

یہ باب تحریر کرنے کا مقصد چین میں گورننس یعنی طرزِ حکمرانی کی وضاحت کرنا ہے، جسے عام طور پر ''چائنا ماڈل'' کہا جاتا ہے۔ علاوہ ازیں زیرِ نظر سطور میں چین کی طرزِ حکمرانی کے مختلف پہلوؤں، جیسے کمیونسٹ پارٹی آف چائنا اور چین کے بارے میں مغربی دنیا میں پائی جانے والی غلط فہمیوں کا جائزہ بھی لیا جائے گا۔ یہ باب ضبطِ تحریر میں لانے کا مقصد چینی طرزِ حکمرانی کی وکالت کرنا نہیں ہے کیونکہ دنیا بھر میں رائج حکمرانی کا ہر نظام اپنے فوائد اور نقصانات رکھتا ہے۔ زیرِ نظر باب میں فودان (Fudan) یونیورسٹی میں چائنا انسٹی ٹیوٹ کے ڈائریکٹر ''چینی ماہر اور پروفیسر'' جھانگ وئے وئے سے کئے گئے بہت سے مختصر انٹرویوز کے اقتباسات شامل کرنے کے علاوہ چینی ادب کا جائزہ بھی لیا گیا ہے تاکہ اس کتاب کے قاری کو چین میں گورننس کے مختلف پہلوؤں سے آگہی حاصل ہو سکے۔ اس باب میں کمیونسٹ پارٹی آف چائنا اور اس کے طرز حکمرانی کی آسان الفاظ میں وضاحت کرنے کی کوشش بھی کی گئی ہے تاکہ قارئین کو سمجھنے میں آسانی ہو کہ گورننس کا ''چینی ماڈل'' دراصل ہے کیا؟

چین کی کمیونسٹ پارٹی:

چین کا سیاسی نظام عالمی سطح پر اور مغرب کے تعلیمی اداروں اور میڈیا کے حلقوں میں بحث کا معاملہ رہا ہے۔ وہاں اس نظام کی عمومی تصویر کو ''یک جماعتی آمریت'' کے طور پر پروموٹ کیا جاتا ہے، تاہم یہ نظام اتنا سادہ اور اپنی نوعیت کا واحد نظام نہیں ہے جیسی لوگ

اس بارے رائے رکھتے ہیں۔ چینی ریاست کی جانب سے اپنے نظامِ حکومت کی تعریف یوں کی گئی ہے: چین کے سیاسی نظام کو ایک کثیر جماعتی تعاون اور مشاورت کا نظام سمجھا جائے۔ ان کے انضمام کے لحاظ سے ریاست کے دو بڑے بازو ہیں جو ملک پر حکومت کرتے ہیں اور عمودی طور پر مربوط ہیں۔ ان میں ایک کمیونسٹ پارٹی آف چائنا ہے جبکہ دوسرا بازو سٹیٹ گورنمنٹ ہے۔

کمیونسٹ پارٹی آف چائنا کی سربراہی پارٹی پولٹ بیورو اور سٹینڈنگ کمیٹی دونوں کرتی ہیں جبکہ سٹیٹ گورنمنٹ کی سربراہی ملک کا وزیراعظم کرتا ہے، جو ایک ڈی فیکٹو کابینہ، جسے سٹیٹ کونسل بھی کہا جاتا ہے، کی نگرانی کرتا ہے۔

چینی سیاسی نظام پر لکھے گئے ایک وائٹ پیپر میں اس نظام کی وضاحت مندرجہ ذیل الفاظ کی گئی ہے:

''چین نے جو سیاسی نظام اپنایا ہے وہ کمیونسٹ پارٹی آف چائنا کے تحت ایک کثیر جماعتی تعاون اور سیاسی مشاورت پر مبنی نظام ہے جس میں چائنیز پیپلز پولیٹیکل کنسلٹیٹو کانفرنس (CPPCC) ایک اہم ادارہ ہے۔ یہ ادارہ سیاسی مشاورت اور جمہوری نگرانی کا اہتمام کرتا ہے اور اپنی رکن جماعتوں، تنظیموں اور مختلف نسلی گروہوں سے تعلق رکھنے والی شخصیات کو منظّم کرتا ہے تاکہ ریاست کے معاملات چلانے کے لیے تبادلہ خیال اور انتظام کاری کی جا سکے۔ یہ نظام مغربی ممالک کے دو جماعتی یا کثیر جماعتی مسابقتی نظام سے مختلف ہے۔ یہ کچھ دوسرے ممالک میں رائج یک جماعتی نظام سے بھی مختلف ہے۔ چین کے کثیر جماعتی تعاون کے نظام کے تحت کمیونسٹ پارٹی آف چائنا اور آٹھ دیگر سیاسی جماعتیں آتی ہیں۔ ان آٹھ پارٹیوں کے نام اس طرح ہیں: 1- ریوولوشنری کمیٹی آف دی چائنیز کومنتانگ، 2- چائنا ڈیموکریٹک لیگ، 3- چائنا نیشنل ڈیموکریٹک کنسٹرکشن ایسوسی ایشن، 4- چائنا ایسوسی ایشن فار پروموٹنگ ڈیموکریسی، 5- چینی کسان مزدور ڈیموکریٹک پارٹی، 6- چینی ژی گونگ ڈانگ، 7- جیو سان سوسائٹی اور 8- تائیوان ڈیموکریٹک سیلف گورنمنٹ لیگ۔

طویل مدتی بقائے باہمی، باہمی نگرانی ایک دوسرے کے ساتھ خلوص سے پیش آنا اور ایک

دوسرے کے دکھ سکھ بانٹنا جیسے اصولوں پر مبنی چین کی جمہوری پارٹیاں حکمران جماعت اور اپوزیشن پارٹی جیسے معاملات سے مختلف ہیں۔ وہ کمیونسٹ پارٹی کی قیادت کے ماتحت ہیں اور انہوں نے خود کو سوشلسٹ تعمیر کے لیے وقف کر رکھا ہے۔''

چینی نظام میں لوگوں کے تعاون اور شرکت کے حوالے سے وائٹ پیپر بتاتا ہے کہ ''عوام کی کانگریسز کے نظام، کثیر جماعتی تعاون، علاقائی نسلی خودمختاری اور معاشرے کی بنیادی سطح پر سیلف گورننس جیسے عوامل ایک ساتھ مل کر چین کے سیاسی نظام کا مرکزی اور بنیادی فریم ورک تشکیل دیتے ہیں اور سوشلسٹ جمہوریت کو مستحکم بناتے ہیں۔''

چین کے سیاسی نظام کی یہ تعریف بتاتی ہے کہ کمیونسٹ پارٹی آف چائنا کے ریاستی امور کی نگرانی کی انچارج ہونے کے باوجود سیاسی کام کاج کثیر جماعتی یا متعدد سٹیک ہولڈرز کے درمیان رابطوں اور تعاون کے ذریعے ممکن بنایا گیا ہے۔ کمیونسٹ پارٹی آف چائنا ملک کے بیشتر سیاسی اداروں کی نگرانی کرتی ہے لہٰذا ریاست کے لیے کام کرنے والے تمام بازوؤں کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرتی ہے۔ ذیل میں دیا گیا گراف بتاتا ہے کہ یہ نظام کس طرح ایک دوسرے کے آگے پیچھے اور مربوط طور پر کام کرتے ہیں۔ گراف میں یہ بھی واضح کیا گیا ہے کہ 2018ء سے اب تک ان نظاموں میں کیا تبدیلیاں لائی گئی ہیں۔

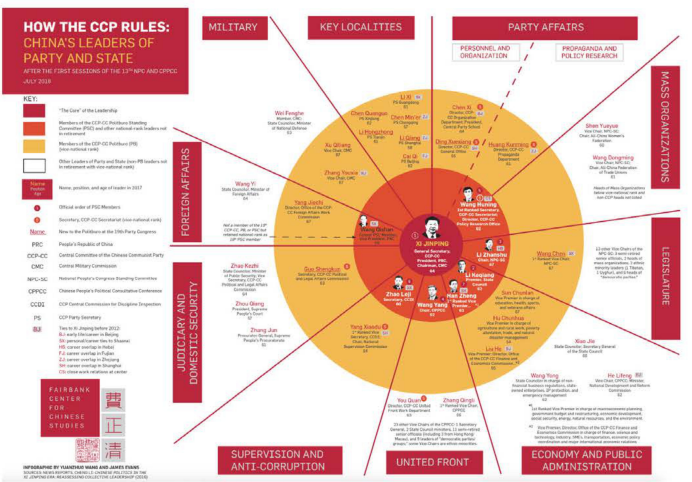

گراف: کمیونسٹ پارٹی آف چائنا کیسے حکومت کرتی ہے: پارٹی اور سٹیٹ کے چینی لیڈر (فیئر بینک سنٹر فار چائنیز سٹڈیز)

چین کی کمیونسٹ پارٹی کی بنیاد یکم جولائی 1921ء کو رکھی گئی تھی اور 28 سال کی طویل جدوجہد کے بعد اس پارٹی نے 1949ء میں عوامی جمہوریہ چین کی بنیاد رکھی تھی۔ عام تاثر کے برعکس کمیونسٹ پارٹی آف چائنا ریاستی قیادت کے نظام کے طور پر کام نہیں کرتی جیسا کہ اس کا طرز عمل عوامی جمہوریہ چین کے آئین کے ذریعے بیان کیا گیا ہے۔ مزید یہ کہ کمیونسٹ پارٹی آف چائنا کو آئین سے تجاوز کرنے کا بھی حق نہیں ہے، جس کے تحت تمام شہری (خواہ ان کا کوئی بھی مقام ہو) قانون کے سامنے برابر ہیں۔ کمیونسٹ پارٹی آف چائنا کی رکنیت کے معیار کی بات کی جائے تو کوئی بھی چینی جس کی عمر 18 سال ہو اور وہ پارٹی کے پروگرام اور آئین کو قبول کرتا ہے، پارٹی تنظیموں میں سے کسی ایک میں شامل ہونے اور فعال طور پر کام کرنے کو تیار ہے، پارٹی کے فیصلوں پر عمل کرتا ہے اور رکنیت کے واجبات باقاعدگی سے ادا کرتا ہے تو وہ رکنیت کے لیے درخواست دے سکتا ہے۔

یہ بات بھی قابل غور ہے کہ 1980ء کی دہائی میں گورننس کی حرکیات میں بڑی تبدیلی آئی تھیں جب ڈینگ ژیاؤ پنگ نے اپنے اتحادیوں کے ساتھ مل کر سیاسی اور اقتصادی اصلاحات متعارف کرائی تھیں جن کا مقصد پارٹی کو حکومتی معاملات سے الگ کرنا تھا۔ 1982ء میں چیئرمین کا عہدہ بھی ختم کر دیا گیا اور جنرل سیکرٹری پارٹی کا اعلیٰ ترین عہدے دار بن گیا تھا۔ پھر 1987ء میں 13 ویں پارٹی کانگریس میں کمیونسٹ پارٹی آف چائنا کو انتظامی فرائض سے الگ کرنے کے لیے مزید اصلاحات متعارف کرائی گئی تھیں۔ اس کے باوجود حکومت کے حتمی فیصلوں پر پارٹی کی فوقیت یا بالادستی قائم رہی۔ اوپر دی گئی تصویر کمیونسٹ پارٹی آف چائنا کی ساختی درجہ بندی کا ایک مختصر جائزہ پیش کرتی ہے اور واضح کرتی ہے کہ پارٹی کس طرح معاشرے کے وسیع تر طبقات کو اپنی ساخت کے ساتھ مربوط کرتی ہے۔

کمیونسٹ پارٹی کی درجہ بندی اور تنظیم

وقت کے ساتھ ساتھ کمیونسٹ پارٹی آف چائنا کی رکنیت میں بتدریج اضافہ ہوا ہے۔ 1997ء میں ممبرشپ 60.417 ملین تھی جو بڑھ کر 2017ء میں 87.79 ملین ہو چکی تھی۔ دو دہائیوں میں اس میں 45 فیصد سے زیادہ اضافہ ہوا۔ 2018ء کے اعداد و شمار کے مطابق رکنیت 90

ملین سے تجاوز کر چکی تھی۔ اگر یہ دیکھا جائے کہ اس پارٹی کا آغاز 1921ء میں محض 50 ارکان سے ہوا تھا تو رکنیت کا اس قدر بڑھ جانا واقعی ایک متاثر کن کارنامہ لگتا ہے جبکہ عوامی جمہوریہ چین کے قیام کے وقت اس کے 4.48 ملین ممبران تھے۔ تازہ ترین اعداد وشمار کے مطابق رکنیت کی تعداد 96,710,000 ہو چکی ہے۔

کمیونسٹ پارٹی آف چائنا کی تاریخ کے اہم واقعات:

20 ویں صدی کے ربع اوّل میں تشکیل پانے کے بعد سے اب تک کمیونسٹ پارٹی آف چائنا نے مختلف اہم واقعات کا مشاہدہ کیا۔ ذیل میں اہم تاریخی واقعات کی ایک مختصر ٹائم لائن پیش کی گئی ہے:

☆ یکم جولائی 1921ء کو شنگھائی میں کمیونسٹ پارٹی آف چائنا کی بنیاد رکھی گئی۔

☆ 1927ء میں قوم پرست رہنما چیانگ کائی شیک نے کمیونسٹوں کے گڑھ پر حملے کئے جس کے نتیجے میں سینکڑوں انقلابی کارکن مارے گئے اور کمیونسٹ پارٹی آف چائنا کی بغاوت ناکام ہوگئی۔

☆ ماؤزے تنگ 1934ء اور 1935ء میں چین میں مشہور لانگ مارچ کے دوران ایک طاقتور رہنما کے طور پر ابھر کر سامنے آئے تھے۔

☆ یکم اکتوبر 1949ء کو ماؤزے تنگ عوامی جمہوریہ چین کا قیام عمل میں لائے، جس کے نتیجے میں چیانگ کائی شیک کو تائیوان کی طرف پسپا ہونا پڑا۔ ماؤ کا بنیادی ایجنڈا اور مقصد چین کو سیاسی طور پر ایک متحد اور معاشی طور پر ایک مضبوط ملک بنانا تھا۔ مزید یہ کہ ان کا مقصد ملک سے عام بیماریوں کو ختم کرنا بھی تھا۔

☆ ملک کو سوشلزم کی طرف منتقل کرنے کے عمل کا آغاز 1953ء سے 1957ء کے دوران صنعتی شعبے کو قومیانے اور فارم لینڈ کو مشترکہ کنٹرول میں لینے سے ہوا۔

☆ اس کے فوراً بعد ماؤ نے مشترکہ کاوشوں سے فارمز اور صنعتوں سے زیادہ پیداوار حاصل کرنے کے ذریعے چین میں ترقی یافتہ سوشلزم کو متعارف کروانے کے لیے گریٹ لیپ فارورڈ

(آگے کی جانب ایک عظیم جست) (1960ء-1958ء) کا آغاز کیا، تاہم یہ منصوبہ بری طرح ناکام ہوگیا اور 1961ء میں چین قحط کا شکار ہوگیا۔ یہ قحط چینی کایا پلٹ کے حوالے سے ایک استثنا ثابت ہوا کیونکہ تین سال تک (1959ء تا 1961ء) قحط کا سامنا کرنے کے بعد چینی عوام کے حالاتِ زندگی 1949ء والی صورت حال سے کہیں زیادہ بہتر ہو چکے تھے۔

☆1966ء تا 1976ء چیئرمین ماؤ نے بدنام زمانہ ثقافتی انقلاب برپا کرنے کی کوشش کی۔ جب پارٹی کے سینئر عہدے داروں سمیت ریاست کے دشمنوں کے خلاف کارروائیاں کی جاتی رہیں۔

☆ستمبر 1976ء میں ماؤزے تنگ کے انتقال کے بعد ان کے جانشین ہوا کاؤفنگ اور دیگر تجربہ کار حکام نے ''گینگ آف فور'' کو گرفتار کیا۔ ہوا کاؤفنگ چند سال لیڈر کے طور پر کام کرتے رہے، پھر ڈینگ ژیاؤ پنگ اقتدار میں واپس آ گئے اور انہوں نے اصلاحات کی اپنی پالیسیاں متعارف کرائیں۔

☆دسمبر 1978ء میں کمیونسٹ پارٹی آف چائنا نے اصلاحی پالیسیوں کے اجرا کے لیے ایک اہم میٹنگ کا انعقاد کیا تاکہ صنعت اور زرعی شعبے کو ہونے والے سابقہ نقصان کا ازالہ کیا جاسکے۔ اس کے فوراً بعد جنوری 1979ء میں چین نے امریکہ کے ساتھ سفارتی تعلقات بھی بحال کر لیے۔

☆1991ء اور 1992ء کے دوران ڈینگ ژیاؤ پنگ نے مارکیٹ اصلاحات کی ایک نئی لہر کا آغاز کیا۔ پھر 1993ء میں جیانگ زیمن چین کے صدر بن گئے۔

☆2002ء اور 2003ء کے دوران جیانگ زیمن صدر اور کمیونسٹ پارٹی آف چائنا کے سربراہ، دونوں حیثیتوں سے ریٹائر ہوگئے اور ہوجن تاؤ کے آگے آنے کے لیے راہ ہموار کر دی۔ ہوجن تاؤ کا تعلق بھی لیڈر شپ کی چوتھی جنریشن سے تھا۔

☆ یکم جولائی 2011ء کو کمیونسٹ پارٹی آف چائنا کا 90واں یومِ تاسیس منایا گیا۔

☆ایک اہم ترین پیشرفت کے طور پر کمیونسٹ پارٹی آف چائنا نے نومبر 2012ء میں 18ویں نیشنل کانگریس کا انعقاد کیا گیا جس میں نائب صدر شی جن پنگ کو ہوجن تاؤ کی جگہ نامزد کیا گیا۔ پھر مارچ 2013ء میں شی جن پنگ چین کے صدر بن گئے۔

☆ اکتوبر 2017ء میں کمیونسٹ پارٹی آف چائنا کی 19 ویں قومی کانگریس کے دوران ''نئے دور کے لیے چینی خصوصیات کے ساتھ سوشل ازم پر شی جن پنگ کی سوچ'' کو پارٹی آئین کا حصہ بنایا گیا۔ اس طرح شی جن پنگ کو ملک کے لیے اپنے وژن کو عملی جامہ پہنانے کے لیے مزید آئینی کور فراہم کیا گیا۔ کمیونسٹ پارٹی آف چائنا کا نظر ثانی شدہ آئین اکتوبر 2017ء میں 19 ویں نیشنل کانگریس میں شائع ہوا جس میں شی جن پنگ کی قیادت میں کمیونسٹ پارٹی آف چائنا کی ڈائریکشن کے واضح اشارے موجود تھے کہ گورننس کو بہتر کیسے بنانا ہے اور کرپشن سے کیسے نمٹنا ہے۔ سیلف گورننس کے لیے جو اصول وضع کیے گئے وہ اس طرح ہیں:

اپنی نگرانی خود کرنے اور سیلف گورننس کے عمل میں سختی سے کام لینا، اس امر کو یقینی بنانا کہ پارٹی کی حکومت خود اختیاری پر مکمل طور پر اور سختی سے عمل کیا جا رہا ہے اور یہ ایک ایسا عمل ہے جس کی کوئی انتہا نہیں۔ نئے حالات میں پارٹی کا امتحان حکمرانی، اصلاحات اور خود کو قابلِ رسا بنانے کے حوالے سے ہے۔ مارکیٹ کی معیشت اور بیرونی ماحول طویل، پیچیدہ اور سنجیدہ نوعیت کے ہیں۔ جذبے کی کمی کے خطرات، نااہلی، عوام سے الگ تھلگ ہونا، بے عملی اور کرپشن وہ مسائل ہیں جن کا پوری پارٹی کو سامنا ہے۔ پارٹی کو یہ دیکھنا ہوگا کہ اس کی خود نگرانی اور خود حکمرانی کی پالیسی کے تمام پہلوؤں میں سخت معیارات اور اقدامات کا خیال رکھا جا رہا ہے۔ پارٹی اس بات کو یقینی بنائے گی کہ سیلف گورننس قواعد اور اصولوں کے مطابق جاری ہے اور یہ کہ مسائل کی علامات اور بنیادی وجوہات، دونوں کو ختم کر دیا گیا ہے۔ پارٹی کو پارٹی ڈسپلن کی تعمیل کو یقینی بنانے کو اولین ترجیح دینی چاہیے اور تنظیم کے بارے میں چوکس رہنے کے سلسلے میں پارٹی ممبران کی مدد کرنی چاہیے۔ پارٹی کو یہ بھی خیال رکھنا چاہیے کہ اس کے ممبران میں ڈسپلن کی اچھی سمجھ بوجھ ہو اور پارٹی کے سامنے ہر رکن برابر ہے۔ پارٹی اس امر کو یقینی بنائے گی کہ پارٹی کی سیلف سپروژن اور سیلف گورننس کے لیے نگرانی کی ذمہ داریاں پوری کی جا رہی ہیں اور اصولوں پر عمل ہو رہا ہے، جبکہ پارٹی کے سرکردہ اداروں کی نگرانی اور اہم عہدوں پر براجمان پارٹی کے ارکان (خاص طور پر وہ لوگ جو کلیدی عہدوں پر ہیں) کی نگرانی کا نظام ٹھوس اور جامع بنا دیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں اندرونی نگرانی کے نظام کو مسلسل بہتر بنایا جا رہا ہے۔ پارٹی طرزِ عمل کو بہتر بنانے کے لیے کوششیں تیز کرے گی، اتحاد قائم کرے گی، بدعنوانی کا مقابلہ کرے گی

اور کرپشن کے حوالے سے زیرو ٹالرنس کی پالیسی پر عمل کرے گی اور ایسا مؤثر میکنزم قائم کرے گی کہ سرکاری افسران کرپشن کے بارے سوچ بھی نہ سکیں بلکہ کرپشن کر ہی نہ سکیں اور ان میں بدعنوانی کرنے کی کوئی خواہش ہی پیدا نہ ہو۔

کمیونسٹ پارٹی آف چائنا کی تشکیل اور ارتقا کا جائزہ لینے کے بعد اب تحریر کا درج ذیل حصہ واضح کرے گا کہ اس پارٹی نے اپنی کارکردگی کے ذریعے اپنے جواز کو کیسے برقرار رکھا اور کیوں چین کے لوگوں نے اس کے نظام پر اعتماد کی اعلیٰ سطح قائم رکھی۔

کمیونسٹ پارٹی آف چائنا اور گورننس کا جواز:

چین کے سیاسی نظام کے بہت سے بین الاقوامی ناقدین اکثر بحث کرتے ہیں کہ ''کمیونسٹ پارٹی آف چائنا چین میں واحد سیاسی ادارہ کیوں ہے؟''

مغربی جمہوری ماڈل سے موازنہ کیا جائے تو ممکن ہے یہ تحفظات کچھ وزن رکھتے ہوں تاہم ناقدین کو یہ سمجھنے کی ضرورت ہے کہ چین عام آبادیات کے ساتھ کوئی عام ملک نہیں ہے۔ چین قدیم ترین مسلسل جاری تہذیبوں میں سے ایک ہونے پر فخر کرتا ہے۔ ایسی قدیم تہذیب جس کی ایک طویل تاریخ ہے اور اس سارے عرصے میں متعدد پرانی چھوٹی ریاستوں کا اختلاط اور انضمام ہوتا رہا ہے۔ جیسا کہ فیوڈن (Fudan) یونیورسٹی میں چائنا انسٹی ٹیوٹ کے ڈائریکٹر، چینی ماہر اور پروفیسر جھانگ وئے وئے (Zhang Weiwei) کا بھی کہنا ہے کہ چین نے 1911ء میں امریکی ماڈل کے ساتھ تجربہ کیا لیکن ری پبلکن انقلاب کے ساتھ یہ ملک تنزلی کا شکار ہو گیا اور ایک ایسا ملک بن گیا جس میں وار لارڈز ایک دوسرے کے خلاف برسر پیکار تھے اور ان جنگوں میں کروڑوں لوگ مارے گئے تھے۔

کمیونسٹ پارٹی آف چائنا اب ''سوشل کنٹریکٹ'' کے نظریے پر کام کرتی ہے۔ اس خوف سے کہ عوام کی خدمت میں ناکامی کی صورت میں اسے چینی آبادی کی طرف سے بغاوت اور مزاحمت کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ لہٰذا کمیونسٹ پارٹی آف چائنا کے کسی بھی رہنما یا عہدے دار کا بنیادی ہدف چین کو ایک اعلیٰ ترین ملک بنانا ہے جو 'چینی خواب' کی تعبیر تلاش کرنے میں کردار ادا کر سکے۔ مزید یہ

کہ کمیونسٹ پارٹی آف چائنا کے کام کرنے کا طریقہ اہلیت کے مطابق اختیارات، حیثیت اور مقام دینے کے نظریے پر مبنی ہے جو چین میں ''سلیکشن پلس الیکشن'' کی کامیابی میں کردار ادا کرتا ہے۔ جناب جھانگ وئے وئے کے مطابق یہ نظام جدید دنیا میں چین کو عروج ملنے کے بڑے اسباب میں سے ایک ہے لہٰذا یہ ضروری ہے کہ چین کے سیاسی ماڈل کا موازنہ مغرب کے ساتھ جمہوریت بمقابلہ مطلق العنانیت کے طور پر نہ کیا جائے بلکہ گڈ گورننس (چین میں) بمقابلہ بیڈ گورننس (دوسری جگہوں پر) کے لحاظ سے کیا جائے۔ چین کی سیاسی فلاسفی اور ان اصولوں (جن کے تحت کمیونسٹ پارٹی آف چائنا ریاست میں حکمرانی چلاتی ہے) کو سمجھنا بھی ضروری ہے۔ جھانگ وئے وئے کے مطابق کمیونسٹ پارٹی آف چائنا کو جواز بخشنے والے تین رہنما اصولوں یہ ہیں:

1: ''مینڈیٹ آف ہیون'' کا کنفیوشسی نظریہ جو ہان خاندان کے زمانے سے رائج ہے۔

2: میرٹوکریسی کا تصور اور اس پر عمل۔ اس کے لیے چین میں xuanxian renneng کی اصطلاح استعمال ہوتی ہے جس کا مطلب ہے: میرٹ پر عمل کرتے ہوئے لوگوں کے دل و دماغ جیتنا۔

3: سیاسی حکمرانی کے چینی فلسفے میں دو مخصوص تصورات minyi اور minxin شامل ہیں۔

اب آیئے ان اصولوں کا ایک ایک کر کے جائزہ لیتے ہیں کہ یہ ہیں کیا اور ان کا کیا مطلب ہے۔ پہلے اصول ''مینڈیٹ آف ہیون'' کا مطلب یہ ہے کہ چینی حکمران طبقے کو خدا کے دیے ہوئے حق کے طور پر حکومت کرنے کا حق نہیں ملا، اس لیے انہیں یہ حق برقرار رکھنے کے لیے کارکردگی کا مظاہرہ کرنا پڑتا ہے۔ عوام کی بھلائی کو یقینی بنانے میں کسی ناکامی کی صورت میں لوگوں کے حکمرانوں کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے کا خطرہ ہمیشہ رہتا ہے۔ چین نے گزشتہ چار دہائیوں کے دوران ایسی ہی کارکردگی دکھائی جس سے اس کے عوام خوش اور مطمئن ہوں۔ یہ باقی دنیا کی نسبت بہتر کارکردگی کا مظاہرہ ہے۔ دنیا بھر میں موجود غربت کے 80 فیصد کا اکیلے چین نے خاتمہ کیا ہے۔ کچھ دانشوروں کا ماننا ہے کہ بعض معاملات میں غربت کا خاتمہ سرکاری طور پر جاری کردہ اعداد و شمار سے کہیں زیادہ ہوا ہے۔ پورٹس ماؤتھ یونیورسٹی کے سکالر شوجی یاؤ (Shujie Yao) کا خیال ہے کہ چین میں

20ویں صدی کے ربع آخر میں غربت میں جس قدر تخفیف ہوئی دنیا کی تاریخ میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ جناب جھانگ وئے وئے نے مارچ 2017ء میں 'ہوفنگٹن پوسٹ' میں شائع ہونے والے ایک مضمون میں لکھا تھا کہ گزشتہ تین دہائیوں میں چین نے تیز ترین اقتصادی ترقی پائی اور اپنے عوام کے معیاراتِ زندگی میں تیز ترین بہتری کا مشاہدہ کیا۔ یہی ترقی ہے جس نے چینی عوام کا اپنے حکمرانوں پر بھروسہ اور اعتماد برقرار رکھا ہے۔ آخری بات یہ کہ چین کی گڈ گورننس ہی ہے جس کی وجہ سے چین 2008ء کے عالمی مالیاتی بحران کی نہ صرف تپش سے بچ گیا بلکہ سوویت یونین کی طرح تقسیم ہونے سے بھی محفوظ رہا۔

دوسرا اصول یعنی ''میرٹ پر سختی سے عمل درآمد کرنا'' یہ یقینی بناتا ہے کہ بہترین امیدواروں کا انتخاب کیا جائے اور چین کے سیاسی نظام کے ذریعے ترقی کو فروغ دیا جائے۔ وقت کے ساتھ یہ بہترین منتخب امیدوار اعلیٰ عہدوں پر پہنچتے ہیں تو چینی عوام کی خدمت کرنے کے قابل ہونے کا اہم تجربہ پہلے ہی حاصل کر چکے ہوتے ہیں۔ اس نظام کو واضح کرنے کے لیے جھانگ وئے وئے نے 2016ء میں 'چائنہ ہورائزن' میں شائع ہونے والے اپنے ایک مضمون میں لکھا تھا:

''چین کے اعلیٰ فیصلہ ساز ادارے کمیونسٹ پارٹی آف چائنا پولیٹیکل بیورو کی قائمہ کمیٹی کے اراکین بشمول صدر شی جن پنگ کم از کم دو مرتبہ پارٹی سیکرٹریز یا صوبے کے گورنر کے طور پر خدمات سرانجام دے چکے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اگر چین کی آبادی کو پیش نظر رکھا جائے تو ان لوگوں نے اعلیٰ پوزیشنوں پر پہنچنے سے پہلے 100 ملین یا اس سے زیادہ آبادی کے لیے بہتر انتظامات کیے اور اچھی کارکردگی دکھائی۔''

اس سلسلے میں اگر صدر شی جن پنگ کی مثال کا تجزیہ کیا جائے تو یہ واضح ہو جاتا ہے کہ میرٹوکریسی کو کس طرح عملی جامہ پہنایا جاتا ہے۔ چین کا صدر بننے سے پہلے صدر شی جن پنگ تین بڑے صوبوں ''فوجیان، سنکیانگ اور شنگھائی'' کے سربراہ کے طور پر خدمات انجام دے چکے تھے۔ یعنی انہوں نے 120 ملین سے زیادہ لوگوں کے لیے خدمات سرانجام دیں۔ پھر انہیں پولٹ بیورو کی سٹینڈنگ کمیٹی کا رکن بنا دیا گیا۔ اس کے بعد انہیں کمیٹی میں مزید پانچ سال کام کرنا پڑا تاکہ چین کا صدر بننے سے پہلے وہ ریاستی کام کاج اور بین الاقوامی امور کو اچھی طرح سمجھ سکیں۔ اس طرح کا

میکنزم جس کا اشارہ شی جن پنگ کے پروفائل سے ملتا ہے اس بات کو بھی یقینی بناتا ہے کہ چین میں ملک کو چلانے کی مہارت اور اہلیت رکھنے والے افراد کو ہی اعلیٰ عہدوں تک پہنچایا جاتا ہے اور یہ عمل مغربی جمہوریتوں کے برعکس ہے جہاں کم مہارت والی لیکن معروف شخصیات بھی ریاست کی سربراہ بن سکتی ہیں۔ جیسے ڈونلڈ ٹرمپ چند سال پہلے امریکہ کے صدر بن گئے تھے۔

چین کے سیاسی فلسفے کا تیسرا اور آخری اصول Minyi اور Minxin پر مبنی ہے۔ یہ دو تصورات مینسیئس (Mencius) نے پیش کئے تھے۔ مینسیئس (372 تا 289 قبل مسیح) ایک مشہور کنفیوشین (Confucian) یعنی کنفیوشس کے تصورات کا حامی ایک فلسفی تھا۔

Minyi کے معنی ہیں 'عوامی رائے' جبکہ Minxin سے مراد ہے 'عوام کے دل و دماغ' اس حوالے سے جہاں Minyi حالات اور کارکردگی کے ساتھ تبدیل ہو سکتی ہے، وہاں Minxin مستقل اور مستحکم رہتے ہیں۔ جناب جھانگ وئے وئے کا خیال ہے کہ چینی حکومت نے گزشتہ تین دہائیوں میں Minxin کے فلسفے کے تحت کام کیا، جس نے چین کو درمیانی اور طویل مدتی پروجیکٹس کے لیے منصوبہ بندی کرنے کا موقع فراہم کیا۔ مغربی ماڈل شومین شپ اور عوامی رائے کو پھیلانے کے نظریے پر زیادہ کام کرتا ہے جبکہ اس کے برعکس چینی ماڈل طویل مدتی کارکردگی اور ترقی پر زیادہ توجہ مرکوز کرتا ہے۔ لہٰذا 'چائنا ماڈل' جو اپنی نوعیت کے اعتبار سے مستحکم ہے، اور گورننس کا طریقہ، دونوں حکمران طبقے کو اجازت دیتے ہیں کہ وہ انتخابات کے بارے میں فکرمند نہ ہو اور طویل مدتی اقدامات پر زیادہ توجہ مرکوز کرے جو بناوٹی اور محض دکھاوے کے نہیں ہوتے۔

چین کا گورننس ماڈل کتنا اچھا ہے؟

گورننس کے چینی ماڈل پر یہ مختصر بحث حکمرانی کے طریقہ ہائے کار کا ایک سرسری منظر پیش کرتی ہے جو اپنی جگہ موجود ہیں اور کام کر رہے ہیں۔ پہلے حصے میں ہم نے جانا کہ چینی ماڈل کیوں مغربی تنقید کے باوجود چین کے مستقبل اور استحکام کے لیے اہمیت رکھتا ہے۔ اس کے ساتھ ہم نے یہ بھی مشاہدہ کیا کہ چین کے سیاسی نظام نے غریبوں اور پسماندہ افراد کے لیے اپنی کارکردگی کی بنیاد پر وسیع پیمانے پر قانونی جواز حاصل کر لیا ہے۔ یہی نظام ہے جس کی وجہ سے چینی عوام کا معیارِ زندگی

بہتر ہوا ہے۔ بظاہر ایسا لگتا ہے جیسے کمیونسٹ پارٹی آف چائنا اور چینی گورننس ماڈل یک جماعتی آمرانہ نظام کا حصہ ہوں تاہم کمیونسٹ پارٹی آف چائنا کے بارے میں کی گئی مختصر بحث سے پتا چلتا ہے کہ یہ ایک شراکت داری پر مبنی نظام ہے جو ہر سیاسی رکن کو برابری کی سطح پر کھیلنے اور کمیونسٹ پارٹی آف چائنا کی صفوں میں ابھرنے اور آگے بڑھنے کی اجازت دیتا ہے۔

اس کے برعکس ہم دیکھتے ہیں کہ مغرب کے لبرل ڈیموکریٹک ماڈل میں، خصوصاً ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں کارپوریشنیں اور سرمایہ کار کسی مخصوص امیدوار کی 'حمایت' میں اہم کردار ادا کرتے ہیں، جس کی وجہ سے عام آدمی کا سیاست میں حصہ لینا مشکل ہو رہا ہے۔

تیسرے حصے میں ہمیں علم ہوا کہ چائنا ماڈل پر مغربی تنقید چین کے بارے میں کچھ پیشگی تصورات کی بنیاد پر اور زمینی حقائق پر محدود گرفت کی حامل ہے۔ یہاں چائنا ماڈل کی دنیا بھر میں ایک مثالی یا بہترین ماڈل کے طور پر وکالت نہیں کی جا رہی کیونکہ کسی بھی ملک میں گورننس کے ماڈلز کا تعین فطرت، حالات اور اُس ملک کی سماجی ترقی جیسے عوامل کرتے ہیں تاہم اس محدود بحث کے بعد یہ دلیل دی جا سکتی ہے کہ اگر چینی آبادی کی اکثریت اس نظام سے مطمئن ہے جو گزشتہ چار دہائیوں کے دوران ملک کے سماجی، معاشی اور سیاسی حالات بہتر کرنے کے حوالے سے اچھی کارکردگی کا مظاہرہ کر رہا ہو تو اس ماڈل پر مغرب کی تنقید غیر متعلق ہو جاتی ہے۔

مغرب میں چینی ماڈل پر تنقید:

جھانگ وئے وئے کا خیال ہے کہ چین کے یک جماعتی نظام پر بے جا تنقید کی گئی ہے۔ بہت سے مبصرین اور مغرب کے ماہرینِ تعلیم تنقید کرتے ہوئے اس حقیقت کو نظر انداز کر دیتے ہیں کہ چین 221 قبل مسیح میں پہلی دفعہ متحد ہوا تھا اور اس کے بعد اس پر زیادہ تر ایک متحد حکمران الیٹ حکومت کرتی رہی ہے۔ اس حکمران اشرافیہ کو مسابقتی عوامی امتحانات کے ذریعے منتخب کیا جاتا ہے، جسے ''کیجو'' (Keju) کہا جاتا ہے۔ ملک میں لیڈرشپ کے ایسے ماڈل کے ساتھ بھی چین باقی دنیا خاص طور پر یورپی ریاستوں کے مقابلے میں زیادہ پرامن رہا ہے۔ مغرب، خصوصاً امریکہ، میں چینی نظام کے بارے میں الجھنیں اب بھی باقی ہیں۔ 'انڈرسٹینڈنگ چائنا'ز پولیٹیکل سسٹم' یعنی چین کے

سیاسی نظام کو سمجھنے کی کوشش کے عنوان سے لکھی گئی اپنی رپورٹ میں کیری ڈمبوگ (Kerry Dumbaugh) اور مائیکل ایف مارٹن (Michael F. Martin) لکھتے ہیں:

''مبہم اور رازداری میں ڈوبا ہوا چین کا سیاسی نظام اور فیصلہ سازی کا عمل بہت سے مغربیوں کے لیے سمجھ میں نہ آنے والے معاملات ہیں۔ ایک سطح پر چین ایک یک جماعتی ریاست ہے جس پر 1949ء سے کمیونسٹ پارٹی آف چائنا حکومت کر رہی ہے لیکن سختی سے درجہ بندی پر مبنی اور آمرانہ ہونے کے بجائے چین میں سیاسی طاقت اب منقسم، پھیلی ہوئی، پیچیدہ اور بعض اوقات بہت زیادہ مسابقتی بن چکی ہے۔ اقتدار پر اپنی گرفت کے باوجود پارٹی اور اس کے سینئر رہنما (پولٹ بیورو اور اس کی سٹینڈنگ کمیٹی) ہمیشہ پالیسی فیصلوں کو نافذ کرنے کے قابل نہیں رہے ہیں جیسا وہ کبھی کیا کرتے تھے۔ اس کے بجائے موجودہ چین کے سیاسی عمل میں دیگر کئی سیاسی ایکٹرز بھی پروان چڑھ چکے ہیں جو کبھی پالیسی پر اثر انداز ہوتے ہیں اور بعض اوقات خود پالیسی کا تعین کرتے ہیں۔''

اچھی طرح سے تحقیق شدہ دستاویز میں یہ اعتراف بھی اشارہ کرتا ہے کہ چینیوں کے گورننس سسٹم اور ماڈل کے حوالے سے مغرب میں اب بھی کنفیوژن کیوں موجود ہے۔ دوسری طرف یہ بھی اشارہ ملتا ہے کہ یہ نظام، یک جماعتی نظام کی عمومی وحدانی وضاحت سے پیچیدہ کیوں محسوس ہوتا ہے۔ وہ یک جماعتی نظام جو مغربی لبرل ڈیموکریٹک ماڈل کے خلاف ہے۔ جھانگ وئے وئے کا خیال ہے کہ سیاسی لحاظ سے، کمیونسٹ پارٹی آف چائنا حقیقتاً ایک 'پارٹی' ہے جبکہ مغرب کی جماعتوں کو زیادہ درست طریقے سے بیان کیا جائے تو انہیں ''جزوی مفاد والی جماعتوں'' کا نام دیا جا سکتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کمیونسٹ پارٹی آف چائنا کا واحد اور بنیادی ایجنڈا چینی عوام کی اکثریت کے مفادات کی نمائندگی کرنا ہے نہ کہ کچھ مخصوص مفاداتی گروپوں کے مفادات کی نگہبانی کرنا، جیسا کہ مغربی ممالک کی سیاسی جماعتوں میں دیکھنے کو ملتا ہے، جنہیں مختلف کارپوریٹ کے مفادات کو کارٹر کرنا ہوتا ہے۔

اگرچہ کچھ برسوں سے چینی معیشت کو مسائل کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے لیکن مغربی ماڈل کے ساتھ اس کا ایک موازنہ کریں تو اس بارے میں قیمتی آگہی ملتی ہے کہ کیوں چینی ماڈل کو دنیا بھر میں غلط سمجھا جاتا ہے۔ اس بارے میں زیادہ تر غلط فہمیاں، ''جمہوریت بمقابلہ مطلق العنانیت'' کے دوہرے تجزیے کی پیداوار ہیں اور اس چیز پر کبھی بحث نہیں کی گئی یا پھر بہت کم بات کی گئی ہے

کہ ''دہائیوں سے چینی عوام اپنے سیاسی اور حکمرانی کے نظام پر اعلیٰ سطح کا اعتماد کیوں کرتے ہیں''؟ مغرب میں ان منفی تصورات کی وجہ سے بڑے بین الاقوامی خبر رساں اداروں میں ہمیشہ یہ افواہیں گردش کرتی رہی ہیں کہ چین بہت جلد تباہ ہو جائے گا۔

اس تباہی کے بارے میں پیش گوئیاں 90ء کی دہائی کے اوائل سے کی جا رہی ہیں تاہم ابھی تک ایسا نہیں ہوا۔ یہ خدشہ بھی تھا کہ چین کی حالت دنیا کی سب سے بڑی آبادی کی وجہ سے سوویت یونین جیسی ہو جائے گی اور یہ ٹکڑوں میں تقسیم ہو جائے گا، لیکن یہ خدشہ بھی غلط ثابت ہوا اور چین اب بھی متحد اور برقرار ہے۔ چین اب بھی اتنا متحد ہے کہ مغربی دانشوروں کو آخر کار چین کے 'عروج' اور زوال پذیر نہ ہونے کے بارے میں لکھنا پڑ رہا ہے۔ اس بارے میں بھی کہ مغربی دنیا کے لیے اس کا کیا مطلب ہے۔ ایسا ہی عروج چینی معیشت کو بھی حاصل ہوا اور جب دنیا کی سب سے بڑی مڈل کلاس کو آگے بڑھانے اور قوت خرید میں برابری کی بات آتی ہے تو چین اب دنیا کی ایک بڑی معیشت ہے۔ تاہم جھا نگ وئے وئے کا خیال ہے کہ مغربی دانشوروں میں چینی گورننس ماڈل پر جو تنقید ہوتی رہی ہے اور اب بھی ہو رہی ہے تو اس کی تین وجوہات ہیں۔ پہلی وجہ اپنی نیچر کے لحاظ سے نظریاتی ہے، جہاں چین کا تجزیہ کرنے والے دوہرے اور دو غلے عدسے اس ملک کو کمیونسٹ 'یک جماعتی' مطلق العنانیت اور غیر مسیحی ریاست کے طور پر دیکھنے سے وجود میں آتے ہیں۔ ایک ایسی ریاست جس نے گورننس کے ایک بالکل مختلف ماڈل کے ساتھ بھی بہت زیادہ کامیابی حاصل کر لی ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ اس کی جڑیں نیولبرل، (Neo liberal) معاشی علوم اور سوشل سائنسز کی کمزوری میں پیوست ہیں، جہاں مغربی دانشوروں میں سے کوئی بھی سوویت یونین کے ٹوٹنے یا 2008ء کے عالمی مالیاتی بحران کی پیش گوئی نہیں کر سکا تھا' لہٰذا اپنی تعلیمی خامیوں کے ساتھ مغربی تعلیمی ماہرین اور دانشور ملک کی حقیقت کو سمجھے بغیر چین کے مستقبل کے بارے میں دعوے کرتے رہے ہیں۔ جھا نگ وئے وئے کے مطابق تیسری وجہ مذکورہ بالا دو وجوہات کے مجموعہ سے وجود میں آتی ہے، یعنی چین کا تجزیہ کرتے ہوئے نظریاتی تعصب، علمی خامیاں اور نام نہاد 'ماہرینِ چین' نے چین کا تجزیہ کرتے وقت انہی دو تعصّبات پر انحصار کیا ہے تاہم ان کے موروثی تعصب اور تجزیے کی خامیوں کی وجہ سے ان کے تجزیے اب چین اور حقیقی دنیا، دونوں کے لیے غیر متعلق ہو رہے ہیں۔

باب چہارم

چین: صدر شی جن پنگ کی قیادت میں

''نوجوانوں کو اپنی پیشہ ورانہ مہارتوں کو نکھارنا چاہیے۔ مطالعہ ترقی کی سیڑھی ہے اور عمل صلاحیت کو بہتر بنانے کا طریقہ ہے۔ نوجوانوں کا معیار اور صلاحیتیں 'چینیوں کے خواب' کو سمجھنے کے طریقے سے براہ راست منسلک ہے۔''

(صدر شی جن پنگ، 4 مئی 2013ء)

صدر شی جن پنگ کے حالاتِ زندگی:

شی جن پنگ نے 2013ء میں ملک کا صدر بننے کے فوراً بعد عالمی سطح پر بے پناہ مقبولیت حاصل کر لی تھی۔ صدر بننے سے پہلے شی جن پنگ نے 2008ء اور 2013ء کے درمیانی عرصہ میں چین کے نائب صدر کے طور پر خدمات انجام دیں۔ وہ 2012ء سے تاحال کمیونسٹ پارٹی آف چائنا کے جنرل سیکرٹری ہیں۔

شی جن پنگ 1953ء میں شانشی صوبے کی فوپنگ کاؤنٹی میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کے والد کا نام شی ژونگ شن تھا۔ شی جن پنگ کے والد نیشنل پیپلز کانگریس کی سٹینڈنگ کمیٹی کے نائب چیئرمین کے طور پر خدمات سرانجام دے چکے ہیں اور ان کا شمار ماؤزے تنگ کے قریبی ساتھیوں میں ہوتا تھا۔ 1969ء میں شی جن پنگ نے ورک فورس میں شمولیت اختیار کر لی اور پھر جنوری 1974ء میں کمیونسٹ پارٹی آف چائنا میں شامل ہو گئے۔

شی جن پنگ نے سنگھوا یونیورسٹی میں ہیومینٹیز اینڈ سوشل سائنسز کے سکول سے گریجوایشن

کی۔ان کا بڑا مضمون مارکسسٹ تھیوری تھا۔شی جن پنگ ان سروس پوسٹ گریجویٹ ہیں اور ڈاکٹر آف لاز کی ڈگری کے بھی حامل ہیں۔

شی جن پنگ کی زندگی کی مختصر ٹائم لائن:

1969ء سے 1975ء کا دور: تعلیم یافتہ نوجوان اور پارٹی برانچ سیکرٹری، لیانگ جیاہے بریگیڈ (Liangjiahe Brigade)، وینیائی کمیون (Wen'anyi Commune)، یانچوان کاؤنٹی (Yanchuan County)، صوبہ شانشی۔

1975ء سے 1979ء: سنگھوا یونیورسٹی کے شعبہ کیمیکل انجینئرنگ میں بنیادی نامیاتی ترکیب کے طالب علم رہے۔

1979ء سے 1982ء: سیکرٹری، جنرل آفس، سٹیٹ کونسل اینڈ سینٹرل ملٹری کمیشن (اے ڈی)

1982ء تا 1983ء: کمیونسٹ پارٹی آف چائنا، زینگڈنگ کاؤنٹی کمیٹی، صوبہ ہیبی کے ڈپٹی سیکرٹری رہے۔

1983ء تا 1985ء: سیکرٹری کمیونسٹ پارٹی آف چائنا، زینگڈنگ کاؤنٹی کمیٹی، صوبہ ہیبی۔علاوہ ازیں پہلا کمشر (commissar) (کمیونسٹ پارٹی کا ایک عہدے دار) اور پارٹی کمیٹی کا پہلا سیکرٹری، زینگڈنگ کاؤنٹی ملٹری افیئرز ڈیپارٹمنٹ۔

1985ء تا 1988ء: کمیونسٹ پارٹی آف چائنا زیامین میونسپل کمیٹی کے ممبر سٹینڈنگ کمیٹی اور صوبہ فوجیان کے نائب میئر رہے۔

1988ء تا 1990ء: کمیونسٹ پارٹی آف چائنا ننگدے پریفیکچرل کمیٹی کے سیکرٹری رہے، پارٹی کمیٹی صوبہ فوجیان کے فرسٹ سیکرٹری رہے، ننگدے ملٹری سب ریجن۔

1990ء تا 1993ء: سیکرٹری، کمیونسٹ پارٹی آف چائنا فوزہو میونسپل کمیٹی، صوبہ فوجیان۔چیئرمین قائمہ کمیٹی فوزہو میونسپل پیپلز کانگریس۔فرسٹ سیکرٹری، پارٹی کمیٹی، فوزہو ملٹری سب ریجن۔

1993ء تا 1995ء: رکن، قائمہ کمیٹی، کمیونسٹ پارٹی آف چائنا صوبائی کمیٹی فوجیان۔

سیکرٹری، کمیونسٹ پارٹی آف چائنا فوزہوو میونسپل کمیٹی۔ چیئرمین قائمہ کمیٹی فوزہوو میونسپل پیپلز کانگریس۔فرسٹ سیکرٹری پارٹی کمیٹی،فوزہوو ملٹری سب ریجن۔

1995ء تا1996ء: ڈپٹی سیکرٹری، کمیونسٹ پارٹی آف چائنا فوجیان صوبائی کمیٹی۔ سیکرٹری، کمیونسٹ پارٹی آف چائنا فوزہوو میونسپل کمیٹی۔ چیئرمین قائمہ کمیٹی فوزہوو میونسپل پیپلز کانگریس۔فرسٹ سیکرٹری، پارٹی کمیٹی،فوزہوو ملٹری سب ریجن۔

1996ء تا1999ء: ڈپٹی سیکرٹری، کمیونسٹ پارٹی آف چائنا فوجیان صوبائی کمیٹی۔ فرسٹ کمشر،فوجیان صوبائی اینٹی ایئر کرافٹ آرٹلری ریزروڈویژن۔

1999ء تا2000ء: ڈپٹی سیکرٹری، کمیونسٹ پارٹی آف چائنا فوجیان صوبائی کمیٹی۔قائم مقام گورنر،صوبہ فوجیان۔ڈپٹی ڈائریکٹر،نیشنل ڈیفنس موبلائزیشن کمیٹی، نانجنگ ملٹری ایریا کمانڈ۔ ڈائریکٹرفوجیان صوبائی نیشنل ڈیفنس موبلائزیشن کمیٹی۔فرسٹ کمشر،فوجیان صوبائی اینٹی ایئر کرافٹ آرٹلری ریزروڈویژن۔

2000ء تا2002ء: ڈپٹی سیکرٹری، کمیونسٹ پارٹی آف چائنا فوجیان صوبائی کمیٹی۔ گورنر صوبہ فوجیان۔ نائب ڈائریکٹر،نیشنل ڈیفنس موبلائزیشن کمیٹی، نانجنگ ملٹری ایریا کمانڈ۔ڈائریکٹر، فوجیان صوبائی نیشنل ڈیفنس موبلائزیشن کمیٹی۔فرسٹ کمشر،فوجیان پراونشل اینٹی ایئر کرافٹ آرٹلری ریزروڈویژن۔(1998ء-2002ء: سنگھوا یونیورسٹی میں سکول آف ہیومینٹیز اینڈ سوشل سائنسز کی انٹرسروس پوسٹ گریجوایٹ کلاس میں مارکسسٹ تھیوری کا مطالعہ اور نظریاتی وسیاسی تعلیم۔اس تعلیم کی کامیاب تکمیل پر انہیں ڈاکٹر آف لاز کی ڈگری سے نوازا گیا۔)

2002ء تا2003ء: سیکرٹری کمیونسٹ پارٹی آف چائنا،ژی جیانگ صوبائی کمیٹی۔قائم مقام گورنر،صوبہ ژی جیانگ۔فرسٹ سیکرٹری، پارٹی کمیٹی،ژی جیانگ صوبائی ملٹری ریجن۔ڈپٹی ڈائریکٹرنیشنل ڈیفنس موبلائزیشن کمیٹی، نانجنگ ملٹری ایریا کمانڈ۔ڈائریکٹر،ژی جیانگ صوبائی نیشنل ڈیفنس موبلائزیشن کمیٹی۔

2003ء تا2007ء: سیکرٹری، کمیونسٹ پارٹی آف چائنا صوبائی کمیٹی ژی جیانگ۔ چیئرمین، قائمہ کمیٹی، جیانگ صوبائی پیپلز کانگریس۔فرسٹ سیکرٹری، پارٹی کمیٹی،ژی جیانگ صوبائی

ملٹری ریجن۔

2007ء تا2007ء: سیکرٹری، کمیونسٹ پارٹی آف چائنا شنگھائی میونسپل کمیٹی۔ فرسٹ سیکرٹری، پارٹی کمیٹی، شنگھائی گیریژن کمانڈ۔

2007ء تا2008ء: ممبر، قائمہ کمیٹی، پولیٹیکل بیورو؛ اور ممبر، سیکرٹریٹ، سینٹرل کمیٹی کمیونسٹ پارٹی آف چائنا۔ صدر، سینٹرل پارٹی سکول۔

2008ء تا2010ء: ممبر قائمہ کمیٹی، پولیٹیکل بیورو؛ اور ممبر سیکرٹریٹ سینٹرل کمیٹی کمیونسٹ پارٹی آف چائنا۔ نائب صدر عوامی جمہوریہ چین۔ صدر، سینٹرل پارٹی سکول۔

2010ء تا2012ء: ممبر، قائمہ کمیٹی، پولیٹیکل بیورو؛ اور ممبر، سیکرٹریٹ؛ سینٹرل کمیٹی، کمیونسٹ پارٹی آف چائنا۔ نائب صدر عوامی جمہوریہ چین۔ وائس چیئرمین، کمیونسٹ پارٹی آف چائنا اور عوامی جمہوریہ چین مرکزی فوجی کمیشن۔ صدر، سینٹرل پارٹی سکول۔

2012ء تا2013ء: جنرل سیکرٹری، مرکزی کمیٹی کمیونسٹ پارٹی آف چائنا۔ چیئرمین، کمیونسٹ پارٹی آف چائنا سینٹرل ملٹری کمیشن۔ نائب صدر عوامی جمہوریہ چین۔ وائس چیئرمین، عوامی جمہوریہ چین سینٹرل ملٹری کمیشن۔

2013ء سے تاحال: جنرل سیکرٹری، مرکزی کمیٹی کمیونسٹ پارٹی آف چائنا۔ چیئرمین، کمیونسٹ پارٹی آف چائنا سینٹرل ملٹری کمیشن۔ صدر عوامی جمہوریہ چین۔ چیئرمین عوامی جمہوریہ چین سینٹرل ملٹری کمیشن۔

ماؤزے تنگ اور شی جن پنگ میں کیا مشترک ہے؟

چیئرمین ماؤزے تنگ چین، چینی عوام اور ثقافت سے محبت کرتے تھے۔ ان کا یہی مرکزی اصول شی جن پنگ کے اقدامات اور کوششوں کی رہنمائی کرتا ہے۔

چینگ شا میں کمیونسٹ پارٹی کے سینٹرل پارٹی سکول کے ہیڈ ماسٹر چاؤ یوآن چی (Chao Yuan Qi)، جنہوں نے تیس سال سے زائد عرصے تک سرکاری اہلکاروں کو تربیت دی اور حکمران جماعت کی تاریخ اور نظریات پڑھاتے رہے، نے بتایا کہ ''ماؤزے تنگ اور شی جن پنگ، دونوں کو

اپنی ذمہ داریوں کا یکساں احساس تھا اور ہے۔''

ایک عقیدت مند چینی استاد کو اپنے بابائے قوم ماؤزے تنگ اور جدید دور کے چمکتے ستارے شی جن پنگ کو خراجِ عقیدت اور خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے دیکھنا واقعی ایک شاندار نظارہ تھا۔ جب ان سے ایک بار پوچھا گیا کہ دونوں رہنماؤں میں کیا کیا چیزیں مشترک ہیں تو بوڑھا چاؤ یوآن چی ایسے ان دونوں کی صفات بیان کرتا رہا جیسے کسی مقدس کتاب سے تحریر پڑھ رہا ہو۔

پانچ مشترکات:

پہلی مشترکہ صفت یہ ہے کہ ماؤزے تنگ اور شی جن پنگ ''دونوں ہی قوم اور ملک کے لیے ذمہ داری کا یکساں احساس رکھتے تھے اور ہیں۔'' اس احساس کی جڑیں اس یقین میں پیوست ہیں کہ کمیونسٹ پارٹی کا سب سے بڑا مقصد اقتصادی ترقی کے ذریعے چینی عوام کے مفادات کا تحفظ ہے۔ چیئر مین ماؤ نے لانگ مارچ ''جس کا اختتام 1949ء میں یانان، شانشی صوبے میں ہوا تھا'' کی بنیاد پر ایک نئے ورلڈ آرڈر کی خواہش ظاہر کی تھی لیکن حالات، وقت اور قوم سازی کی بھاری بھرکم ذمہ داریوں نے انہیں اپنے خواب کو حقیقت میں ڈھالنے کی مہلت نہ دی۔ اب شی جن پنگ تنظیم نو، جدت اور احتساب پر انتھک توجہ کے ساتھ اس مقصد کے حصول کے لیے کوشاں ہیں۔ اس حوالے سے بات کرتے ہوئے چاؤ یوآن چی نے بتایا کہ چین دنیا کو بتانا چاہتا ہے کہ اس کا تیز رفتار ابھار پُرامن طریقے سے ہے نہ کہ جنگوں کے ذریعے اور یہ نوآبادیاتی طاقتوں، جیسے برطانیہ، فرانس اور امریکہ کے عروج سے بالکل برعکس ہے۔

دوسری، چاؤ یوآن چی کا خیال ہے کہ ماؤزے تنگ اور شی جن پنگ، دونوں مارکسزم اور چینیوں کی زمینی حقیقت کے امتزاج کے ذریعے مسائل کے فطری حل تلاش کرنے پر یقین رکھتے ہیں۔ چیئر مین ماؤ نے ایک بار کہا تھا، ''چینی انقلاب کی قیادت چینی عوام کو کرنی چاہئے، ان لوگوں کو جو چین کی زمینی صورت حال، حقیقت اور ثقافت کے بارے میں جانتے ہیں۔'' صرف وہی انقلاب لا سکتے ہیں جو زمینی حقائق سے منسلک ہوں۔

ایسا لگتا ہے کہ صدر شی جن پنگ اب ان اسباق کی طرف متوجہ ہو رہے ہیں' جو ماؤ نے

سیکھے تھے، یہ ان کی اس تقریر سے بھی مترشح ہے، جو انہوں نے کارل مارکس کے 200ویں یوم پیدائش کے موقع پر کی تھی۔ انہوں نے کہا تھا:

''ہمیں مارکس (اور اس کا فلسفہ) یاد ہے لیکن ہم نے اسے چینی حقیقت کے ساتھ یکجا کر دیا تا کہ (ترقی اور سیاسی تبدیلی) کا اپنا نظریہ تخلیق کر سکیں۔'' پیغام واضح تھا کہ چین اپنی سرزمین پر حکمرانی اور معیشت کی مغربی تھیوری اور ماڈلز کو اپنانا چاہتا ہے اور نہ ہی اس تھیوری اور ان ماڈلز کو خود پر مسلط کر سکتا ہے۔ چاؤ یو آن چی نے صدر شی جن پنگ کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ ''ہم اپنی ضروریات کے مطابق اس میں ترمیم کریں گے۔ مثال کے طور پر مارکسزم ایک منصوبہ بند معیشت کا مطالبہ کرتا ہے، ہم نے وہ کیا لیکن آہستہ آہستہ احساس ہوا کہ یہ بہت کارآمد ثابت ہو رہا ہے؛ چنانچہ ہم نے اپنی معیشت کو کھول دیا۔''

ماؤزے تنگ اور شی جن پنگ میں تیسری مشترک چیز ان کی عوام کے لیے محبت ہے۔ ماؤ اپنے دوستوں کی مدد کرنے سے کبھی نہیں ہچکچاتے تھے۔ سکول میں وہ اکثر اپنا کھانا دوستوں کے ساتھ بانٹ کر کھاتے تھے۔ یہاں تک کہ دوستوں کے خاندان والوں کی بھی مدد کر دیا کرتے تھے۔ قدرت نے یہ جذبہ ان کے اندر سمو دیا تھا۔ حتیٰ کہ اکتوبر 1949ء میں عوامی جمہوریہ چین کے قیام کا اعلان ہو جانے کے بعد بھی عوام کی فلاح و بہبود ان کی توجہ کا مرکز رہی۔ اس کے بدلے میں ظاہر ہے عوام نے بھی حکومت کی حمایت کو یقینی بنانا تھا اور یہ ایسی چیز تھی جو ان کے خیال میں ملک کو مؤثر طریقے سے چلانے کے لیے بے حد ضروری تھی۔ وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ ''ہمیں لوگوں کی حمایت کی ضرورت ہے اور اس طرح ہمیں لوگوں کی ضرورت ہے۔''

کنفیوشس کے ایک پُرانے قول کے مطابق ایک لیڈر کشتی کی مانند ہوتا ہے اور عوام پانی کی مانند ہوتے ہیں۔ پانی کشتی کو سہارا دے سکتا ہے اور کشتی کو الٹا بھی سکتا ہے اور ڈبو بھی سکتا ہے۔ ماؤ نے شہریوں کی اہمیت کو مزید اجاگر کرنے کے لیے اس سوچ یا قول میں مزید ترمیم کر لی ''کمیونسٹ پارٹی مچھلی کی طرح ہے اور عوام پانی کی طرح، اور مچھلی پانی کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔''

عوام کی طاقت پر غیر متزلزل یقین چوتھی عام خصوصیت ہے جو ماؤ اور شی جن پنگ دونوں میں مشترک ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ دونوں قوم کی مشترکہ طاقت پر ایمان رکھتے ہیں

اور اس تصور کے ساتھ بندھے ہوئے ہیں کہ عوام کی طاقت کو جمع کرنا اور استعمال کرنا قومی کامیابی کی بنیاد ہے۔

ماؤ اور شی جن پنگ میں پانچویں مشترک چیز ان کی استقامت اور یقینِ محکم ہے۔ ماؤ نے کبھی ہتھیار نہیں ڈالے چاہے کتنی ہی مشکل صورت حال کیوں نہ ہو۔ مثال کے طور پر 1951ء میں کوریا کی جنگ کے دوران ماؤ نے امریکہ کے خلاف جنگ لڑی حالانکہ اس وقت روسی لیڈر جوزف سٹالن نے کوریا کے تنازع سے دور رہنے کو ترجیح دی تھی لیکن ماؤزے تنگ نے یہ ہمت کر دکھائی۔ 1960ء کی دہائی میں امریکہ نے چین پر کچھ پابندیاں لگائیں تب بھی روس نے دھوکہ کیا اور اسے تنہا چھوڑ دیا۔ ماؤ نے اس وقت بھی پُرعزم رہتے ہوئے قوم سے کہا کہ چین کو اس مشکل دور سے لڑ کر نکلنا ہوگا۔ چین کے لیے وہ بلاشبہ ایک مشکل وقت تھا۔ وسائل نہ ہونے کی وجہ سے لوگ بھوکے مر رہے تھے اور صنعت کاری نوزائیدہ تھی جبکہ زیادہ تر انحصار زرعی شعبے پر تھا۔ ماؤ نے اس وقت پوری قوم کو متحرک کرنے کی کوشش کی اور کہا کہ اقتصادی پابندیوں کو برداشت کریں۔ ایک طرف یہ معاملات تھے دوسری جانب حکمران اشرافیہ کی طرف سے طاقت اور وسائل کے غلط استعمال کی وجہ سے پارٹی پر لوگوں میں عدم اطمینان پیدا ہونا شروع ہو گیا تھا۔ یہاں حکمران اشرافیہ سے مراد کمیونسٹ پارٹی کی اعلیٰ قیادت ہے، حکومت میں اس اعلیٰ قیادت کے ماتحت اور پیپلز لبریشن آرمی کے حکام۔ بحیثیت رہنما اور بطور ایک وژنری ماؤ کی اصل طاقت یہی تھی کہ ان کی سوچ اور تفکر بہت سی برائیوں کی نشاندہی کرتے ہیں، وہ برائیاں جو حکمرانی اور ریاستی معاملات میں پارٹی کے غلبے سے جنم لیتی ہیں۔

صدر شی جن پنگ بھی اپنی جوانی میں مشکل وقت کا سامنا کرتے رہے تھے لیکن انہوں نے ہمیشہ پارٹی پہ اپنا یقین برقرار رکھا۔ سب جانتے ہیں کہ 1970ء کی دہائی کے آخر میں ڈینگ ژیاؤ پنگ کی لبرلائزیشن جہاں معاشی تبدیلی کا سبب بنی وہاں اپنے ساتھ متعدد چیلنجز بھی لائی تھی۔ اسی طرح مثال کے طور پر جب شی جن پنگ نے صدارت سنبھالی تو ان کا ملک پہلے ہی ترقی اور فروغ کے شاندار راستے پر گامزن تھا۔ اس کے باوجود لوگوں کا پارٹی پر اعتماد کم ہونا شروع ہو گیا تھا۔ بہت سے لوگوں نے تب سوچا کہ پارٹی صرف اشرافیہ کے فائدے کے لیے کام کر رہی ہے۔ اس سے ایک عجیب منطق نے جنم لیا کہ ترقی اور کرپشن ساتھ ساتھ چلتی ہیں۔

شی جن پنگ کو کون سی طاقت آگے بڑھا رہی ہے؟

شی جن پنگ کا کہنا ہے ''اگر ہم بدعنوانی کے خلاف لڑیں گے تو پارٹی گر جائے گی لیکن اگر ہم ایسا نہیں کریں گے تو قوم زوال کا شکار ہو جائے گی۔'' جیسا کہ بہت سے پرانے محافظ یاد کرتے ہیں کہ صورت حال لاکھوں چینیوں کے لیے مایوس کن تھی جو یہ سوچتے تھے کہ پارٹی کی اعلیٰ قیادت ایک خصوصی کلب بن چکا ہے جو ان کے خون پسینے سے پھلتا پھولتا ہے اور وہ کسی کے سامنے جواب دہ نہیں ہے۔ یہ سوچ حکومت اور پارٹی پر عوام کے اعتماد میں ایک واضح کٹاؤ کا باعث بنی۔

پارٹی کے عہدے داروں کے مطابق شی جن پنگ نے اس صورت حال کو پارٹی کے وجود کے لیے ایک بڑے خطرے کے طور پر بھانپ لیا تھا۔ وہ اکثر پارٹی میں پائی جانے والی کرپشن پر بے اطمینانی کا اظہار کرتے تھے اور اس بات پر بھی کہ ان لوگوں کی (بدعنوانوں کی) پارٹی کے نظریات سے وابستگی اب مضبوط نہیں رہی۔ شی جن پنگ کی نظر میں یہ ایک ایسا راستہ تھا جو بربادی کی طرف جاتا تھا۔ ایک دفعہ انہوں نے اپنی ایک تحریر میں لکھا تھا ''اگر حوصلے پست ہوں تو تنظیم ڈھیلی پڑ جاتی ہے، نظم وضبط اور اخلاقیات پر نظر رکھنے والا کوئی نہیں رہتا، اگر ہمارے ساتھ ایسا ہوا تو پھر بالآخر ہم نہ صرف ناکام ہوں گے بلکہ وہ الم ناک صورت حال دہرائی بھی جا سکتی ہے جیسی چھو (Chu) کے شہنشاہ یی (Yi) کے معاملے میں ہوا تھا۔'' (یاد رہے کہ شہنشاہ یی کی نہ صرف حکومت ختم کی گئی تھی بلکہ اسے 202 قبل مسیح میں قتل بھی کر دیا گیا تھا)۔ لیکن یہ قدیم تاریخ نہیں ہے جو شی جن پنگ کو خوفزدہ کرتی ہے۔ خوفزدہ کرنے والی چیز ماضی قریب کا معاملہ ہے اور یہ سوویت یونین کا ٹوٹنا ہے۔ شی جن پنگ کے لیے سب کچھ پارٹی سے شروع ہوتا اور پارٹی پر ہی ختم ہو جاتا ہے یعنی ان کے لیے سب کچھ پارٹی ہی ہے چنانچہ ایک جگہ انہوں نے لکھا ''مشرق ہو یا مغرب، شمال ہو یا جنوب پارٹی ہر چیز کی قیادت کرتی ہے۔'' ان کا خیال ہے کہ اگر پارٹی کا سقوط ہو گیا تو ملک بھی ختم ہو جائے گا۔ چینی لیڈران سوویت یونین کے خاتمے کی وجہ روسی کمیونسٹوں کی طرف سے خود اعتمادی کی ناکامی بتاتے ہیں اور پُرعزم ہیں کہ چین میں ایسا کچھ نہیں ہونا چاہیے اور نہ ہی وہ ایسا ہونے دیں گے۔ اس لیے حیرت کی بات نہیں کہ اگست 2018ء میں چینیوں کے آرمی ڈے کے موقع پر شی جن پنگ نے بیس

لاکھ سپاہیوں پر مشتمل طاقتور فوج کی اعلیٰ قیادت پر زور دے کر کہا تھا کہ وہ کمرشل سرگرمیاں مکمل طور پر ختم کر دے یا کم کر دے۔ انہوں نے پی ایل اے (پیپلز لبریشن آرمی) کا معاوضے پر اپنی خدمات فراہم کرنے کا خصوصی طور پر تذکرہ کیا اور اس جاری عمل کے خلاف لڑنے کے لیے عزمِ صمیم کی ضرورت پر زور دیا جس کی وجہ سے پی ایل اے کے ''فوجی افسران اور سیاسی کمشرز'' کرائے کے سپاہی بن جاتے ہیں۔ وہ ان مقامی ٹائیکونز اور کاروبار میں کیڈرز کی ان فورسز کے ساتھ شامل ہونے کے حوالے سے بھی جانے جاتے ہیں جو پُرکشش ریئل اسٹیٹ، لاجسٹکس اور تفریحی شعبوں سے منافع کشید کرتی ہوں۔ انہوں نے کہا، توقع کی جاتی ہے کہ فوج سالِ کے اختتام تک ہر قسم کے لین دین والے معاملات سے باہر نکل آئے گی اور تمام تجارتی اور معاوضہ لے کر کام کرنے والی سرگرمیاں ترک کر دے گی اور تجارتی اداروں میں حصص کی منتقلی کے معاملات مکمل کر لے گی۔ پی ایل اے ڈیلی کے مطابق اس کا مقصد ''اپنے اندر سیاسی تطہیر اور جنگی تیاری کے اس کے اہم مشن پر توجہ مرکوز کرنے میں'' فوج کی مدد کرنا تھا۔

ان کے اس خطاب سے چار بنیادی مقاصد میں سے ایک یعنی کرپشن پر صدر شی جن پنگ کی گہری توجہ کی بھی وضاحت ہوئی۔ صدر شی جن پنگ لوگوں میں مثبت توانائی منتقل کرنے اور اقدار کے نظام کی اصلاح پر یقین رکھتے ہیں۔ اقدار کا وہ نظام جو ماؤ اور ڈینگ نے وضع کیا تھا۔ صدر شی جن پنگ نے انتہائی توجہ مرکوز کر کے اور نہایت منظّم طریقے سے غربت کے خاتمے کے پروگرام کا بھی آغاز کیا اور یوں انہوں نے خود کو عوام میں ہر دلعزیز بنا لیا ہے۔ انہوں نے اپنے عوام کو ایک نیا اعتماد دیا اور اقتدار کے اعلیٰ ایوانوں پر ان (عوام) کے اعتماد کو بحال کیا ہے۔

آخر میں یہ کہ ماؤ اور شی جن پنگ نے جس طرح پارٹی کو چلایا اس میں نظم و ضبط مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔ انہوں نے خود کو منظّم کیا' خاندان' دوستوں اور پارٹی کو منظّم کیا۔ بدعنوانی کے خلاف ان کی عدم برداشت کی جڑیں بھی اس حقیقت میں پیوست ہیں کہ دونوں (ماؤ اور شی جن پنگ) ذاتی اتحاد، کلیت اور سالمیت کے رہنما رہے ہیں۔ شی جن پنگ کے اپنے ہاتھ صاف تھے اور یہ چیز دوسروں کو کچھ بھی غیر قانونی کرنے سے روکنے کے کام آتی رہی ہے چنانچہ ان کی غیر متنازع حیثیت کو اختیارات بھی حاصل ہو گئے۔

2013ء میں ماؤ کے 120 ویں یوم پیدائش کے موقع پر خطاب کرتے ہوئے صدر شی جن پنگ نے کہا تھا:

''ماؤزے تنگ نے ایک بار کہا تھا کہ حقائق سب کچھ ہیں۔ وہ ساری چیزیں بھی حقائق ہیں جو معروضی طور پر موجود ہیں، 'سچ' کا مطلب ہے ان کے داخلی تعلقات یعنی قوانین ان پر حکمرانی کرتے ہیں اور 'تلاش کرنے' کا مطلب مطالعہ کرنا ہے۔'' انہوں نے ''تیر کو نشانے پر لگانے'' کا استعارہ بھی استعمال کیا تھا جس کا مطلب یہ تھا کہ ہم مارکسزم کے تیر کو چینی انقلاب یعنی جدیدیت کی مہم اور اصلاحات کے نشانے پر لگاتے ہیں۔ حقائق سے سچائی تلاش کرنے کے لیے ہمیں معاملات کی گہرائی تک سمجھ بوجھ حاصل کرنی چاہئے۔ سطح سے نیچے معاملے کو گہرائی تک پرکھیں اور بکھرے ہوئے مظاہر کے درمیان معاملات کے پیچیدہ ربط دریافت کریں۔ 9.6 ملین مربع کلومیٹر کی وسیع سرزمین ایک بھرپور ثقافتی وراثت اور 1.3 ارب چینی عوام کے درمیان ایک مضبوط رشتہ ہے اور ان سب کے ساتھ ہم اپنے راستے پر گامزن رہنے کا عزم رکھتے ہیں۔ ہمارے پاس ایک بڑا سٹیج ہے جس پر ہم اپنے مفادات کو پیش کر سکتے ہیں اور ان کا اظہار کر سکتے ہیں۔ ہمارے پاس ایک طویل تاریخ ہے جس سے ہم فائدہ اٹھا سکتے ہیں اور ہمارے پاس ایک طاقتور محرک ہے جو ہمیں آگے بڑھا سکتا ہے۔ ہم چینی لوگ ہیں اور ہم میں سے ہر ایک کو اس سے اعتماد حاصل کرنا چاہئے۔''

شی جن پنگ: ایک چمکتا ستارہ

امکان ہے کہ شی جن پنگ فیکٹر چین کی سیاسی منظر نامے پر دوررس اثرات مرتب کرے گا۔ کئی دہائیوں تک کمیونسٹ پارٹی آف چائنا کا جنرل سیکرٹری اور بعد ازاں 2013ء میں عوامی جمہوریہ چین کا صدر بن جانے کے بعد شی جن پنگ نے ایک مضبوط قائدانہ کردار اپنایا۔ اکتوبر 2017ء جب کمیونسٹ پارٹی آف چائنا کی 19 ویں قومی کانگریس کا اجلاس ہوا اور مارچ 2018ء میں جب پارٹی اجلاس کے فیصلے نے دو مدت تک صدر کی پابندی کو ختم کر دیا تو اس وقت چین ایک ہنگامہ خیز دور سے گزرا۔ اس کے ساتھ ہی شی جن پنگ کمیونسٹ پارٹی آف چائنا کی ماؤ کے بعد کی تاریخ میں دنیا کے سب سے مضبوط رہنما بن کر ابھرے۔ وجہ یہ ہے کہ ان کے دور میں چین نہ صرف

عالمی بلکہ بین الریاستی درجہ بندی میں بھی تیزی سے ابھر کر سامنے آیا اور اسے زمین پر تقریباً تمام اقوام کا عالمی تجارتی پارٹنر (حیرت انگیز 6 پلس فیصد جی ڈی پی کی شرح نمو کی بنیاد پر) ہونے کی حیثیت بھی حاصل ہوئی۔شی جن پنگ کی مضبوطی کی ایک وجہ یہ ہے کہ پارٹی کی جانب سے انہیں ہیکسن یعنی مرکزی رہنما کا خطاب دیا گیا ہے۔ ماؤزے تنگ، ڈینگ ژیاؤ پنگ اور جیانگ زیمن کے بعد شی جن پنگ یہ خطاب حاصل کرنے والے چوتھے چینی راہنما ہیں۔

19 ویں کانگریس کے دوران ہونے والے واقعات میں سب سے زیادہ غیر معمولی واقعہ 24 اکتوبر کو رونما ہوا جب 2300 مندوبین نے بیجنگ کے گریٹ ہال آف دی پیپل میں ہفتہ بھر طویل کانگریس میں متفقہ طور پر پارٹی آئین کے نظر ثانی شدہ ورژن کی منظوری دی۔اس نظر ثانی شدہ ورژن میں نئے رہنما اصول بھی وضع کئے گئے تھے، جن کا عنوان تھا: نئے دور کے لیے چینی خصوصیات کے ساتھ سوشلزم پر شی جن پنگ کی سوچ۔

اسے دستاویز کے آرٹیکل 2 میں شامل کیا گیا تھا، جو اب تک زندہ ہے اور ماؤ کے انتقال کے بعد سے تمام رہنماؤں کے لیے بائبل کی حیثیت رکھتا ہے۔

اس موقع پر 64 سالہ شی جن پنگ نے مندوبین کو بتایا کہ یہ ان کی قوم کے لیے خود کو ایک طاقتور قوت میں تبدیل کرنے کا وقت ہے۔ ایک ایسی طاقتور قوم جو سیاسی، معاشی، عسکری اور ماحولیاتی مسائل کے حوالے سے دنیا کی قیادت کر سکے۔

صدر شی جن پنگ نے اپنے 3 گھنٹے 23 منٹ طویل جرأت مندانہ خطاب میں اگلے پانچ سالوں کی ترجیحات پر مبنی پارٹی کا خاکہ پیش کرتے ہوئے کہا تھا: ''یہ چین کی ترقی میں ایک نیا تاریخی موڑ ہے۔چینی قوم اٹھ کھڑی ہوئی ہے، متمول ہو چکی ہے اور مضبوط بھی۔اب یہ دوبارہ جوان ہونے کے شاندار امکانات کو قبول کر چکی ہے۔ یہ ایک ایسا دور ہوگا جس میں چین مرکز کے قریب تر ہوتا ہوا محسوس ہوگا اور بنی نوع انسان کے لیے زیادہ سے زیادہ اعانت کرتا نظر آئے گا۔''

شی جن پنگ نے متنبہ کیا کہ جس چیز کو حاصل کرنے کو انہوں نے 'چین کے خواب' کے طور پر سراہا ہے وہ پارک میں چہل قدمی کرنے جیسا معاملہ نہیں ہوگا۔انہوں نے کہا تھا ''اس منزل تک پہنچنے اور طے کردہ اہداف کو پورا کرنے کے لیے ڈھول پیٹنے اور ناقوس بجانے سے زیادہ عملی طور

پر کچھ کرنا پڑے گا۔ ہمارا مشن عملی اقدام کرنا ہے۔ آیئے ہم مضبوط قیادت کے پشتی بان بنیں اور ایک مضبوط جدوجہد میں شامل ہو جائیں۔''

جماعت نے تب نئے اندرونی کور کی بھی منظوری دی۔ صدر شی جن پنگ اور وزیر اعظم لی قیانگ کے علاوہ چین کی سیاست میں ژاؤ لیجی، وانگ ہننگ، کائی چی، ڈنگ زو جیانگ اور لی شی بھی شامل ہیں۔

پولٹ بیورو سٹینڈنگ کمیٹی، چین کے سرکردہ رہنما

62 سالہ وانگ یانگ دو بار پولٹ بیورو کے رکن رہے ہیں۔ انہوں نے اپنا ابتدائی کیریئر کمیونسٹ پارٹی کی یوتھ لیگ میں کام کرتے ہوئے گزارا۔ وہ سابق چینی رہنما ہو جن تاؤ کی طاقتور قوت کی بنیاد رہے ہیں۔ انہیں ایک اصلاح پسند کے طور پر دیکھا جاتا ہے اور وہ امریکہ چین تعلقات کو فروغ دینے میں بھی سب سے آگے رہے ہیں۔ وہ سالانہ امریکہ چین سٹریٹیجک اور اقتصادی ڈائیلاگ کی قیادت بھی کرتے ہیں۔

60 سالہ ژاؤ لیجی کمیٹی کے سب سے کم عمر رکن ہیں۔ انہوں نے اپنا ابتدائی کیریئر چنگھائی میں گزارا۔ 1994ء میں 37 سال کی عمر میں انہیں شمال مغربی صوبے کا گورنر نامزد کیا گیا اور اس کے بعد وہ صوبائی پارٹی سربراہ بنے۔ 2007ء میں انہیں شانشی کے پارٹی سربراہ کے طور پر ترقی دی گئی

اور انہیں صدر شی جن پنگ کا قریبی ساتھی سمجھا جاتا ہے کیونکہ دونوں کو ئلے سے مالا مال صوبے کے باشندے ہیں۔

67 سالہ لی زانشو کو 2012ء میں پولٹ بیورو میں ترقی دی گئی تھی۔ صدر شی جن پنگ کے اعلیٰ ترین معاون کے طور پر وہ ان کی روزمرہ کی سرگرمیوں کو سنبھالے اور مرتب کرتے ہیں۔ 2015ء میں انہوں نے شی جن پنگ کے خصوصی نمائندے کے طور پر ماسکو کا دورہ کیا تھا۔ انہوں نے روس کے ساتھ چین کے مضبوط تعلقات برقرار رکھنے میں اہم کردار ادا کیا۔ مسٹر لی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ ایک ہنر مند منتظم ہیں، جنہوں نے گوئی زو صوبے میں دیگر علاقائی عہدوں کے علاوہ پارٹی سربراہ کے طور پر بھی خدمات سرانجام دیں۔ وہ 1980ء کی دہائی کے اوائل سے چینی صدر کے قریبی دوست رہے ہیں۔

63 سالہ مسٹر ہان جنگ اس وقت شنگھائی کے پارٹی باس ہیں۔ انہوں نے اپنے کیریئر کا زیادہ تر وقت چین کے مالیاتی دارالحکومت میں گزارا، جو شی جن پنگ کے ساتھ ساتھ کئی سابق رہنماؤں کے لیے بھی لانچنگ پیڈ رہا ہے۔ مسٹر ہان ایک تجربہ کار ٹیکنوکریٹ سمجھے جاتے ہیں۔ مسٹر ہان کو 2012ء میں پولٹ بیورو میں ترقی دی گئی۔ انہیں سابق رہنما جیانگ زیمن کی قیادت میں ''شنگھائی دھڑے'' کا حصہ سمجھا جاتا ہے۔ مسٹر ہان کے صدر شی جن پنگ کے ساتھ اچھے تعلقات ہیں۔

وانگ ہننگ کو شی جن پنگ کا اعلیٰ خارجہ پالیسی معاون تصور کیا جاتا ہے۔ ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ چین کے ہنری کسنجر ہیں۔ بیرون ملک دوروں کے دوران وہ شی جن پنگ کے وفد کا حصہ ہوتے ہیں۔ 61 سالہ وانگ پالیسی سازی کا وسیع تجربہ رکھتے ہیں اور مضبوط مرکزی قیادت کی وکالت کے لیے جانے جاتے ہے۔

چین میں سات رکنی پولٹ بیورو کی قائمہ کمیٹی میں ہونے والے اس ردوبدل کا سب سے نمایاں پہلو شی جن پنگ کے جانشین کی غیر موجودگی تھی۔ جیسا کہ ڈینگ ژیاؤ پنگ کے دور کے بعد سے معمول رہا ہے کہ ہر صدر اپنی دوسری مدت بھی پوری کرتا ہے۔ اس سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ شی جن پنگ کم از کم تب پیچھے ہٹنے کی طرف مائل نہیں تھے۔

''شی جن پنگ کی سوچ'' ممکنہ طور پر اگلی چند دہائیوں میں ملک کی رہنمائی کرے گی اور یہ

نیا اقدام چیئر مین ماؤ کے انتقال کے بعد سے اب تک کے دور میں ایک زندہ رہنما کے طور پر شی جن پنگ کو ایک بے مثال سطح پر لے گیا ہے۔ یہ تشکیلِ تصور (فارمولیشن) ان کے تصورات کو پارٹی کے آئین میں شامل کرنے کے لیے استعمال ہوئی تھی اور اس میں ایک انتباہ بھی تھا۔ اس فارمولیشن میں کہا گیا ہے کہ ''شی جن پنگ کے سوشلزم کے بارے میں خیالات نئے دور میں چینی خصوصیات کے ساتھ۔'' اس طرح آئین میں ایک براہ راست اندراج جیسا کہ ''شی جن پنگ کے خیالات'' نے انہیں چیئر مین ماؤ زے تنگ کے برابر لا کھڑا کیا ہوگا۔

واضح طور پر فیصلہ سازوں کی موجودہ کورنے لافانی سپریم لیڈر کے طور پر ماؤ کی حیثیت کو محفوظ رکھنے کا اہتمام کر دیا۔ ڈینگ ژیاؤ پنگ کا نام 'ڈینگ ژیاؤ پنگ کی تھیوری کے ساتھ منسلک ہونے کی وجہ سے بعد از مرگ بھی زندہ ہے۔ لہٰذا اشارہ یہ ہے کہ شی جن پنگ' جنہوں نے عصری چینی تاریخ میں ایک خاص مقام حاصل کر لیا ہے، پارٹی کی سب سے بڑی شخصیات کی درجہ بندی میں ماؤ کے بعد دوسرے نمبر ہیں لیکن رینکنگ میں ڈینگ سے آگے ہیں۔

کچھ مبصرین کے خیال میں اس اجلاس سے شی جن پنگ نے جو سب سے اہم چیز حاصل کی وہ شاید ان کا اعتماد تھا کیونکہ انہوں نے اجاگر کیا تھا کہ اگلے پندرہ سے تیس برسوں میں چین کو کیسے ایک بے مثال ترقی سے ہمکنار کیا جائے گا۔ یہ ترقی پارٹی کے رہنما کے ذریعے حاصل کی جانی ہے۔ (یعنی خود شی جن پنگ کے ذریعے) اور یہ کام سخت کنٹرول کے ذریعے ہی ممکن ہوسکتا ہے۔ اس کا ہدف چینی عوام کو ارض موعودہ تک پہنچانا تھا یعنی چین کو ترقی کی اس معراج تک پہنچانا جس کا چینی عوام سے وعدہ کیا گیا ہے۔

2017ء کے بعد سے شروع ہونے والی تین دہائیوں میں شی جن پنگ کا اعلان کردہ ترقی کا مشن خاصا حوصلہ مندانہ محسوس ہوتا ہے یعنی ماؤ اور ڈینگ کی ترقی کی طرف جاتی سوشلسٹ روڈ کا استعمال کرتے ہوئے 2050ء تک چین کو ایک جدید اور مضبوط ملک میں تبدیل کرنا ہے تاکہ یہ کسی سے پیچھے نہ ہو۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ نہ تو یہ مغربی معنوں میں جمہوری ہوگا اور نہ ہی یہ روایتی سرمایہ دارانہ معیشت والا ملک ہوگا۔ 'شی جن پنگ کے تصورات یا خیالات' کی سب نے تعریف کی۔ حکومت کے اندر سے اور حکومت کے باہر سے بھی ان کے تصور کی تحسین کی گئی۔ وزیر اعظم لی کی

چیا نگ نے اسے ''مارکسزم کو چینی سیاق وسباق میں ڈھالنے میں تازہ ترین کامیابی'' قرار دیا جبکہ سرکاری خبر رساں ادارے شنہوا نے اسے چین کا 'دستخطی نظریہ' قرار دیا جو جلد ہی سکولوں میں پڑھایا جائے گا۔شی جن پنگ کا فلسفہ فوج کو مضبوط بنانے کے سلسلے میں بھی رہنمائی کرے گا۔نئی گائیڈ لائنز کے بارے میں شنہوا نیوز ایجنسی کا کہنا ہے: ''فوج کو شی جن پنگ کے حکم پر عمل کرنا چاہیے، ان کے حکم کو تسلیم کرنا چاہئے اور انہیں کبھی فکر مند نہیں ہونے دینا چاہئے۔''

لیکن اس تبدیلی نے بیرون ملک خاص طور پر مغرب میں بہت سوں کو ناک بھوں چڑھانے پر مجبور کر دیا ہے۔دی اکانومسٹ نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا: ''اس عمل کے بڑے مضمرات ہو سکتے ہیں کیونکہ اس کے نتیجے میں شی جن پنگ کو ماؤزے تنگ کے بعد کسی بھی چینی حکمران سے زیادہ اختیارات مل گئے ہیں۔1976ء میں ماؤ کی وفات کے بعد سے اب تک شی جن پنگ پہلے زندہ رہنما ہیں جن کا نام پارٹی گائیڈ کے طور پر لیا گیا ہے۔ڈینگ ژیاؤ پنگ کا نام بھی آئین میں موجود ہے لیکن یہ محض ایک اعزاز تھا جو 1997ء میں ان کی وفات کے بعد انہیں دیا گیا۔چارٹر میں شی جن پنگ کے دو پیشروؤں کے نام شامل نہیں کئے گئے ہیں۔''

چینی حکام نے اس کے باوجود پولٹ بیورو کے نئے ارکان کا دفاع یہ کہہ کر کیا کہ پولٹ بیورو کمیٹی کے پانچ نئے ارکان میں سے صرف ایک لی جانشو کو صدر شی جن پنگ کا قریبی اتحادی یا ساتھی کہا جا سکتا ہے جبکہ باقی چار حریف دھڑے سے تعلق رکھتے تھے۔چینی حکام کا اصرار ہے کہ اس صورت حال نے شی جن پنگ کی وسیع البنیاد اور تمام مشمولات والی حکمت عملی پر عمل کی جستجو کو اجاگر کیا۔ البتہ ناقدین اسے چھوٹے گروپوں کے ذریعے پولٹ بیورو کے اختیارات پر سبقت لے جانے کی شی جن پنگ کی کوشش کے طور پر دیکھتے ہیں جیسے کہ غیر رسمی کمیٹیاں جو پارٹی اور حکومتی بیوروکریسی کو آپس میں منسلک کرتی ہیں۔

جس قسم کے جیو پولیٹیکل اور معاشی چیلنجز کا چین فی الوقت سامنا کر رہا ہے اس کے پیش نظر سیاسی لحاظ سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ جتنا ممکن ہو طاقت پر اثر و نفوذ برقرار رکھا جائے۔جیسا کہ فنکشنل جمہوریتوں میں ہوتا رہا ہے اور تازہ مثال امریکی سابق صدر ڈونلڈ ٹرمپ کی ہے جو اپنی بیٹی اور داماد سمیت غیر رسمی مشیروں سے بھی رہنمائی حاصل کرتے رہے۔ترک صدر رجب طیب اردوان

بھی بہت سے لوگوں پر انحصار کرتے ہیں جو رسمی طور پر اس کی حکومت کا حصہ نہیں ہیں۔ 19 ویں کانگریس کے موقع پر ایک نیا گانا بھی ریلیز کیا گیا جس کا عنوان تھا ''چیئر مین شی جن پنگ کے لیے ایک اچھا سپاہی بنو۔'' یہ گانا پیپلز آرمڈ پولیس، جو ملٹری کمیشن کے تحت پارلیمانی فورس ہے، کی جانب سے جاری کیا گیا۔

اس عمل نے ماؤ نواز روایت سے انحراف کی نشاندہی کی ہے۔ تقریباً نصف صدی پہلے فوج نے گایا تھا ''چیئر مین ماؤ کے لیے ایک اچھے سپاہی بنو' اور اب اس کے سپاہی شی جن پنگ کا گانا گائیں گے۔ صدر ملٹری کمیشن کے چیئر مین ہیں اور جوائنٹ فورسز بیٹل کمانڈ سینٹر کے کمانڈر ان چیف بھی ہیں۔ یہ دوسرا عہدہ 2016ء میں حاصل کیا گیا تھا۔ اس سے پہلے دہائیوں تک چین پر پارٹی کی اشرافیہ پولٹ بیورو کی قائمہ کمیٹی کی طرف سے ظاہری طور پر اجتماعی انداز میں حکومت کی جاتی رہی ہے لیکن شی جن پنگ نے تیزی سے مرکزی نظام حکومت اپنایا ہے اور اس طرح وہ انقلابی رہنما ماؤ زے تنگ کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کرتے نظر آ رہے ہیں۔

آگے کیا ہے؟

شی جن پنگ اپنے 'چائنا ڈریم' کو عملی شکل دینے اور اپنی مدت میں چین میں قومی تجدید لانے کے خواہش مند ہیں۔ وہ کمیونسٹ پارٹی آف چائنا (اور جدید چین) کی تاریخ میں ایک بھرپور کردار ادا کرنا چاہتے ہیں۔ ایک نپا تلا اندازہ یہ ہے کہ یہ سب کچھ ان کی اس خواہش کو پورا کرنے کے لیے کیا گیا ہے۔ ماؤ زے تنگ نے جو کیا یہ اس کے برابر کے بلکہ کچھ حوالوں سے اس سے بڑھ کر کئے گئے اقدامات ہیں۔

درحقیقت نئے چین کی جانب جاتی شاہراہ (The Road to Rejuvenation) ایک مستقل نمائش ہے جو بیجنگ کے تیان مین سکوائر میں چین کے قومی عجائب گھر میں منعقد کی گئی ہے۔ یہ پچھلی صدی میں چین کے مارچ کی کہانی ہے اور اس میں افیون کی جنگوں کا ذکر بھی آتا ہے۔ یہ سب کچھ نمائش میں جانے والوں کو کمیونسٹ پارٹی آف چائنا کے عروج اور 1949ء میں عوامی جمہوریہ چین کے قیام کی مختلف جہتوں سے روشناس کراتا اور پُرانے دور کے مختلف واقعات کی یاد

دلاتا ہے۔نومبر 2012ء میں شی جن پنگ نے ایک مثال قائم کرنے اور اپنے آئیڈیل کی اہمیت کو اجاگر کرنے کے لیے خودنمائش کا دورہ کیا تھا۔

زیادہ تر چینی شی جن پنگ کے ماؤزے تنگ اور ڈینگ ژیاؤ پنگ کے بعد چین میں حقیقی تبدیلی لانے والا لیڈر ہونے پر اتفاق کرتے ہیں۔ ماؤزے تنگ نے عوامی جمہوریہ چین قائم کیا تھا اور اپنی موت تک اس کو اکٹھا اور متحد رکھا تھا۔ ڈینگ ژیاؤ پنگ نے چین کو ترقی اور خوشحالی کی راہ پر گامزن کیا تھا۔شی جن پنگ اپنے روڈ اینڈ بیلٹ انیشی ایٹو کے ذریعے چین کو دنیا کے مرکز میں رکھنا چاہتے ہیں، تاہم زیادہ تر انحصار اس بات ہوگا کہ شی جن پنگ کے بیلٹ اینڈ روڈ انیشی ایٹو جیسے معروف پروجیکٹ اگلے چند برسوں میں کیا شکل اختیار کرتے ہیں۔ غیر ملکی تجربہ کار لوگوں میں بھی چین کی ترقی کی شاہراہ کے بارے میں بہت امید اور رجائیت پائی جاتی ہے۔

آسٹریلیا کے بیجنگ میں پہلے سفیر سٹیفن فٹز جیرالڈ سے جب یہ سوال پوچھا گیا کہ کیا ان کے خیال میں چین اپنے دوصد سالہ اہداف یعنی 2021ء تک ایک 'اعتدال پسند خوشحال' ملک بننا اور 2049ء تک ایک 'جدید سوشلسٹ ملک' جو خوشحال، مضبوط، جمہوری اور ثقافتی طور پر ترقی یافتہ، ہم آہنگ اور خوبصورت ہو، بن پائے گا تو انہوں نے جواب میں کہا'' کیا چین پہلے ہی ان اہداف تک پہنچ نہیں چکا ہے؟ چین نے خوشحالی کی منزل پالی۔ بڑھتے ہوئے متوسط طبقے کو دیکھیں۔ یہ ایک مکمل طور پر جدید سوشلسٹ ملک ہے۔چین پہلے ہی اس منزل تک پہنچ چکا ہے۔''

ان اہداف میں سے پہلا ہدف کافی حد تک حاصل کرلیا گیا ہے جبکہ دوسرے ہدف کے حصول کے لیے سفر کامیابی سے جاری ہے۔

صدر شی جن پنگ کی زندگی
تصاویر کے آئینے میں

شی جن پنگ اپنی بیٹی منگزہ کو کیریئر پر بٹھائے سائیکل چلا رہے ہیں، صوبہ فوجیان، شہر فوزہو، 2014ء

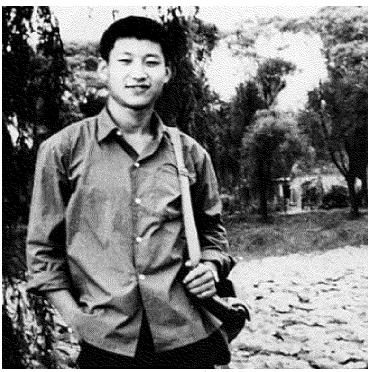

شی جن پنگ کی 1972ء کی ایک تصویر جب وہ شانشی صوبے کے ایک گاؤں (جہاں وہ کام کرتے تھے) سے بیجنگ میں اپنے والدین سے ملنے آئے تھے

شی جن پنگ (دائیں طرف) یونیورسٹی سٹوڈنٹ کے طور پر، 1977ء

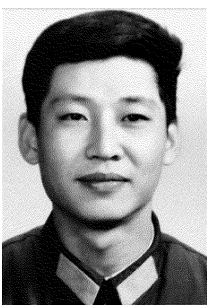

شی جن پنگ کی سنٹرل ملٹری کمیشن کے جنرل آفس میں کام کے دنوں میں لی گئی فوٹو، 1979ء

شی جن پنگ (بائیں طرف) زینگ ڈنگ کاؤنٹی کے پارٹی سیکرٹری کے طور پر، 1983ء

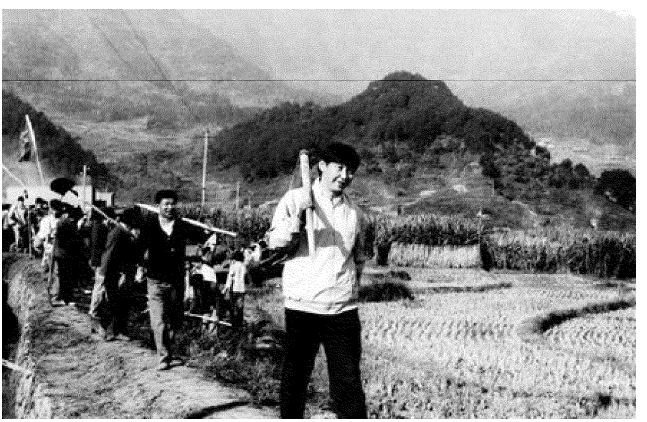

شی جن پنگ فوجیان صوبے میں ننگ وے پریفیکچرل پارٹی کمیٹی کے
سیکرٹری کے طور پر کام کرتے ہوئے، 1989ء

شی جن پنگ من ہاؤ کاؤنٹی میں دریائے منگ جیانگ کے مضافات میں سیلاب سے بچاؤ کے لیے جاری سرگرمی میں حصہ لیتے ہوئے، وہ اس وقت فوجیان صوبے میں فوز ہو میونسپل پارٹی کمیٹی کے سیکرٹری کے طور پر کام کر رہے تھے

شی جن پنگ اپنی بیگم، بیٹی اور والد کے ساتھ، فرصت کے لمحات

شی جن پنگ فروری 2012ء میں سٹیٹ آف لووا میں 27 سال پہلے بنائے گئے اپنے امریکی دوستوں کے ساتھ

چین: متفرق یادگار تصاویر

کمیونسٹ پارٹی میوزیم میں لگا سائن پوسٹ

کمیونسٹ پارٹی آف چائنا میوزیم: کمیونسٹ پارٹی آف چائنا کی ساتویں نیشنل کانگریس

کمیونسٹ پارٹی آف چائنا میوزیم: یان آن

کمیونسٹ پارٹی آف چائنا میوزیم: پارٹی کے بانی رہنماؤں کے مجسّمے

کمیونسٹ پارٹی آف چائنا میوزیم: مصنف امتیاز گل کنندہ کیے گئے ایک پتھر کے
سامنے جس پر لکھا ہے 'چین کے پاس ایک ماؤزے تنگ ہوتا تھا'

شانشی میں کمیونسٹ پارٹی آف چائنا کا میوزیم

شی جن پنگ کے گھر کا ایک منظر

کاشغر شہر کے ایک بازار کا منظر

کاشغر شہر کا ایک بازار

کاشغر شہر کی عیدگاہ مسجد

بین الاقوامی تجارت کے لیے کاشغر کا ویسٹرن اور سنٹرل ایشین بازار

پرانے کاشغر شہر کا ایک گھر

کاشغر میں میٹوک بازار

پرانے کاشغر شہر کی گلیاں

مصنف اور ان کی اہلیہ کاشغر میں ایک تاریخی مسجد کے سامنے

ماؤزے تنگ کے آبائی گھر کی نشست گاہ

ماؤزے تنگ کے گھر میں لگی ایک پرانی تصویر

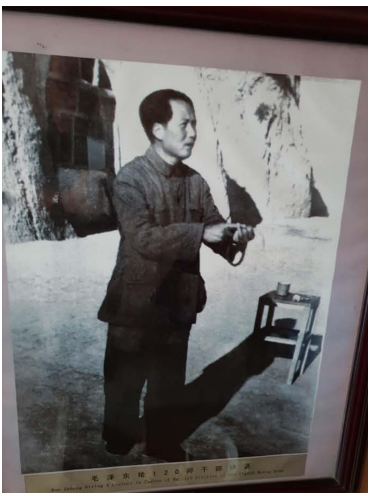

ماؤزے تنگ کے گھر میں لگی ماؤزے تنگ کی جوانی کی ایک تصویر

ماؤزے تنگ کی ایک سابق رہائش گاہ

شی جن پنگ کی کالج جانے سے پہلے قریبی دوستوں کے ساتھ ایک تصویر

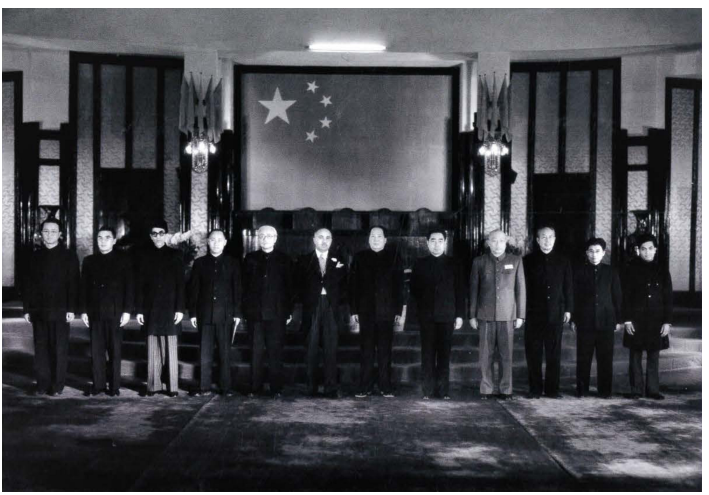

چین میں پاکستان کے پہلے سفیر جناب میجر جنرل این اے ایم رضا کی چیئرمین ماؤ کے ساتھ ایک تصویر

وزیراعظم حسین شہید سہروردی، وزیراعظم چواین لائی کے ساتھ، کراچی، دسمبر 1956ء

وزیر خارجہ ذوالفقار علی بھٹو، چیئرمین ماؤزے تنگ کے ساتھ، بیجنگ، مارچ 1963ء

وزیراعظم چواین لائی اسلام آباد میں ایک پودا لگاتے ہوئے، فروری 1964ء

صدر ایوب خان، وزیراعظم چواین لائی کے ساتھ، راولپنڈی، فروری 1964ء

صدر ایوب خان کی وزیر اعظم چواین لائی کے ساتھ عظیم دیوار چین پر لی گئی ایک تصویر، مارچ 1965ء

صدر ایوب خان چیئر مین ماؤ کے ساتھ، بیجنگ، مارچ 1965ء

صدر آغا محمد یحییٰ خان وزیر اعظم چواین لائی کے ساتھ، بیجنگ، نومبر 1970ء

وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو چیئرمین ماؤزے تنگ کے ساتھ، بیجنگ، مئی 1976ء

صدر غلام اسحٰق خان وزیراعظم لی پنگ کے ساتھ (وزیراعظم بےنظیر بھٹو ساتھ کھڑی ہیں) اسلام آباد، نومبر 1989ء

وزیراعظم بےنظیر بھٹو وزیراعظم لی پنگ کے ساتھ پاک چین معاہدے پر دستخط کی تقریب کے دوران، ستمبر 1995ء

صدر پرویز مشرف چینی نائب صدر ہوجن تاؤ کے ساتھ، بیجنگ، دسمبر 2001ء

وزیراعظم وین جیاباؤ اور وزیراعظم شوکت عزیز اسلام آباد میں پاک چین فرینڈ شپ سنٹر کے
سنگ بنیاد کے موقع پر، اپریل 2005ء

ایمبیسیڈر سلمان بشیر چینی نائب وزیر خارجہ وو دا وائے کے ساتھ مصافحہ کرتے ہوئے، جنوری 2006ء

قراقرم ہائی وے کی تعمیر کا ایک منظر

وزیراعظم محمد علی بوگرہ چینی وزیراعظم چواین لائی کے ساتھ، بینڈونگ، اپریل 1955ء

صدر ایوب خان چینی صدر لیوشاؤ کی کے ساتھ، اسلام آباد، مارچ 1966ء

وزیراعظم نواز شریف چینی صدر جیانگ زیمن کے ساتھ مصافحہ کرتے ہوئے، بیجنگ، مارچ 1991ء

جنرل پرویز مشرف کی چینی صدر جیانگ زیمن اور دوسرے حکام کے ساتھ گروپ فوٹو، دسمبر 2001ء

چیئرمین جوائنٹ چیف آف سٹاف کمیٹی جنرل احسان الحق چینی جنرل لیانگ گو ینگ لی کے ساتھ، بیجنگ، 2005ء

باب پنجم

شی جن پنگ کی کرپشن کے خلاف جنگ

تین 'NOs'

بدعنوانی کے خلاف چین کی مہم 'تین نہیں' میں لنگر انداز ہے۔

''ہمیں یہ یقینی بنانے کے لیے اقدامات کرنے چاہئیں کہ سرکاری حکام کے کرپشن میں ملوث ہونے کا کوئی ارادہ یا خواہش نہ رہے، انہیں ایسا کوئی موقع ملے نہ ہی ان میں کرپشن میں ملوث ہونے کی کوئی خواہش جاگے۔ یہ ساری الگ الگ کوششیں نہیں ہیں، بلکہ ایک مربوط کوشش ہے۔''

صدر شی جن پنگ، جو کمیونسٹ پارٹی آف چائنا کے جنرل سیکرٹری بھی ہیں، نے 19 ویں سنٹرل کمیشن فار ڈسپلن انسپیکشن (CCDI) کے تیسرے جامع اجلاس کے دوران اپنی تقریر میں اس نقطہ نظر کا خاکہ پیش کیا تھا۔ انہوں نے تینوں اجزا کو اس طرح جوڑا تھا: ''سخت سزا نافذ کرتے ہوئے اور ڈیٹرنس تخلیق کرتے ہوئے، ہمیں اداروں کے پنجرے کو مضبوط کرنا ہوگا تاکہ طاقت کے استعمال کو منظّم کیا جا سکے، اور سیاسی آگہی بڑھانے کے لیے پارٹی کی نوعیت کے بارے میں تعلیم کو مربوط کیا جا سکے۔''

اسی 'سی سی ڈی آئی' کے پانچویں منصوبہ بندی سیشن سے اپنے خطاب میں صدر نے بدعنوانی کی سرگرمیوں کے جاری رہنے کے بارے میں حکام کو خبردار کیا تھا۔ انہوں نے مزید کہا تھا کہ کرپشن کی پرانی اور نئی اقسام ایک دوسرے میں مدغم ہو چکی ہیں اور بدعنوانی تیزی سے پوشیدہ اور پیچیدہ ہوتی جا رہی ہے۔

انسدادِ بدعنوانی، اعداد وشمار کے حساب سے

لوکل ڈسپلن ایجنسیوں سے حاصل ہونے والے اعداد وشمار کے مطابق 9 اکتوبر 2020ء تک، تقریباً 270 اہلکاروں نے صوبہ یونان (Yunnan) میں نظم وضبط قائم رکھنے والی ایجنسیوں کے سامنے اعتراف جرم کیا تھا جبکہ اگست کے آخر تک 148 حکام نے سنکیانگ یغور خودمختار علاقے میں رضاکارانہ طور پر ہتھیار ڈالے تھے۔

جب سے صدر شی جن پنگ نے انسداد بدعنوانی کو اپنے پرائمری ایجنڈے میں تبدیل کیا ہے ملک کے سب سے اعلیٰ اینٹی گرافٹ واچ ڈاگز سی سی ڈی آئی اور نیشنل سپروائزری کمیشن (NSC) قوانین کی خلاف ورزی یا اختیارات کا غلط استعمال کرنے والوں کو سرزنش کرنے اور سزا دینے کے لیے مکمل طور پر مستعد اور سرگرم ہو چکے ہیں۔ مثال کے طور پر دونوں اداروں نے 2020ء کے پہلے صرف نو مہینوں میں نظم وضبط کی خلاف ورزیوں اور دیگر بدانتظامیوں کے مرتکب تقریباً 390000 افراد کے خلاف تعزیری کارروائیاں کی تھیں۔ 2019ء میں یہ تعداد 383000 کے لگ بھگ تھی۔ 2020ء میں سزا پانے والے افراد میں 18 صوبائی یا وزارتی سطح کے حکام بھی شامل تھے۔ اس کے علاوہ 2020 کے پہلے 11 مہینوں میں 1229 مفرور واپس لائے گئے اور بیرون ملک سے 2.45 بلین یوآن (378 ملین ڈالر) بازیافت کرائے گئے۔ جنوری 2021ء میں چین کی اعلیٰ اینٹی گرافٹ باڈی نے مرکز کے زیر انتظام سات اہلکاروں کو سزائیں سنائیں۔ ان پر رشوت لینے کا الزام لگایا گیا تھا۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ چین میں بدعنوانی کے خلاف جنگ سست نہیں پڑی بلکہ پوری تیزی سے جاری ہے۔

بدعنوانی کے بارے میں شی جن پنگ کی حساسیت کا سیاق وسباق

چین میں 1949ء کے انقلاب نے قوم پرست حکومت کا خاتمہ دیکھا۔ یہ سینکڑوں لاکھوں چینیوں کے لیے صدی کا سب سے اہم واقعہ تھا۔ اسی سال ایک سیکولر، جامع، لبرل چین کی بنیاد رکھی گئی، تاہم کمیونسٹ پارٹی آف چائنا کو بھی اس نئی جمہوریہ کے مرکز میں رکھا گیا، جس میں پارٹی

کے متعدد عہدیداروں اور پیپلز لبریشن آرمی کو بے لاگ طاقت دی گئی۔ اس طرح بااختیار بنانے کا ناقابل تغیر نتیجہ گورننس کی مختلف سطحوں پر ہمہ گیر کرپشن کی صورت میں نکلا۔ یہ انحطاط ڈینگ ژیاؤ پنگ کے سیاسی اور انتظامی اصلاحات والے دور میں بھی جاری رہا۔

ماضی میں ایک ابھرتے ہوئے رہنما کے طور پر شی جن پنگ کی توجہ نظام کو متاثر کرنے والی بدعنوانی کی سرگرمیوں پر مرکوز رہی۔ وہ کرپشن جو پارٹی کیڈرز کو متمول بنانے کا باعث بنی اور جس کی وجہ سے لوگوں میں ناراضگی پیدا ہوئی۔ اس صورت حال کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے شی جن پنگ نے اپنے کرپشن مخالف ایجنڈے کو اعلیٰ صفوں میں ابھرنے سے خاصا پہلے ہی آگے بڑھا دیا تھا۔ پارٹی کے سینٹرل کمیشن فار ڈسپلن انسپکشن کی کرپشن کے خلاف 2012ء میں شروع کی گئی مہم نے ان کے اس کے جذبے اور عزم کو مزید جلا بخشی، اور 2013ء میں ایک بار پھر مرکزی کمیٹی نے ایک تفصیلی ورک پلان جاری کیا۔ یہ ورک پلان سزا اور روک تھام، دونوں کے ذریعے بدعنوانی سے نمٹنے کے سلسلے میں ایک مکمل نظام قائم کرنے کے لیے تھا۔

آٹھ نکاتی ضابطہ

شی جن پنگ کے اقتدار سنبھالنے کے بعد 18 ویں پیپلز کانگریس میں کمیونسٹ پارٹی آف چائنا کے سیاسی بیورو نے ایک آٹھ نکاتی ضابطہ جاری کیا تھا، اس امر پر کہ آج کے بعد سرکاری اہلکار کس طرح کا رویہ اختیار کریں گے۔ وہ آٹھ نکات درج ذیل ہیں:

1: لیڈروں کو نچلی سطح تک قریبی رابطہ رکھنا چاہیے، لیکن کام معائنے کے دوروں یا رسمی انداز کے بغیر ہونا چاہیے۔

2: میٹنگز اور اہم تقریبات کو سختی سے منظّم اور مؤثر طریقے سے مرتب کیا جانا چاہیے۔

3: سرکاری دستاویزات کے اجرا کو کم کیا جائے گا۔

4: بیرون ملک سرکاری دوروں اور اس سے متعلقہ رسمی کارروائیوں کو محدود کیا جانا چاہیے۔

5: کار کے ذریعے سفر کرنے والے رہنماؤں کو ٹریفک میں خلل ڈالنے سے گریز کرنا چاہیے۔

6: سرکاری تقریبات کے بارے میں میڈیا کی رپورٹوں کو حقیقی خبروں کے ساتھ واقعات

تک محدود رہنا چاہیے۔

7: حکومتی رہنماؤں کو خود تصنیف کردہ مواد یا مبارکبادی خطوط شائع نہیں کرنے چاہئیں۔

8: لیڈروں کو کفایت شعاری اپنانی چاہیے اور رہائش اور کاروں سے متعلق ضوابط کی سختی سے پابندی کرنی چاہیے۔

یہ آٹھ نکات پوری پارٹی اور چینی معاشرے کے لیے ایک واضح اشارہ تھے۔ شی جن پنگ کے لیے اہم چیز بدعنوانی کو اس کے ابتدائی مرحلے میں روکنے اور اس پر قابو پانے کے لیے اقدامات کرنا تھا۔ ان کا یہ یقین تھا کہ کرپشن سے نمٹنے میں کوئی تاخیر زیادہ سنگین مسائل کا باعث بن سکتی ہے؛ چنانچہ ایسا نہیں ہونا چاہیے۔ چین کے اندر اور باہر سے بہت سے مبصرین اس ضابطے کو پڑھ کر حیران تھے، اور ان میں سے کچھ کا خیال تھا کہ یہ انسداد بدعنوانی مہم طاقت کی داخلی کشمکش کو روکنے کی کوشش کے سوا کچھ نہیں؛ البتہ اکثریت کا خیال تھا کہ شی جن پنگ کی کمیونسٹ پارٹی آف چائنا آخر کار کرپشن کی لعنت کو نہ صرف اپنے اندر سے بلکہ فوج اور بیوروکریسی کے اندر سے بھی جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کے لیے سنجیدہ ہے۔

اصلاحاتی پالیسی کے اعلان کے دو سال کے اندر، چین میں انسداد بدعنوانی کے مقدمات میں چار گنا اضافہ ہو گیا، جس سے کمیونسٹ پارٹی آف چائنا اور صدر شی جن پنگ کی طرف سے کئے گئے اقدامات کی سنجیدگی کی نشاندہی ہوئی تھی۔

بنیادی نظریہ

کمیونسٹ پارٹی آف چائنا کانگریس سے اپنے پنج سالہ خطاب کے دوران صدر شی جن پنگ نے کہا تھا، ''لوگ کرپشن کو سب سے زیادہ ناپسند کرتے ہیں، اور بدعنوانی ہماری پارٹی کو درپیش سب سے بڑا خطرہ ہے۔'' یہ بیان جدید چین میں انسدادِ بدعنوانی اور انسدادِ رشوت ستانی کی تمام تر کوششوں کا بنیادی نکتہ (Base Line) ہے۔

صدر شی جن پنگ کا خیال ہے کہ ''ہر سرکردہ عہدے دار کو پختہ سیاسی یقین، اپنا سیاسی موقف، اور سیاسی رجحان برقرار رکھنا چاہیے۔ یہ کام کرنے کے انداز کو بہتر بنانے اور کمیونسٹوں کی

بنیادی ضرورتوں کو پورا کرنے کی طرف پہلا قدم ہے۔ جیسا کہ ایک کہاوت ہے'وہ جو اچھا ہے یا پابندیوں کے تحت حکومت کر رہا ہے' اسے دوسروں کی نسبت پہلے خود کو پابند کرنا چاہیے۔' ہمیں بدعنوانی کا مضبوط عزم کے ساتھ مقابلہ کرنا چاہیے۔ جب ہم پتھروں پر چلتے ہیں یا لوہے پر گرفت کرتے ہیں تو نشان چھوڑ جاتے ہیں۔''

اس جذبے کو بالآخر ایک ویب سائٹ میں تبدیل کر دیا گیا تا کہ عوام کی اس حوالے سے حوصلہ افزائی کی جا سکے کہ وہ بیرون ملک فرار ہو چکے مشتبہ افراد کے بارے میں معلومات فراہم کریں؛ تاہم عوامی تجاویز طلب کرنے والی نئی ویب سائٹ صرف چینی زبان میں تھی۔ اس کے علاوہ چینی حکومت پبلک اور پرائیویٹ، دونوں سیکٹرز کیلئے جامع قانونی فریم ورک بھی پیش کرتی ہے تا کہ بدعنوانی کے کئی طریقوں کو جرم قرار دیا جا سکے، جیسے کوئی سہولت حاصل کرنے کیلئے رقم کی ادائیگی، منی لانڈرنگ اور فعال یا غیر فعال رشوت ستانی۔

صدر شی جن پنگ کا کہنا ہے کہ تعریف ان لوگوں کے لیے ہے جو'' پارٹی کے جذبے سے مکمل طور پر آگاہ ہیں اور جن میں اتنی جرأت ہے کہ اصول پر قائم رہ سکیں اور اپنی ملازمتوں کے لیے سازگار حالات پیدا کر سکیں۔ پارٹی ڈسپلن انسپیکشن کمیشنز اور سپرویژن ایجنسیوں کو ہر سطح پر دیانتدار اہلکاروں کا ایک دستہ ترتیب دینے اور ان کی کارکردگی کو بہتر بنانے کے لیے اپنی کوششیں تیز کرنی چاہئیں تا کہ بہتر معائنے اور نگرانی کو یقینی بنایا جا سکے۔''

صدر شی جن پنگ کی قیادت میں چین نے معاشرے کے تمام طبقات کے لیے احتساب کے ماڈل کو اپنایا ہے۔ اس ماڈل میں جنوبی ایشیا کے برعکس کسی فرد کا درجہ یا اثر و رسوخ کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ چین میں کرپشن کے خلاف یہ جنگ مقامی اور بین الاقوامی، دونوں سطح پر لڑی گئی۔ پانچ سال پہلے انسداد بدعنوانی مہم کا آغاز کرتے ہوئے کمیونسٹ پارٹی آف چائنا نے کھلے دل سے اعتراف کیا تھا کہ پارٹی کو درپیش خطرات میں کرپشن سب سے بڑا خطرہ ہے۔

انسداد بدعنوانی کے مقدمات اور کوششیں:

صدر شی جن پنگ نے کرپشن سے آہنی ہاتھوں سے نمٹنے کا وعدہ پورا کرنے کے سلسلے میں

ہمت اور عزم کا مظاہرہ کیا ہے۔ جب انہوں نے اقتدار سنبھالا تھا تو کمیونسٹ پارٹی آف چائنا کے اپنے ساتھی ممبران کو خبردار کیا تھا کہ بدعنوانی ایک مقامی بیماری ہے جو پارٹی کے ساتھ ساتھ ملک کو بھی کھا رہی ہے، اس لیے فوری طور پر اس سے نمٹا جانا چاہیے۔ انہوں نے اپنے ایک خطاب کے دوران اپنی پارٹی کے ارکان کو یہ کہہ کر پیشگی خبردار کر دیا تھا ''پارٹی کے اندر بہت سے دباؤ والے مسائل بھی ہیں جن کو حل کرنے کی ضرورت ہے، خاص طور پر بدعنوانی، عوام کی جانب سے مسترد کیا جانا، رسمی کارروائیوں سے گزرنا اور کچھ پارٹی عہدے داروں کی وجہ سے دفتری نظامِ حکومت، لہٰذا پوری پارٹی کو مکمل چوکنا رہنا چاہیے۔'' اس انتباہ کے فوراً بعد، پہلے ہائی پروفائل کیس میں جس اعلیٰ عہدیدار کو جوابدہ ہونا پڑا اس کا نام لی چن چنگ (Li Chuncheng)۔ وہ سیچوآن (Sichuan) صوبے میں کمیونسٹ پارٹی آف چائنا کا سابق سیکرٹری تھا۔ اس کی گرفتاری اور سزا نے اسے پہلا 'ٹائیگر' بنا دیا، جسے انسداد بدعنوانی مہم میں پکڑا گیا۔

'ٹائیگر' کی اصطلاح 2013ء میں شی جن پنگ کے ایک خطاب سے اخذ کی گئی تھی جس میں انہوں نے کہا تھا کہ ان کی انتظامیہ نے 'ٹائیگرز' اور 'فلائیز' دونوں کے خلاف کریک ڈاؤن کا عزم کیا ہے۔ یہاں ٹائیگرز اور فلائیز سے مراد طاقتور رہنما اور نچلے درجے کے بیوروکریٹس ہیں۔ ایسے ٹائیگرز کی دیگر بڑی مثالوں میں جو یونگ کانگ (Zhou Yongkang) شامل ہیں، جو کمیونسٹ پارٹی آف چائنا کے پولیٹیکل بیورو کی قائمہ کمیٹی کے سابق رکن تھے۔ باقی کچھ نام اس طرح ہیں: چونگ کنگ میونسپلٹی کے سابق پارٹی سربراہ بوشلائی (Bo Xilai)؛ دو سابق اعلیٰ جنرلز اور سینٹرل ملٹری کمیشن کے (دونوں) وائس چیئرمین شوئسائے ہو (Xu Caihou) اور بوشیونگ (Guo BoXiong)؛ چین کے اعلیٰ سیاسی مشاورتی ادارے کے سابق نائب چیئرمین لنگ جیہوا (Ling Jihua) اور سو رونگ (Su Rong)؛ چائنا انشورنس ریگولیٹری کمیشن کے سابق چیئرمین شیانگ جنبو (Xiang Junbo)۔ مزید یہ کہ ملک کی انسداد بدعنوانی مہم میں اتنے بدعنوان اہلکاروں کو پکڑا گیا کہ بیجنگ میں اشرافیہ کی جیلوں میں اب جگہ ختم ہو رہی ہے۔

صدر شی جن پنگ کی برسوں سے جاری سیاسی کرپشن کے خلاف جنگ کے ایک حصے کے طور پر ملک کے کرپشن واچ ڈاگ سی سی ڈی آئی نے 2015ء میں بیرونِ ملک کرپشن کے خلاف

لڑائی شروع کی اور 100 انتہائی مطلوب مفروروں کی فہرست جاری کی جن کو دو آپریشنز، فاکس ہنٹ اور سکائی نیٹ کے ذریعے واپس لانے کی کوشش کی گئی۔ بیجنگ نے اس سلسلے میں مغربی ممالک سے مدد لینے کے لیے بھی جدوجہد کی۔ بہت سے ممالک اس کے انسانی حقوق کے ناقص ریکارڈ اور کریمینل استغاثہ کے مبہم عمل کا حوالہ دیتے ہوئے چین کے ساتھ حوالگی کے معاہدے پر دستخط کرنے سے گریزاں رہے۔

ایک سال کے اندر اندر، جون 2018ء میں سی سی ڈی آئی نے دوسری بار ایک ''مطلوب'' فہرست جاری کی۔ اس فہرست میں پچھلی فہرست کے 22 ناموں کے مقابلے میں 50 نام تھے، یعنی پچھلی فہرست سے دوگنے سے بھی زیادہ۔ 23 افراد کی شناخت مشتبہ افراد کے طور پر کی گئی جو ممکنہ طور پر امریکہ فرار ہو گئے تھے جبکہ دیگر کینیڈا اور نیوزی لینڈ جیسے ممالک میں تھے۔ جن لوگوں کا نام لیا گیا ان میں زیادہ تر پر کرپشن، رشوت یا غبن کے الزامات تھے اور 21 کے بارے میں کہا گیا کہ وہ ایک دہائی سے زیادہ عرصے سے فرار ہیں۔ کمیشن نے مشتبہ افراد کی تصاویر اور نام فراہم کیے، اور ان کے مبینہ جرائم کی تفصیلات بھی۔ 22 مطلوب ملزمان میں سے 6 نے ہتھیار ڈال دیئے اور خود کو 90 سے زائد ممالک اور علاقوں سے پکڑے گئے 4141 مفرور ملزمان میں شامل کرا لیا، جن کو گرفتار کر لیا گیا تھا اور ان سے اپریل 2018ء کے آخر تک تقریباً 10 بلین یوآن (1.56 بلین امریکی ڈالر) بازیافت کئے گئے تھے۔

ہائی پروفائل سزائیں:

ماجیان (Ma Jian)

چین بھر سے متعدد مثالوں نے انتھک انسدادِ بدعنوانی مہم کو واضح کر دیا۔ ایک کیس میں دسمبر 2018ء میں لیاؤننگ صوبے میں ڈالیان انٹرمیڈیٹ پیپلز کورٹ نے چین کے ایک سابق جاسوس ماجیان کو کرپشن کے الزامات پر مجرم قرار دیا۔ اسے تاحیات قید کی سزا سنائی گئی۔ سزا ملنے کے بعد جیان کے سیاسی حقوق تاحیات سلب اور اس کے تمام نجی اثاثے ضبط کر لیے گئے تھے۔

یہ کیس اس وقت شروع ہوا تھا جب چین کی وزارت برائے ریاستی سلامتی کے سابق ڈپٹی ہیڈ ما جیان، کو 2015ء میں بدعنوانی کے الزام میں زیرِ تفتیش رکھا گیا اور اگلے سال کمیونسٹ پارٹی آف چائنا سے نکال دیا گیا تھا۔ 1999ء سے 2014ء تک، جیان نے چینی ارب پتی گووَ وینگوئی (Guo Wengui) کے کاروباری مفادات کو آگے بڑھانے میں اس کی مدد کے لیے وزارت میں اپنے عہدے کا استعمال کیا اور 109 ملین یوآن رشوت کے طور پر حاصل کئے تھے۔ عدالت کا کہنا ہے کہ کئی ایسے شواہد ملے جن سے ثابت ہوا کہ دونوں نے متعدد مواقع پر ایک دوسرے کے ساتھ ساز باز کی۔ مزید یہ کہ 2013ء میں جیان اپنے رشتے داروں کے ذریعے اندرونی تجارت میں مصروف رہا اور اس نے 49 ملین یوآن مالیت کا مال فروخت کیا۔ ریاستی رازوں کی وجہ سے اس کیس کی سماعت بند دروازوں کے پیچھے کی گئی۔

چو یونگ کانگ (Zhou Yongkang)

جیان کا زوال چین کے سکیورٹی آپریٹس میں دیگر شخصیات کی تحقیقات سے شروع ہوا تھا، خاص طور پر جو یونگ کانگ کے معاملات کی تفتیش سے۔ چو یونگ سکیورٹی کی وزارت کا ذمہ دار تھا اور ظاہر ہے اس وقت چین کے سب سے طاقتور آدمیوں میں سے ایک تھا۔ 2012ء میں وہ جیان کا باس تھا۔ یونگ کانگ کو اس کے ایک سال بعد صدر شی جن پنگ کی انسدادِ بدعنوانی کی بڑی مہم کے تحت زیرِ تفتیش رکھا گیا، اور اسے آخر کار عمر قید ہوگئی۔ وہ سب سے سینئر سیاستدان تھا جسے کرپشن کے الزامات کا سامنا کرنا پڑا۔ چین کی سرکاری خبر رساں ایجنسی شنہوا کے مطابق وہ رشوت ستانی، طاقت کے ناجائز استعمال اور بالقصد قومی راز افشا کرنے کا مرتکب پایا گیا تھا۔ سرکاری ٹی وی نے 72 سالہ چو کا ایک کلپ دکھایا جس میں تیانجن شہر میں بند کمرے میں مقدمے کی سماعت کے دوران وہ عذر پیش کر رہا تھا۔ جج کو جواب دیتے ہوئے اس نے کہا تھا کہ وہ اپیل نہیں کرے گا۔ اس نے کہا، ''میں نے پارٹی اور عوام کو جو نقصان پہنچایا مجھے اس کا احساس ہو گیا ہے، میں اعتراف جرم کرتا ہوں اور میں اپنے جرائم پر شرمندہ ہوں۔''

جنوری 2021ء میں چائنہ ڈیلی نے اس بات کی نشاندہی کی کہ حکام نے گورننس سٹرکچر

کے اندر کرپشن کے پھیلاؤ کو تسلیم کیا، اور اس کے خلاف لڑائی جاری رکھنے کا عزم ظاہر کیا ہے۔ اخبار نے لکھا ''ان سارے اقدامات کے باوجود بدعنوانی پارٹی ڈسپلن کے لیے ایک سنگین خطرہ بنی ہوئی ہے، اور بدعنوانی کے خلاف جنگ اب بھی مشکل اور پیچیدہ ہے، اس لیے حکام کو اس کی روک تھام کے لیے جدوجہد تیز کرنے کی ضرورت ہے تاکہ پرانے مسائل کو دوبارہ سر نہ اٹھانے دیا جائے اور نئے مسائل کو پیدا ہونے سے روکا جا سکے۔ اس کا مطلب ہے کہ بدعنوانی کے خلاف جنگ میں پارٹی کو جو فائدہ ہوا ہے، اسے مکمل فتح تک برقرار رکھا جانا چاہئے۔''

شن جنگ ٹسائے (Sun Zhengcai)

شن جنگ ٹسائے، جو ایک سابقہ سیاسی ہائی فلائر تھا، کبھی چین کی اگلی نسل کے رہنماؤں میں سے ایک تصور کیا جاتا تھا۔ اسے مئی 2018ء میں رشوت خوری کے جرم میں عمر قید کی سزا سنائی گئی۔ شن جنگ ٹسائے کا زوال بوشیلائی کے بعد شروع ہوا۔ شیلائی چونگ چنگ میں پارٹی سربراہ کے طور پر سن کے پیشرو تھے۔ سن، جو پولٹ بیورو کا ایک سابق رکن تھا، براہ راست یا نامزد تیسرے فریق کے ذریعے رشوت میں 170 ملین یوآن (26.7 ملین امریکی ڈالر) لینے پر مجرم قرار دیا گیا تھا۔

54 سالہ شن جنگ ٹسائے کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ وہ ترقی کر کے پولٹ بیورو کی ایلیٹ سات رکنی سٹینڈنگ کمیٹی کا رکن بن جائے گا، جو ملک پر حکومت کرتی ہے۔ جرم ثابت ہونے پر شین جنگ ٹسائے سے زندگی بھر کے لیے ان کے سیاسی حقوق چھین لیے گئے جبکہ اس کی جائیداد اور ناجائز منافع ضبط کر لیا گیا تھا۔ سن زینگ کائی سخت احتساب کی ایک مثال ہے۔ کچھ حلقے سب سے کم عمر پولٹ بیورو ممبر کے طور پر شن جنگ ٹسائے کو شی جن پنگ کے ممکنہ جانشین کے طور پر دیکھ رہے تھے۔

ایک بیان میں بتایا گیا کہ قید کی سزا کے علاوہ، شن جنگ ٹسائے کی چوری کی گئی جائیداد پہلے ہی ضبط کر لی گئی تھی۔ عدالت کی ویب سائٹ پر پوسٹ کی گئی ایک تصویر میں سابق رہنما کو دکھایا گیا ہے جس میں وہ عدالت میں ملزموں کے بیٹھنے کی جگہ پر سر جھکائے بیٹھا ہے جبکہ دو پولیس افسران اسے دیکھ رہے ہیں۔ عدالت کے مطابق سن نے 'مخلصانہ توبہ' کا اظہار کیا۔ اس نے کہا کہ وہ سزا کو قبول کرتا ہے اور اس کے خلاف اپیل نہیں کرے گا۔ عدالت نے کہا کہ تحقیقات میں کئے گئے

رضامندانہ تعاون کی روشنی میں مجرم کو نرم سزا سنائی گئی ہے۔

یانگ شیوجو (Yang Xiuzhu)

شن جنگ ٹسائے کی سزا سے کئی ماہ پہلے زی جیانگ صوبے میں ہانگزو انٹرمیڈیٹ پیپلز کورٹ نے چین کے انتہائی مطلوب مفرور کو آٹھ سال قید کی سزا سنائی تھی۔ 71 سالہ یانگ شیوجو بدعنوانی اور رشوت لینے کا مجرم پایا اور اس پر 800000 یوآن (121000 امریکی ڈالر) جرمانہ عائد کیا گیا۔ سزا سنانے کا یہ فیصلہ بدعنوان عہدیداروں کے خلاف ہائی پروفائل ٹرائلز کی لہر کے دوران آیا جنہیں بڑی مہموں کے ذریعے بیرون ملک سے وطن واپس لایا گیا تھا۔ اس آپریشنز کو آپریشن فاکس ہنٹ اور آپریشن سکائی نیٹ کا نام دیا گیا تھا۔ یہ آپریشن 2014ء میں صدر شی جن پنگ کی بدعنوانی کے خلاف سویپنگ مہم کے ایک حصے کے طور پر شروع کیا گیا تھا۔

ووشیاؤہوئی (Wu Xiaohui)

ایک اور ہائی پروفائل کیس میں، Anbang انشورنس گروپ کے چیئرمین اور جنرل منیجر ووشیاؤہوئی کو دھوکہ دہی اور کارپوریٹ پیسے کے غبن کے جرم میں اٹھارہ سال قید کی سزا سنائی گئی۔ سزا کا اعلان چین میں شنگھائی میونسپل نمبر 1 انٹرمیڈیٹ پیپلز کورٹ کی طرف سے کیا گیا تھا۔ ووشیاؤہوئی کو جیل کی سزا بھگتنے کے ساتھ ساتھ اپنی 1.7 بلین ڈالر مالیت کی جائیداد سے بھی محروم ہونا پڑا۔

18 ویں سیکنڈ پلینری سیشن میں پارٹی کی کامیابیوں کی تصدیق کرتے ہوئے صدر شی جن پنگ نے اپنی ایک تقریر میں کہا تھا، ''پچھلے 30 سالوں سے، جب سے اصلاحات اور اوپننگ اپ پالیسی متعارف کرائی گئی ہے، پارٹی کی دوسری اور تیسری مرکزی قیادت جس میں ڈینگ ژیاؤپنگ اور جیانگ زیمن اپنی متعلقہ کورز میں اور پارٹی کی مرکزی کمیٹی جنرل سیکرٹری ہوجن تاؤ کے ساتھ مل کر مسلسل پارٹی کے طرز عمل کو بہتر بنانے، سالمیت کو برقرار رکھنے اور کرپشن کے خلاف جنگ کو اہمیت دے رہی ہے۔ یہ تاریخی حکمت بدعنوانی سے نمٹنے کے سلسلے میں ہمارے لیے بہتر کام مدد کر سکتی ہے۔ مارکس ازم-لینن ازم، ماؤزے تنگ کی سوچ اور چینی خصوصیات والے سوشل ازم کی تھیوریوں کے

نظام، ایک ٹھوس عالمی نظریہ وضع کرنے، طاقت اور کیریئر پر ایک صحت مندانہ نقطہ نظر قائم کرنے اور عزت و ذلت کے سوشلسٹ اصولوں کے ماڈل پر یکٹیشنرز بننے کے سلسلے میں ہمیں ان کی رہنمائی کرنی چاہیے۔''

تمام ریاستی اداروں سے بدعنوانی کا خاتمہ

صدر شی جن پنگ نے نہ صرف سی پی سی سے، بلکہ فوج اور بیوروکریسی سے بھی کرپشن کے مکمل خاتمے کا عزم کر رکھا ہے۔ مزید اہم بات یہ ہے کہ جنوبی چین کے ایک صبح کے اخبار کی ایک نیوز رپورٹ میں یہ لکھا گیا ہے کہ صدر شی جن پنگ کی انسدادِ بدعنوانی مہم نے 'بیسویں صدی کی جنگوں کی نسبت زیادہ جرنیلوں کو' اپنی لپیٹ میں لیا ہے۔ چین کے سرکاری اعداد و شمار کے مطابق صدر شی جن پنگ کی انسدادِ رشوت ستانی مہم کے تحت اب تک 100 سے زائد ہائی پروفائل فوجی اہلکاروں کو سزائیں دی جا چکی ہیں۔ چینی حکومت نے 2020ء کے صرف ایک سال میں انتظامی طور پر تقریباً 85000 اہلکاروں کو سزائیں دیں جبکہ پارٹی کے 502000 اہلکاروں کو ملنے والی سزائیں اس کے علاوہ ہیں۔

ایک اہم شعبہ، جہاں اصلاحات نے چین کی انسدادِ بدعنوانی کی کوششوں میں مدد کی ہے، مرکزی اور مقامی حکومتوں کے درمیان ٹیکس محصولات کی غیر مساوی تقسیم بھی ہے کیونکہ اس نے اقتدار کے اہم عہدوں پر فائز افراد کے لیے رشوت یا بے جا مراعات طلب کرنے کا راستہ کھول دیا ہے۔ چینی قیادت کی نظر میں بدعنوانی کی ایک اور بنیادی وجہ غیر رجسٹرڈ غیر سرکاری تنظیمیں (این جی اوز) ہیں۔ وہ ان این جی اوز کو ایک طاقتور دشمن کے طور پر دیکھتی ہے جو حکومت مخالف ایجنڈے پر کام کر رہا ہے۔ اس وقت چین میں این جی اوز کی تعداد تقریباً 3 ملین ہے اور ان میں سے 20 فیصد سے بھی کم، تقریباً 450000، قانونی طور پر رجسٹرڈ ہیں۔

صدر شی جن پنگ کہتے ہیں ''ہمارے ملک کو پارٹی طرزِ عمل کو بہتر بنانے، ملکی سالمیت کو برقرار رکھنے اور کرپشن کا مقابلہ کرنے جیسی طویل مدتی، پیچیدہ اور مشکل ذمہ داریوں کا سامنا ہے۔ ہم نے شیروں کو پکڑا ہے اور مکھیوں پر قابو پایا ہے اور اس طرح بدعنوان حکام کے خلاف سخت موقف

برقرار رکھا ہے۔ ہر اہلکار کو درج ذیل بات ذہن نشین کر لینی چاہئے: عوام کے خزانے پر ہاتھ صاف کرنے کی کوشش نہ کرنا کیونکہ چوری کرتا ہوا ہاتھ یقینی طور پر پکڑا جائے گا۔ حکام کو بدعنوانی کی سزا سے بچ جانے کی امید پر قسمت آزمانے کے بجائے پارٹی ڈسپلن اور ریاست کے قوانین کے خوف میں رہنا چاہئے۔''

سوشل کریڈٹ

لوگوں کو اخلاص کی مثالی تصویر کی طرف راغب کرنے کے حوالے سے صدر شی جن پنگ کی قیادت میں چینی حکومت نے عوام میں اعتماد کو فروغ دینے کے لیے 'گاجر اور چھڑی' کا طریقہ اختیار کیا ہے۔ اعتماد پیدا کرنے کے لیے استعمال ہونے والا ایک نیا ٹول سماجی کریڈٹ کے نام سے جانا جاتا ہے۔ 2020ء تک حکومت نے ایک ایسے نظام کو یقینی بنایا جس میں اعتماد برقرار رکھنے والے ہر طرح سے فوائد حاصل کرتے اور خلاف ورزی کرنے والوں کو ہر قدم پر مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ اس سسٹم کا مقصد ہر شہری کے لیے اس کی امانت کی بنیاد پر سکور بنانا ہے۔

بین الاقوامی اور داخلی تعریف

چین کے انسداد بدعنوانی کے اقدامات کا بیرون ملک بھی خاصا احترام کیا گیا ہے۔ گلوبل آرگنائزیشن آف پارلیمنٹیرینز اگینسٹ کرپشن (GOPAC) کے صدر فادلی زون (Fadli Zon)، کہتے ہیں کہ چینی حکومت کی طرف سے کئے گئے انسدادِ بدعنوانی کے مختلف اقدامات کا بین الاقوامی برادری میں تاثر نہایت مثبت ہے۔ انہوں نے کہا، ''ہم نے بدعنوانی سے نمٹنے کے سلسلے میں چینی مثالوں کی واقعی تعریف کی۔'' مزید یہ کہ یہ ماڈل پاکستان جیسے ممالک کے لیے بھی ایک اچھی مثال پیش کرتا ہے، جہاں معاشرے کے امیر اور بااثر افراد اکثر احتساب سے بچ جاتے ہیں۔ چین میں بلا امتیاز احتساب نے قانون کی بالادستی کو بھی یقینی بنایا ہے۔ اس طرح اس عمل نے صدر شی جن پنگ کے تحت معاشی ترقی کے لیے ایک عمل انگیز کے طور پر بھی کام کیا ہے۔

ان کوششوں سے صدر شی جن پنگ کو چینی عوام میں مزید مقبولیت حاصل کرنے میں بھی

مدد ملی ہے۔ چینی میڈیا کے مطابق 2017ء میں اعلیٰ سرکاری عہدیداروں کے خلاف مزید مقدمات کی سماعت کے تناظر میں عوام کے اطمینان کی سطح 94 فیصد تک بڑھ گئی تھی۔ عوام میں بڑھتے ہوئے اعتماد کے ساتھ بھی صدر نے اس پالیسی پر قائم رہنے کا عزم کیا اور ملک سے بدعنوانی کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کے لیے مزید اقدامات کئے۔

18 اکتوبر 2017ء کو کمیونسٹ پارٹی آف چائنا کی 19 ویں قومی کانگریس سے اپنے خطاب میں صدر شی جن پنگ نے اس عزم کا اعادہ کیا، ''ہم نے 'شیروں کو نکالنے'، 'مکھیوں کو کچلنے'، اور 'لومڑیوں کو مار گرانے' کے لیے سخت کارروائی کی ہے۔ بدعنوانی کے خلاف ایک ڈیٹرنس پیدا کرنے کا ہدف آغاز میں ہی حاصل کر لیا گیا۔ کرپشن کو روکنے والے اداروں کا پنجرہ مضبوط کیا گیا ہے۔ بدعنوانی کے خلاف اخلاقی مورچے قائم کئے جا رہے ہیں۔ بدعنوانی کے خلاف مہم ایک تباہ کن لہر میں تبدیل ہو چکی ہے اور اسے مزید مضبوط کیا جا رہا ہے۔''

شی جن پنگ کے نقطہ نظر پر تنقید

اگرچہ صدر شی جن پنگ کی قیادت میں چین کی انسدادِ بدعنوانی مہم نے متناسب کامیابی حاصل کی ہے پھر بھی اس بارے میں متضاد خیالات موجود ہیں کہ کمیونسٹ پارٹی آف چائنا کو اس مہم کو کیسے چلانا چاہئے۔ صدارتی مدت کی حد کو ختم کیا جا چکا ہے اور اب شی جن پنگ غیر معینہ مدت کے لیے ملک اور پارٹی کے سربراہ برقرار رہ سکتے ہیں۔ پیراڈائم فاؤنڈیشن کے ایگزیکٹو ڈائریکٹر شیوسین پور (Shiu Sin Por) کا خیال ہے کہ چین کو کامیابی کے لیے کم از کم ایک دہائی تک شی جن پنگ کی ضرورت ہے۔ شیوسین پور کا یہ بھی ماننا ہے کہ ٹرم کی حد ختم کرنے کے فیصلے پر کی جانے والی تنقید خوف و ہراس پھیلانے اور اختلاف اور انتشار کے بیج بونے کی کوشش سے کم نہیں۔ وہ کہتے ہیں ''پارٹی کے جنرل سیکرٹری اور مرکزی فوجی کمیشن کے چیئرمین، جو چین کے سیاسی ڈھانچے میں سب سے زیادہ طاقتور عہدے ہیں، دونوں کے لیے مدت کی کوئی حد نہیں ہے۔ شی جن پنگ کے پاس اس وقت یہ دونوں عہدے ہیں۔ صدارت بنیادی طور پر ایک رسمی عہدہ ہے۔ شی جن پنگ کو اپنی طاقت بڑھانے کے لیے اس نظام میں تبدیلی کی ضرورت نہیں ہے۔ انہیں گزشتہ برس پہلے ہی پارٹی کا

مرکزی لیڈر قرار دیا جا چکا ہے۔ انہیں تا حیات برسر اقتدار رہنے کے لیے بھی کسی تبدیلی کی ضرورت نہیں ہے۔''

تاہم صدر شی جن پنگ جس طرح کے اقدامات کر رہے ہیں اور پالیسیاں اپنا رہے ہیں، ان کے تناظر میں لازم ہے کہ ان پر مغرب اور لبرل جمہوریتوں کی جانب سے یہ تنقید کی جائے کہ وہ خود کو 'ایک آمرانہ لیڈر کے طور پر مضبوط کر رہے ہیں' تاہم اس طرح کی تنقید چینی معاشرے اور چینیوں کے گورننس کے ماڈل کے ساتھ مطابقت نہیں رکھتی۔ اہم بات یہ ہے کہ آیا شی جن پنگ انسداد بدعنوانی مہم کو منطقی انجام تک پہنچانے میں کامیاب ہوتے ہیں، قطع نظر اس کے کہ شی جن پنگ اور کمیونسٹ پارٹی آف چائنا، دونوں گورننس کا کون سا ماڈل اپناتے ہیں۔ اس طرح کی انسدادِ بدعنوانی مہم سیاسی حریفوں کے خلاف جانبداری کا تاثر دے سکتی ہے، لیکن چینیوں کی طرف سے جاری کئے گئے حقائق اور اعداد و شمار، جن میں بتایا گیا ہے کہ بدعنوان اہلکاروں سے اربوں ڈالر برآمد کرائے گئے، یہ واضح کرتے ہیں کہ ملک کی انسدادِ بدعنوانی مہم میں اب تک کافی پیشرفت ہو چکی ہے۔

مزید یہ کہ اینٹی گرافٹ مہم جنوبی ایشیا کے ممالک، خصوصاً پاکستان، کے لیے گورننس اور قانون کی حکمرانی کا ایک ماڈل بھی پیش کرتا ہے، جہاں بااثر سیاسی رہنما، بیوروکریٹس اور فوجی افسران اپنی مالی بدعنوانیوں پر اکثر احتساب اور سزا سے بچ جاتے ہیں۔

باب ششم

چین کے عالمی پاور ہاؤس بننے کی کہانی

''ہم چینی یہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ خوش حالی اور آسودگی کی منزل تک پہنچنے کے لیے کیا کرنا ہوتا ہے؛ چنانچہ ہم دوسروں کی کامیابیوں کی تعریف کرتے ہیں اور ان کے لیے بہتر مستقبل کی دعا کرتے ہیں۔ ہم دوسروں کی کامیابیوں سے حسد نہیں کرتے اور ہم ان کی بھی شکایت نہیں کریں گے جنھوں نے فائدہ اٹھایا۔ ہم انہیں چین کی ترقی کی ایکسپریس ٹرین میں سوار ہونے پر خوش آمدید کہیں گے۔''

(ورلڈ اکنامک فورم 2017ء میں چین کے معاشی ارتقا، اس کے دنیا کی دوسری بڑی معیشت بننے اور اس حوالے سے سیکھے گئے اسباق پر صدر شی جن پنگ کا اظہارِ خیال)

چین کی عالمی پارٹنرشپ:

سال 2013ء چین کے لیے ایک اہم فلیش پوائنٹ بن گیا کیونکہ اس سال صدر شی جن پنگ نے علاقائی اور عالمی پارٹنرز کے لیے ایک نئے وژن کا اعلان کیا تھا۔ اکتوبر 2013ء میں 'پڑوسی ممالک کے ساتھ ڈپلومیٹک ورک' کے موضوع پر ایک اہم کلیدی خطاب میں صدر شی جن پنگ نے کہا تھا کہ چین کو ''متعلقہ ممالک کے ساتھ انفراسٹرکچر تعاون بڑھانے اور اکیسویں صدی کی سلک روڈ اکنامک بیلٹ اور میری ٹائم سلک روڈ کی تعمیر کے لیے مشترکہ کوششیں کرنی چاہئیں۔''

چین کا نیا عالمی نقطۂ نظر 'ایک نئے دور کے لیے چینی خصوصیات والے سوشلزم پر شی جن پنگ کے تفکر' کا حصہ ہے۔ یہ سوچ آٹھ مسائل، چودہ رہنما اصولوں اور عالمگیریت پر دس نکات کو

اپنے اندر سمیٹے اور سموئے ہوئے ہے۔

آٹھ بنیادی مسائل:

☆ صدر شی جن پنگ کی سوچ یہ واضح کرتی ہے کہ چینی خصوصیات والے ترقی پذیر سوشلزم کو برقرار رکھنے کا بنیادی مقصد سوشلسٹ جدیدیت اور قومی فعالیت کا احساس اجاگر کرنا ہے۔ ہر لحاظ سے ایک اعتدال پسند، خوشحال معاشرہ تشکیل دینے کے لیے دو مرحلوں والا طریقہ اختیار کیا جانا چاہیے۔ چین کو رواں صدی کے وسط تک ایک عظیم، جدید سوشلسٹ ملک، جو خوشحال، مضبوط، جمہوری، ثقافتی طور پر ترقی یافتہ، ہم آہنگ اور خوبصورت ہو، بنانے کا یہی راستہ ہے۔

☆ ان کی سوچ واضح کرتی ہے کہ نئے دور میں چینی معاشرے کو جس بنیادی تضاد کا سامنا ہے وہ غیر متوازن و ناکافی ترقی اور بہتر زندگی کے لیے لوگوں کی بڑھتی ہوئی ضروریات کے مابین ہے۔ یہ سوچ ترقی کے عوام پر مرتکز فلسفے، ایک مکمل و متناسب انسانی ترقی اور سب کے لیے عام خوشحالی پر زور دیتی ہے۔

☆ یہ واضح کرتی ہے کہ چینی خصوصیات والے سوشلزم کی عمارت تعمیر کرنے کا منصوبہ مجموعی طور پر پانچ پرتوں پر محیط ہے اور مجموعی حکمت عملی چار جہتی جامع حکمت عملی ہے۔ یہ سوچ طریقِ کار، نظریے، نظام اور چینی خصوصیات والے سوشلزم کی ثقافت پر اعتماد کو فروغ دینے کی اہمیت کو اجاگر کرتی ہے۔

☆ یہ واضح کرتی ہے کہ گہری اصلاحات کا مجموعی مقصد ہر شعبے میں چینی خصوصیات والے سوشلزم کے نظام کو ترقی دینا، چینی نظام کو جدید بنانا اور حکمرانی کی صلاحیت بہتر بنانا ہے۔

☆ یہ سوچ واضح کرتی ہے کہ قانون پر مبنی گورننس کو جامع طور پر آگے بڑھانے کا ہمہ جہت مقصد چینی خصوصیات والے سوشلسٹ قانون کی حکمرانی کا نظام قائم کرنا اور چین کو سوشلسٹ قانون کی حکمرانی والا ملک بنانا ہے۔

☆ ان کی سوچ یہ واضح کرتی ہے کہ پارٹی کا نئے دور میں ایک مضبوط فوج مرتب کرنے کا مقصد عوامی قوتوں کو عالمی معیار کی ایسی قوتوں میں تبدیل کرنا ہے جو پارٹی کے حکم کی تعمیل کریں، جو لڑ

سکیں اور جیت سکیں اور جو بہترین طرزِ عمل کو برقرار رکھ سکیں۔

☆ سوچ یہ واضح کرتی ہے کہ بڑے ملک کی چینی خصوصیات والی سفارت کاری کا مقصد ایک نئی قسم کے بین الاقوامی تعلقات کو فروغ دینا اور بنی نوع انسان کے مشترکہ مستقبل کے لیے کمیونٹی تشکیل دینا ہے۔

☆ سوچ یہ واضح کرتی ہے کہ کمیونسٹ پارٹی آف چائنا کی قیادت چینی خصوصیات والے سوشلزم کے خدوخال مرتب کر رہی ہے اور اس امر کا تعین بھی کہ چینی خصوصیات والے سوشلزم کی سب سے بڑی طاقت کیا ہے، سیاسی لیڈرشپ کے لیے پارٹی سب سے بڑی طاقت ہے۔ صدر جن پنگ کی سوچ سیاسی قیادت کے لیے یہ تعین کرتی ہے کہ نئے دور میں پارٹی کی تعمیر کے عمومی تقاضے کیا ہیں۔ یہ سوچ پارٹی بلڈنگ میں سیاسی معاملات کی اہمیت کو بھی اجاگر کرتی ہے۔

چودہ بنیادی رہنما اصول

☆ پارٹی کی قیادت کی ہر طرح کے کام سے آگاہی یقینی بنانا۔
☆ ایسے نقطہ نظر کا عزم کرنا جس میں عوام کو مرکزی حیثیت حاصل ہو۔
☆ اصلاحات کو جامع طور پر آگے بڑھانے کا عمل جاری رکھنا۔
☆ ترقی کے لیے ایک نیا وژن اپنانا۔
☆ یہ مشاہدہ کرنا کہ عوام ہی ملک چلاتے ہیں۔
☆ اس بات کو یقینی بنانا کہ حکمرانی کی ہر جہت قانون پر مبنی ہو۔
☆ بنیادی سوشلسٹ اقدار کو برقرار رکھنا۔
☆ ترقی اور تعمیر کے ذریعے معیارِ زندگی کو یقینی اور بہتر بنانا۔
☆ انسانوں اور فطرت کے مابین ہم آہنگی کو یقینی بنانا۔
☆ قومی سلامتی کے لیے ایک جامع نقطہ نظر کو اپنانا۔
☆ عوامی فورسز پر پارٹی کی مکمل قیادت کو برقرار رکھنا۔
☆ ''ایک ملک، دو نظام'' کے اصول کو برقرار رکھنا اور قومی اتحادِ نو کو فروغ دینا۔

☆ انسانیت کے لیے مشترکہ مستقبل والی کمیونٹی کی تعمیر کو فروغ دینا۔
☆ پارٹی پر مکمل اور سخت گورننس کا استعمال جاری رکھنا۔

عالمی سفارتکاری پر دس نکات:

☆ کمیونسٹ پارٹی آف چائنا کی مرکزی کمیٹی کے اختیارات کو بنیادی اصول کے طور پر برقرار رکھنا اور بیرونی کام پر پارٹی کی متحد و مرتکز قیادت کو مضبوط کرنا۔

☆ چینی خصوصیات کے ساتھ ملک کی بنیادی سفارت کاری کو آگے بڑھانا تاکہ قومی فعالیت کا احساس اجاگر کرنے کے مشن کو پورا کیا جا سکے۔

☆ عالمی امن کے تحفظ اور مشترکہ ترقی کی پیروی کو ایک ایسی کمیونٹی کی تشکیل کے عمل کو آگے بڑھانے کے طور پر لینا جس کا مقصد انسانیت کے مشترکہ مستقبل کو یقینی بنانا ہو۔

☆ چینی خصوصیات والے سوشلزم کے ساتھ تزویراتی اعتماد کو سپورٹ کے طور پر بڑھانا۔

☆ بیلٹ اینڈ روڈ کی تعمیر کو مشترکہ ترقی حاصل کرنے کے اصول کے تحت بات چیت اور تعاون کے ذریعے آگے بڑھانا۔

☆ سب کے لیے مفید اور باہمی احترام کے اصول کی بنیاد پر پرامن ترقی کی راہ پر چلنا۔

☆ سفارتی ایجنڈے کو آگے بڑھاتے ہوئے عالمی شراکت داری کو فروغ دینا۔

☆ غیر جانب داری اور انصاف کے تصور کے تحت عالمی گورننس سسٹم میں اصلاحات کی قیادت کرنا۔

☆ چین کی خود مختاری، سلامتی اور ترقیاتی مفادات کے تحفظ کے لیے قومی بنیادی مفادات کو ایک حقیقت کے طور پر تسلیم کرنا۔

☆ بیرونی کام کی عمدہ روایت اور زمانوں کی خصوصیات کو یکجا کر کے چینی سفارت کاری کے مخصوص انداز کی پرورش کرنا۔

2013ء میں صدر کا عہدہ سنبھالنے کے بعد سے شی جن پنگ نے ان علاقائی اور عالمی ریاستوں کے بارے میں ہمیشہ ہی مثبت رویہ برقرار رکھا ہے جو امن اور اقتصادی ترقی پر زور دیتی

ہیں۔ امریکہ کے لیے بھی صدر شی جن پنگ کی کوششیں تعمیری تھیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ایشیا پیسیفک کا خطہ 'تمام ممالک کے لیے اتنا بڑا تھا کہ وہ ترقی کرتے'۔ شی جن پنگ کی جانب سے امن پر اس توجہ کا مشاہدہ چین کے اہم علاقائی سٹیک ہولڈرز بشمول پاکستان، روس، بھارت، افغانستان اور وسطی ایشیا کے ساتھ فعال سکیورٹی اور امن کے حوالے سے تعاون کے تناظر میں بھی کیا جا سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ چین نہ صرف ملکی ترقی کو یقینی بنانے کے لیے تمام ممکن ذرائع بروئے کار لا رہا ہے بلکہ ایک پرامن بین الاقوامی ماحول میں حصہ ڈالنے کے معاملے میں بھی سرگرم ہے۔

جھانگ وئے وئے کے مطابق یہ چین کا گلوبل گورننس کے حوالے سے نیا رجحان ہے جو غربت اور دہشت گردی کے خلاف جنگ سے لے کر موسمیاتی تبدیلی اور مالیاتی بحران تک ہر طرح کے چیلنجز سے نمٹتا ہے اور واضح رہے کہ یہ نوآبادیاتی دور کی ''تقسیم کرو اور حکومت کرو'' والی ذہنیت نہیں ہے۔ تاریخی مثالوں سے ایسا انحراف شی جن پنگ کی طرف سے 'فاتح سب کچھ لیتا ہے اور اپنے پڑوسی کو بھکاری بنا دیتا ہے' والی سوچ کو ترک کرنے کے نقطۂ نظر سے ملتا ہے۔

علاقائی بلاکس کے لیے بیجنگ کی پالیسی:

چین نے صدر جن پنگ کے تحت علاقائی بلاکس پر بھی اپنی توجہ کو بہتر بنایا ہے جیسے شنگھائی تعاون تنظیم اور برکس (برازیل، روس، بھارت، چین اور جنوبی افریقہ)۔ اس میں جہاں شنگھائی تعاون تنظیم کے ذریعے توجہ سکیورٹی پر مرکوز رہی، وہیں حالیہ برکس سربراہی اجلاسوں میں زور تجارت بڑھانے پر دیا جاتا رہا ہے۔ شنگھائی تعاون تنظیم کی تشکیل کے لیے بنیادی اساسی اصولوں میں سے ایک کا مقصد سلامتی کے خطرات، خاص طور پر روس، چین اور وسطی ایشیا میں مذہبی دہشت گردی سے نمٹنا تھا لہٰذا مئی 2018ء میں سلامتی کونسل کے سیکرٹریز کے اجلاس کے دوران شی جن پنگ نے رکن ممالک کے درمیان سکیورٹی اقدامات کو بڑھانے پر زور دیا تاکہ علاقائی امن اور استحکام کو قائم رکھا جا سکے۔

اپنے قیام کے بعد سے شنگھائی تعاون تنظیم بہت پھلی پھولی ہے اور بہت سی علاقائی ریاستیں اس بلاک میں شامل ہونا چاہتی ہیں۔ چند سال پہلے پاکستان اور بھارت کو شنگھائی تعاون

تنظیم میں مکمل رکن کے طور پر شامل کیا گیا تھا جبکہ ایران نے بھی تنظیم میں شامل ہونے کی خواہش کا اظہار کیا۔ برکس محاذ پر شی جن پنگ نے رکن ممالک کے درمیان آزاد تجارت کو فروغ دینے کے لیے اس پلیٹ فارم کو مؤثر طریقے سے استعمال کیا ہے۔ وہ اس پلیٹ فارم کو امریکہ کے ملکی مصنوعات کے تحفظ کے معاشی نظام پر تنقید کے لیے بھی بروئے کار لائے۔ صدر شی جن پنگ نے جولائی 2018ء میں جوہانسبرگ میں برکس سربراہی اجلاس کے دوران واضح طور پر کہا تھا: عالمی سطح پر تجارتی جنگ کو مسترد کر دینا چاہیے کیونکہ اس میں کوئی فاتح نہیں ہوگا۔ مختلف مبصرین کے مطابق برکس کی بڑی کامیابیوں میں سے ایک کسی حد تک عالمی طاقت کے توازن کو گلوبل نارتھ سے گلوبل ساؤتھ تک بدلنا ہے۔

افریقہ کے لیے بیجنگ کی پالیسی:

جنوبی ایشیا واحد خطہ نہیں جو صدر شی جن پنگ کی توجہ کا مرکز ہے۔ ان کی جانب سے بہت زیادہ نظر انداز کیے جانے والے افریقی برِاعظم کو اپنی ترجیحات میں رکھنا بھی میڈیا کی توجہ کا مرکز بنتا رہا ہے۔ چین کو افریقہ کی 'نیو کالونائزنگ' کے لیے تنقید کا نشانہ بنایا جاتا رہا ہے لیکن بیجنگ کا مؤقف ہے کہ ایسا بیانیہ زمینی حقائق کے خلاف ہے۔ افریقہ میں نوآبادیات کے برعکس چین افریقہ کی آواز سن رہا ہے اور ایسے مختلف منصوبوں میں اس کی مدد کر رہا ہے جو افریقہ کو نقل وحمل کے نیٹ ورک کے ذریعے جوڑ سکیں۔

افریقی امور کے ماہر ایان ٹیلر کا خیال ہے کہ امریکہ اس برِاعظم (افریقہ) پر اپنا اثر ورسوخ تیزی سے کھو رہا ہے کیونکہ اس نے خطے کو اپنے لیے کوئی عطا سمجھ لیا تھا اور اس کی طرف اتنی توجہ نہیں دی جتنی دی جانی چاہیے تھی۔ ٹیلر کا کہنا ہے کہ ''امریکی افریقہ کو اس سکیورٹی عدسے کے ذریعے دیکھتے ہیں جو چینی نقطہ نظر سے مکمل طور پر مختلف ہے۔ چینی اس خطے کو اقتصادی نقطہ نظر سے دیکھتے ہیں۔ وقت کے تناظر میں امریکہ بہت پیچھے جا رہا ہے۔'' مزید یہ کہ چین اب افریقہ کا سب سے بڑا تجارتی پارٹنر ہے۔ یہ تجارت 2014ء میں 220 بلین ڈالر کی ریکارڈ بلندی تک پہنچ گئی تھی اور اس نے امریکہ کو بہت پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ جیسا کہ گراف میں دیئے گئے اعداد وشمار میں دیکھا جا سکتا ہے افریقہ میں

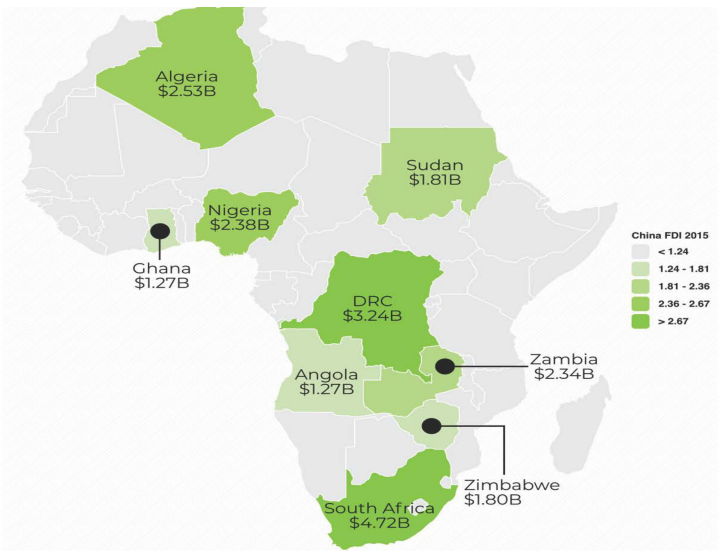

چینی ایف ڈی آئی سٹاک والے دس بڑے افریقی ممالک (بحوالہ سنٹر فار ریسرچ اینڈ سکیورٹی سٹڈیز)

جنوبی افریقہ کو چین کی غیر ملکی براہ راست سرمایہ کاری میں سب سے زیادہ حصہ ملا جبکہ گزشتہ دس برسوں میں چین کے آفیشلز کی جانب سے سب سے زیادہ سرکاری دورے اسی خطے کے کیے گئے۔

ایان ٹیلر کا خیال ہے کہ بہت سی افریقی ریاستیں اب بی آر آئی میں شامل ہونے کے لیے پُر جوش ہیں کیونکہ وہ اس منصوبے کو تجارت کے لیے ایک مثالی موقع کے طور پر دیکھتی ہیں۔ یہ ریاستیں اس منصوبے کو افریقہ کے اندر اور افریقہ سے باہر رابطے کا ایک اہم ذریعہ بھی سمجھتی ہیں۔ ایان ٹیلر کے مطابق روانڈا ایک ایسی ہی ریاست ہے جو چاہتی ہے کہ بی آر آئی منصوبے کا حصہ بن جائے اور یوں اس کا امریکہ اور یورپ پر انحصار کم ہو جائے۔ ان کا کہنا ہے کہ ''روانڈا خود کو مشرقی افریقہ میں فروغ پذیر ریلوے نیٹ ورکس 'جو بیلٹ اینڈ روڈ انیشی ایٹو کا حصہ ہیں' میں شامل کرنے کی امید کر رہا ہے۔ کیگالی (روانڈا کا دارالحکومت) امریکہ و یورپ سے دوری اختیار کر رہا ہے اور چین اسے ایک بہترین موقع سمجھتا ہے کہ روانڈا کے ساتھ تعلقات کو فروغ دیا جائے۔''

ایان ٹیلر کی بات غلط نہیں ہے۔ ستمبر 2019ء تک 55 افریقی ممالک میں سے 40 نے یا تو بی آر آئی کا حصہ بننے پر رضامندی ظاہر کر دی تھی یا اس حوالے سے کسی معاہدے پر دستخط کر دیئے تھے جس سے ان کی رضامندی ظاہر ہوتی تھی کہ وہ چین کی تاریخی عالمی اقتصادی تبدیلی میں شامل ہونا چاہتے ہیں۔ صدر شی جن پنگ کا خیال ہے کہ افریقی براعظم، جو 1.3 بلین آبادی پر مشتمل خطہ ہے اور زیادہ تر نوجوانوں اور بچوں پر مشتمل ہے، کا معیارِ زندگی بہتر بنایا جائے تو اس کے نہ صرف اس براعظم پر مثبت اور دوررس اثرات پڑیں گے بلکہ اس ترقی سے بی آر آئی کی دیگر شراکت دار ریاستوں پر بھی اچھے اثرات مرتب ہوں گے۔ یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ صرف 2013ء اور 2017ء کے درمیانی عرصے میں چینی حکومت نے افریقہ میں تقریباً 60 بلین ڈالر کی سرمایہ کاری کی۔ یہ سرمایہ کاری خاص طور پر انفراسٹرکچر اور صنعتی منصوبوں میں کی گئی۔

صدر شی جن پنگ اور ان کے پیشروؤں نے 2007ء سے افریقہ کو اپنی ترجیح بنا رکھا ہے۔ وہ مسلسل اس براعظم کے دورے کر کے وہاں بڑے بڑے منصوبوں کا اعلان کرتے رہے۔ افریقہ میں چین کی دلچسپی کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ 2007ء سے 2017ء تک کے 10 سالوں میں چین کی سینئر قیادت نے 79 مرتبہ افریقہ کا دورہ کیا۔ مغرب کی جانب سے تنقید کے باوجود روانڈا کے صدر پال کاگامے نے حال ہی میں چین کی اس حوالے سے تعریف کی کہ وہ افریقہ میں برابری کا سلوک کر رہا ہے اور یہ کہ چین ایک ایسا ملک ہے جو 'عالمی معاملات میں انقلابی وضع' کا حامل ہے۔ یہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ اگرچہ مغربی رہنما افریقہ میں چین کی سرمایہ کاری پر تنقید کرتے ہیں لیکن 2013ء کے بعد سے کسی برطانوی وزیراعظم نے افریقی براعظم میں قدم نہیں رکھا اور سابق امریکی صدر ڈونلڈ ٹرمپ تو افریقی ممالک کو 'بے حد ناپسندیدہ جگہ' قرار دینے کی وجہ سے اب تک بدنام ہیں۔

افریقہ صدر شی جن پنگ کی ذاتی سفارت کاری کی بھی علامت ہے جہاں ہر پارٹنر ریاست انہیں مناسب احترام اور پہچان دیتی ہے۔ صرف فرانسیسی صدر ایمانوئل میکرون صدر شی جن پنگ کے ایک دور دراز کے حریف ہیں کہ وہ برِاعظم افریقہ کو اہمیت دیتے ہیں اور برسرِ اقتدار آنے کے بعد سے اب تک انہوں نے 9 مرتبہ افریقی ممالک کا دورہ کیا ہے۔ مزید یہ کہ جہاں چین نے افریقہ میں زیادہ تر انفراسٹرکچر اور معدنیات پر سرمایہ کاری کر رکھی ہے۔ کچھ حالیہ رپورٹس سے پتا چلتا ہے کہ چین برِاعظم افریقہ میں تعلیم اور ٹیکنالوجی کی منتقلی پر بھی خاصی سرمایہ کاری کر رہا ہے۔ اس وقت افریقہ میں چین کے زیرِ انتظام 20 سے زائد زرعی تربیتی ادارے/مراکز اور چالیس سے زیادہ چینی زبان کے سکول کام کر رہے ہیں۔ چینی وزیر برائے خارجہ امور وانگ یی نے 2017ء میں افریقی حکام کے لیے اگلے دس برسوں میں چین میں تعلیم حاصل کرنے کے لیے دس ہزار سے زیادہ وظائف کا اعلان کیا تھا۔

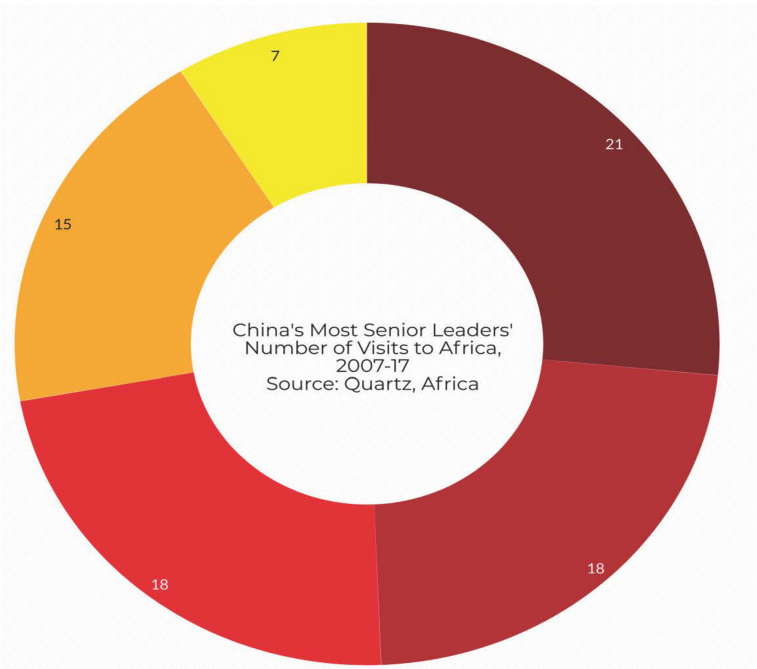

چین کے سینئر ترین لیڈرز کے افریقی دوروں کا گراف، 2007ء تا 2017ء

صدر شی جن پنگ نے 2018ء میں بیجنگ میں فورم فار چائنا افریقہ کوآپریشن کے سربراہی اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے مزید یقین دہانی کرائی تھی کہ چین آئندہ پانچ برسوں میں 60 ارب ڈالر کی سرمایہ کاری کرے گا۔ ریلوے کے منصوبوں کی بات کی جائے تو چین نے گزشتہ چند برسوں میں افریقہ میں تقریباً 6000 کلومیٹر ریلوے کا بنیادی ڈھانچہ تعمیر کیا ہے۔ تو انائی کے شعبے میں چین نے 2000ء سے اب تک 50 بلین امریکی ڈالر کی سرمایہ کاری کی ہے۔ بوسٹن یونیورسٹی گلوبل ڈویلپمنٹ سینٹر کے مطابق لاطینی امریکہ میں 58 بلین اور ایشیا میں 60 بلین ڈالر کی سرمایہ کاری کی گئی لیکن افریقہ کی ترقی کی رفتار کو تیز کرنے کے لیے دیگر عالمی اقتصادی طاقتوں کو چین کی تقلید کرنے اور بی آر آئی کا حصہ بننے کی ضرورت ہے اور ان طاقتوں کو محض ہنگامی امداد فراہم کرنے پر ہی توجہ مرکوز رکھنے کی پالیسی 'جواب متروک ہو چکی ہے' پر عمل نہیں کرنا چاہیے۔

متعدد افریقی ممالک کا ماننا ہے کہ بی آر آئی منصوبے علاقائی نمو اور افریقہ میں معاشی بڑھوتری میں مددگار ثابت ہوں گے۔ 2018ء میں ادیس ابابا میں ایک سیمینار سے خطاب کرتے ہوئے ایتھوپیا کے وزیر برائے خارجہ امور ایفیو رک کاسونے کہا تھا کہ چین کا بیلٹ اینڈ روڈ انیشی ایٹو افریقی ممالک میں انفراسٹرکچر کی ترقی اور معاشی نمو کے لیے مفید ثابت ہوگا۔ انہوں نے مزید کہا کہ بی آر آئی کے تحت منصوبے معاشی تعاون، علاقائی ہم آہنگی اور اس کے ساتھ انفراسٹرکچر رابطہ کاری کے ذریعے افریقہ کی پائیدار اور تیز رفتار ترقی میں مدد دیں گے۔ اسی تقریب سے خطاب کرتے ہوئے اقوامِ متحدہ ڈویلپمنٹ پروگرام (یو این ڈی پی) کے معاشی مشیر جیمز واکیا گا نے کہا تھا کہ افریقہ میں انفراسٹرکچر کی کمی کو پورا کرنے کے لیے بی آر آئی منصوبے بنیادی اہمیت کے حامل ہیں۔ ان سے افریقہ میں سٹرکچرل ٹرانسفارمیشن میں تیزی آئے گی۔ برِاعظم کے دیگر ممالک کے ماہرین اور حکام نے بھی ایسے ہی خیالات اور جذبات کا اظہار کیا۔

تیز رفتار قومی نمو اور ترقی کے حوالے سے چین براعظم افریقہ کو کئی اہم سبق دیتا ہے۔ حالیہ برسوں میں افریقہ اور چین کے بڑھتے ہوئے تعلقات اور تعاون سے پتا چلتا ہے کہ ایک تعمیری شراکت دار کے طور پر افریقہ نے چین کا خیر مقدم کیا ہے، جو معاشی خوشحالی لانے میں براعظم افریقہ کی مدد کر سکتا ہے۔ سینٹر آف چائنا اینڈ گلوبلائزیشن کے صدر وانگ ہوئی یاؤ کا ماننا ہے کہ چین افریقہ

شراکت داری میں حالیہ تیزی اور افریقن کانٹی نینٹل فری ٹریڈ ایریا کے نفاذ نے افریقہ میں باہمی شراکت داری اور ترقی کے منصوبوں کے لیے نئے دروازے کھولے ہیں۔ یاؤ لکھتے ہیں: ''چین کی افریقہ سے تجارت میں گزشتہ انیس سالوں میں بیس گنا اضافہ ہوا ہے جو فورم آن چائنا افریقہ کوآپریشن اور بی آر آئی کے فریم ورک کے تحت دو ہزار میں دس بلین ڈالر سے بڑھ کر دو ہزار انیس میں دو سو سات بلین ڈالر ہو چکی تھی۔ تین ہزار سات سو سے زائد چینی کاروباری اداروں نے افریقہ بھر میں سرمایہ کاری کرتے ہوئے کاروبار شروع کر رکھے ہیں اور یوں وہ پائیدار علاقائی معاشی نمو کے لیے ایک طاقتور ڈرائیونگ فورس بن چکے ہیں۔''

کینیا میں افریقہ کی ترقی پر گہری نظر رکھنے والے ایک ماہر مائیکل چیگی کا ماننا ہے کہ بی آر آئی اور افریقن یونین کے اکنامک بلیو پرنٹ ایجنڈا 2063ء کے مابین کئی کنورجنس (ہم آہنگی) پوائنٹس ہیں۔ چیگی کا مزید کہنا ہے کہ بی آر آئی پروجیکٹ افریقہ میں انفراسٹرکچر کی کمی دور کرنے میں اہم کردار ادا کر سکتا ہے۔ بی آر آئی افریقی لیڈرز کی ترقی کے لیے پیراڈائم شفٹ کی پیشکش کرتا ہے جس کی بنیاد مساوی مذاکرات اور منافع میں ہو۔ یہ مغربی سرمایہ کاری کے برعکس ہے جس میں پابندیوں اور جکڑ بندیوں کا تحفہ ملتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کورونا وائرس کی وبا میں بھی کہا جاتا ہے کہ چین نے اپنے ملک میں وبا کی موجودگی کے باوجود گلوبل ساؤتھ میں معتدل ترقی یافتہ سماج کی تخلیق سے اپنی نظریں نہیں ہٹائیں اور اپنے افریقی شراکت داروں کے ساتھ مصروف عمل رہا تاکہ وبا کو روکا جا سکے اور بی آر آئی کے منصوبوں کو جاری رکھا جا سکے۔

تاہم ان مثبت جذبات کے باوجود مغربی میڈیا نے ایک بار پھر 'قرضہ جال' کا نعرہ لگانے میں دیر نہ لگائی کیونکہ جب گلوبل ساؤتھ کی بات آتی ہے تو چینی سرمایہ کاری کے خلاف ایسی ہی باتیں کی جاتی ہیں۔ لارنس فری مین اس واہمے کو توڑتے ہیں اور تنقید کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ کتنے ہی مغربی میڈیا ادارے ہیں جو بی آر آئی سرمایہ کاری کے گرد موجود عوامی خیالات کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ اپنی بات کی وضاحت کے لیے فری مین ہیتھر زیگر کے مضمون بعنوان ''چائنا اینڈ افریقہ: ڈیبٹ ٹریپ ڈپلومیسی؟'' کا حوالہ دیتے ہیں۔ ان کے مطابق مضمون تسلیم کرتا ہے کہ کینیا کورونا کے باعث ہونے والے معاشی دباؤ کا سامنا کر رہا ہے اور سٹینڈرڈ گیج ریلوے کے لیے

قرضے کی شرائط پورا کرنے سے قاصر ہے۔ پھر فری مین کہتے ہیں کہ زیگر چینی سرمایہ کاری پر تنقید کرتے ہوئے قرضہ جال ڈپلومیسی کے خلاف بڑی چالاکی سے ایک جملہ استعمال کرتے ہیں: ''اگر کینیا قرضوں کی ادائیگی میں ناکام یا ڈیفالٹ ہو جاتا ہے تو چین اس قابل ہو جائے گا کہ اس نقصان کے بدلے وہ ممباسا پورٹ سے حاصل ہونے والے ریونیو کو وصول کرے حالانکہ چینی حکومت کا کہنا ہے کہ وہ ایسا کچھ کرنے کا ارادہ نہیں رکھتی۔''

لاطینی امریکہ کے لیے بیجنگ کی پالیسی:

دوسری جانب چین نے اپنی بی آر آئی شراکت داریوں کو لاطینی امریکہ کے ملکوں تک وسعت دے دی ہے جو ایک ایسا براعظم ہے جس کو مغربی سرمایہ کار ایجنسیوں اور کارپوریشنوں نے زیادہ تر نظر انداز ہی کیا۔ پیپی جھانگ اٹلانٹک کونسل کے لیے لکھتے ہوئے اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ لاطینی امریکہ کے ملکوں نے طویل المیعاد شراکت داریوں میں داخل ہونے کے امکانات کا خیر مقدم کیا ہے۔ لاطینی امریکہ میں بی آر آئی کی اہمیت وافادیت کو بیان کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں ''لاطینی امریکہ کی حکومتیں اور کمپنیاں سمجھتی ہیں کہ بی آر آئی ایک موقع ہے جس کے ذریعے بین الاقوامی معاملات اور مصروفیات کو بڑھایا جا سکتا ہے۔ دنیا کے دیگر خطوں کی طرح بی آر آئی کی بڑی کشش اس کے ذریعے چین تک رسائی ہے جو ایک بڑھتا ہوا برآمدی مرکز اور بیرونی فنانسنگ کا ذریعہ ہے۔ گزشتہ بیس سالوں کے دوران چین خطے کے معمولی کمرشل شراکت دار سے اہم ترین کے درجے میں آ چکا ہے۔ دوطرفہ تجارت میں پچیس گنا اضافہ ہو چکا ہے، جو انیس سو ننانوے میں بارہ بلین ڈالر تھی اور اب بڑھ کر دو ہزار اٹھارہ میں تین سو چھ بلین ڈالر ہو چکی ہے جس سے چین امریکہ کے بعد لاطینی امریکہ کا سب سے بڑا ٹریڈ پارٹنر بن چکا ہے۔ دو ہزار پانچ سے چینی پالیسی بینک لاطینی امریکہ کے ملکوں کو ایک سو اکتالیس بلین ڈالر قرض کی مد میں دے چکے ہیں جو ورلڈ بینک، انٹر امریکن ڈویلپمنٹ بینک اور سی اے ایف ترقیاتی بینک آف لیٹن امریکہ کے فراہم کردہ مجموعی قرضوں سے بھی زیادہ ہے۔ چین خطے کے لیے سب سے اہم فارن ڈائریکٹ انویسٹر بھی بن رہا ہے، بالخصوص ادغام اور حصولی کے ذریعے۔''

چین یقین رکھتا ہے کہ ایشیا اور یورپ کی طرح لاطینی امریکہ بھی بیلٹ اینڈ روڈ انیشی ایٹو میں ایک لازمی اور اہم شراکت دار بن سکتا ہے کیونکہ اس خطے میں تجارت اور ترقی کے حوالے سے بڑا پوٹینشل موجود ہے۔ دی چارہرانسٹی ٹیوٹ کے انٹرنیشنل ایڈوائزری بورڈ کے چیئر لوفنگ ڈنگ کا ماننا ہے کہ لاطینی امریکہ کے ممالک وسائل سے مالا مال ہیں اور ان کے اور چین کے درمیان تعاون کا بڑا پوٹینشل موجود ہے۔ مزید برآں جب سے چین کے بی آر آئی منصوبے کا آغاز ہوا ہے تب سے براعظم کے تقریباً بیس ممالک بی آر آئی میں شامل ہو چکے ہیں کیونکہ یہ خطہ مجموعی طور پر چین کے ساتھ تعلقات کو مضبوط کرنا چاہتا ہے؛ چنانچہ چینی صدر شی جن پنگ نے 2013ء سے یہ عہد کر رکھا ہے کہ بی آر آئی کے تحت لاطینی امریکہ کے ممالک کے ساتھ برابری کی بنیاد پر شراکت داری قائم کی جائے گی۔

2013ء میں صدر شی جن پنگ خطے کے پہلے دورے کے موقع پر ٹرینی ڈاڈ اور ٹوباگو، کوسٹاریکا اور میکسیکو گئے تھے۔ 2014ء میں صدر شی جن پنگ نے برازیل، وینزویلا، ارجنٹائن اور کیوبا کا دورہ کیا تھا۔ ان کا برازیل کا دورہ خاصا اہم رہا کیونکہ وہاں ان کی لاطینی امریکہ کے گیارہ ملکوں کے لیڈروں سے ملاقات ہوئی تھی۔ وہیں پر انہوں نے چین اور لاطینی امریکہ کے ممالک کے درمیان تعلقات کے حوالے سے اپنا ویژن پیش کیا تھا۔ صدر شی جن پنگ نے اس موقع پر خطاب کرتے ہوئے کہا تھا ''آیئے آگے بڑھیں اور اس موقع سے فائدہ اٹھا کر مل جل کر کام کریں جو ہمیں ملا ہے اور مشترکہ کمیونٹی تشکیل دیں، ایک مشترکہ ترقی کی بنیاد رکھیں اور یہ تعلق چین لاطینی امریکہ اور کیریبین کے روشن مستقبل کی نوید ہو۔''

مئی 2017ء میں ارجنٹائن کے صدر ماریسیو میکری نے بیلٹ اینڈ روڈ فورم فار انٹرنیشنل کوآپریشن سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا ''بی آر آئی کے تحت لاطینی امریکہ کے چین کے ساتھ تعاون کا امکان ایک موقع ہے جسے ہم گنوانا نہیں چاہتے۔'' جولائی دو ہزار انیس میں چین نے کیوبا میں پہلی ریل روڈ اپ ڈیٹ کا کام کیا تھا جو گزشتہ چالیس برسوں کے دوران پہلی کاوش تھی جس میں ہوانا اور سانتیاگو ڈی کیوبا کے درمیان پہلی ٹرین چلائی گئی۔ اس اپ گریڈیشن کا مقصد لاطینی امریکہ میں پرانے انفراسٹرکچر کو بہتر بنانا تھا جو خطے کی ترقی میں رکاوٹ بنا ہوا تھا۔ اسی طرح یوراگوئے کے نیشنل ملک پروڈیوسر کوآپریٹو کے ڈائریکٹر جنرل جوزنوئل الپوئن نے تیرہویں چین لاطینی امریکہ اینڈ

دی کیریبین بزنس سمٹ کی سائیڈ لائن پر میڈیا سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا کہ چینی سرمایہ کاری سے یورا گوئے اور لاطینی امریکہ دونوں میں کاروباری ماحول کو بہتر بنانے میں مدد ملی ہے۔

تہران کے لیے بیجنگ کی پالیسی:

حال ہی میں یعنی پوسٹ کورونا دور میں چین نے امریکہ کے مقابلے میں خود کو زیادہ قابل بھروسہ عالمی تجارتی اور ترقیاتی شراکت دار ثابت کیا ہے۔ مارچ 2021ء کے آخری ہفتے میں نیویارک ٹائمز کی ایک رپورٹ کے مطابق چین آئندہ پچیس سالوں کے دوران ایران میں 400 بلین ڈالر کی سرمایہ کاری کرے گا اور یہ سرمایہ کاری علاقائی رابطہ کاری اور ترقی کے سلسلے میں اہم کردار ادا کرے گی۔ مغربی میڈیا میں خبروں اور مبالغہ آرائی سے بھرپور تنقید کا جواب دیتے ہوئے کنٹمپریری انٹرنیشنل ریلیشنز بیجنگ کے سکالر نی اوشن چن نے گلوبل ٹائمز کو بتایا کہ چین ایران تعاون کے مقاصد کو بدنما کر کے پیش کرنے کی کوششوں کے طور پر مغربی میڈیا ایران کے خطرے کو بڑھا چڑھا کر بیان کر رہا ہے، ایرانی ایٹمی پروگرام کے بارے میں قیاس آرائیاں کر رہا ہے اور ایران کے خلاف مغربی پابندیوں کا جواز پیش کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔

مزید برآں چینی ماہرین کا بھی کہنا تھا کہ چونکہ ابھی تک معاہدے کی کوئی تفصیل سامنے نہیں آئی اس لیے 400 بلین ڈالر کی سرمایہ کاری کی رپورٹیں ایک یکطرفہ تشریح ہے، جس کا مقصد صرف یہی ہے کہ چین اور ایران کے بڑھتے ہوئے تعلقات کو امریکہ کے خلاف ایک چیلنج کے طور پر پیش کیا جائے، نیوکلیئر ایشو کے ڈیڈ لاک کے دوران ایران کے خطرے کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا جائے اور ایران اور خطے کے دوسرے ممالک کے درمیان رخنہ پیدا کیا جائے۔

بی آر آئی کے تحت چین کی علاقائی اور عالمی شراکت داری کے بارے میں اوپر کی گئی بحث سے پتا چلتا ہے کہ چین دنیا کا اگلا معاشی لیڈر بننے کا خواہش مند ہے اور اس کے لیے ان علاقوں اور خطوں میں سرمایہ کاری کر رہا ہے جن کو امریکہ کی جانب سے نظر انداز کیا گیا تھا۔ مزید برآں یہ شراکت داریاں علاقائی رابطہ کاری کے ذریعے چین کے امن اور ترقی کو پروموٹ کرنے کے ویژن کو بھی مضبوط بناتی ہیں۔

نئی دہلی کے لیے بیجنگ کی پالیسی:

اپنے علاقائی اور عالمی ترقیاتی اہداف کے تعاقب میں چین نے اس بات کو بھی یقینی بنایا ہے کہ وہ ماضی کے حریفوں کے ساتھ کسی قسم کے تنازع میں نہ پڑے اور اس کے بجائے ان کو پوٹینشل پارٹنر کے مطابق ٹریٹ کرے۔ چین بھارت مخاصمت اور نئی دہلی کے بارے میں چین کے نقطۂ نظر میں تبدیلی اس حوالے سے بہترین مثال ہے۔ بحرِ ہند پر حقیقی تنازع انڈیا اور چین کے مابین ہے۔ ماہرین اس بات کو خارج از امکان قرار دیتے ہیں کہ دنیا کے سب سے زیادہ آبادی والے ان دو ملکوں کے درمیان کوئی جنگ ہوسکتی ہے اور چینی صدر شی جن پنگ اپنی ذاتی سفارت کاری کو بروئے کار لاتے ہوئے افغانستان میں انڈیا کے ساتھ مشترکہ منصوبوں پر اتفاق رائے کر چکے ہیں، جو اس بات کا واضح پیغام ہے کہ چین جنوبی ایشیا کے خطے میں ہم آہنگی اور امن کی خواہش رکھتا ہے۔

انڈیا میں چین کے اس وقت کے سفیر لوزاؤ ہوئی نے ووہان میں صدر شی جن پنگ اور وزیراعظم مودی کے مابین چوٹی کانفرنس کے موقع پر ٹریبیون انڈیا میں مضمون لکھا تھا جو اس نئے طرزِ فکر کی وضاحت کرتا ہے کہ ''اگر ہم ووہان چوٹی کانفرنس کو ایک بڑے تناظر میں دیکھتے ہیں تو بہتر ہے کہ اس کو سمجھ لیا جائے۔ عالمی تناظر میں دیکھا تو چین اور بھارت ارتقاء کرتے عالمی سٹرکچر، جو مشرق کے عروج اور مغرب کے زوال کی بات کرتا ہے، کے لیے بڑے پیمانے پر متعلقہ ہیں اور اینٹی گلوبلائزیشن اور پروٹیکشن ازم کے خلاف ہیں۔ انفرادی ترقیوں سے ہمیں ترقیاتی حکمت عملیوں اور تجربات میں ایک دوسرے کو شیئر کرنا چاہیے کہ ہماری مشترکہ آبادی اور جی ڈی پی دنیا کے ٹوٹل کا بالترتیب چالیس فیصد اور بیس فیصد ہیں۔ اسی طرح اگر دو طرفہ تناظر کے حوالے سے بات کی جائے تو ہمیں دیکھنا ہے کہ ہم کس طرح ایک دوسرے کے ساتھ رہ سکتے ہیں۔ ہمیں اپنی انفرادی ترقیوں کو کس نظر سے دیکھنا چاہیے اور ارادوں کو کس طرح جج کرنا چاہیے۔ یہ وہ بنیادی ایشوز ہیں جن کو لیڈروں کی فوری توجہ کی ضرورت ہے۔''

بیلٹ اینڈ روڈ انیشی ایٹو کیا ہے:

چینی صدر شی جن پنگ نے بیلٹ اینڈ روڈ انیشی ایٹو (بی آر آئی) کا اعلان ستمبر 2013ء

میں کیا تھا۔ ابتدا میں اس کا نام ون بیلٹ ون روڈ تھا یعنی (او بی او آر)۔ بی آر آئی اصل میں یوریشین خطے میں ایک طویل المیعاد معاشی تعاون اور ترقیاتی فریم ورک کا منصوبہ ہے جس میں تجارت اور سرمایہ کاری ہوگی اور اس میں سڑکوں کا ایسا نیٹ ورک قائم کیا جائے گا جسے سلک روڈ اکنامک بیلٹ کہا جائے گا جبکہ اس میں ایک سمندری نیٹ ورک بھی ہوگا جسے اکیسویں صدی کا میری ٹائم سلک روڈ کہا جائے گا۔

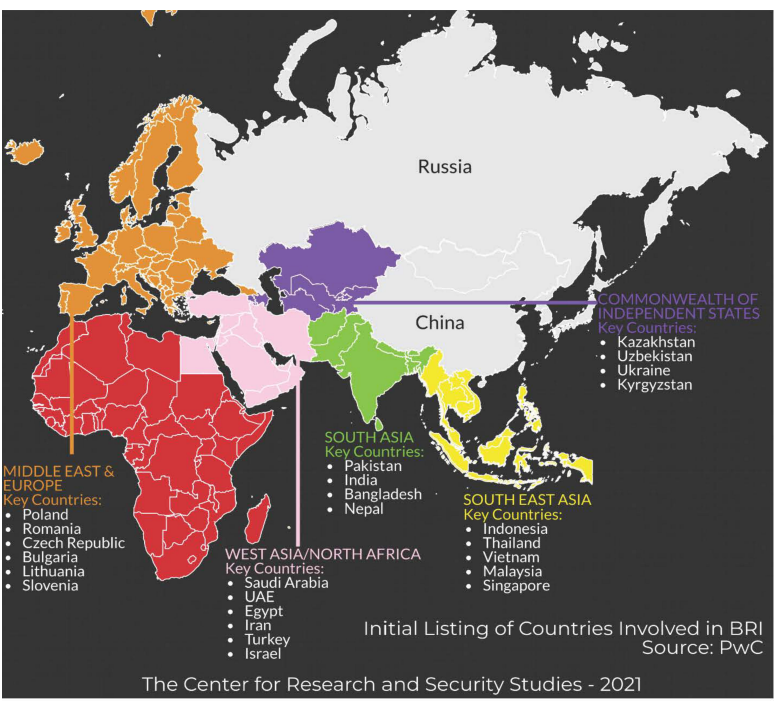

بی آر آئی میں شامل ممالک کی ابتدائی فہرست

لیکن ایشیا میں بھی گھٹیا پن کا شدید احساس برقرار ہے کیونکہ بہت سے لوگ اسے ایک ایسے پروجیکٹ کے طور پر دیکھتے ہیں جس کا مقصد بنیادی طور پر نرم طاقت کے استعمال کے ذریعے شی جن پنگ اور چین کے عالمی اثر و رسوخ کو بڑھانا ہے۔ بی آر آئی اب ''سرمایہ کاری، انفراسٹرکچر اور وسیع تر جیو پولیٹیکل/جیو اکنامک انیشی ایٹو'' کا عالمی منصوبہ ہے۔ یوریشیا، افریقہ اور اس سے آگے

کے 73 مختلف ممالک جس کا حصہ بن چکے ہیں۔اس سے قطع نظر بی آر آئی پہلے ہی شی جن پنگ کے ویژن اور صدارت کے حوالے سے ایک پہچان بن چکا ہے اور یہ چیز نہ صرف صدر شی جن پنگ کو ان کے ماضی قریب کے پیشروؤں سے ممتاز کرتی ہے بلکہ چین کو ایشیا پیسفک اور گلوبل پالیسی پر عالمی اور علاقائی سکالرشپ کا فوکل پوائنٹ بھی بناتی ہے۔مزید یہ کہ بی آر آئی کو جدید تاریخ میں سب سے بڑے انفراسٹرکچر ڈویلپمنٹ پروجیکٹس میں سے ایک تصور کیا جاتا ہے۔

ایک جدید سلک روڈ کی تعمیر:

تاریخی سلک روٹس (یا سلک روڈ) 2000 سال سے زیادہ عرصہ پہلے تیار ہوئے تھے کیونکہ دنیا کے دوسرے حصوں میں چینی ریشم (سلک) کی مانگ کافی زیادہ تھی۔ دنیا کی دو بڑی تہذیبوں، چین اور روم کے مابین تجارت میں شاہراہ ریشم نے اہم کردار ادا کیا تھا۔ جہاں ریشم چین سے مغرب کی جانب جاتا تھا' وہاں دوسری اشیا جیسے سونا، چاندی اور اون مشرق کی طرف چین میں آتی تھیں۔

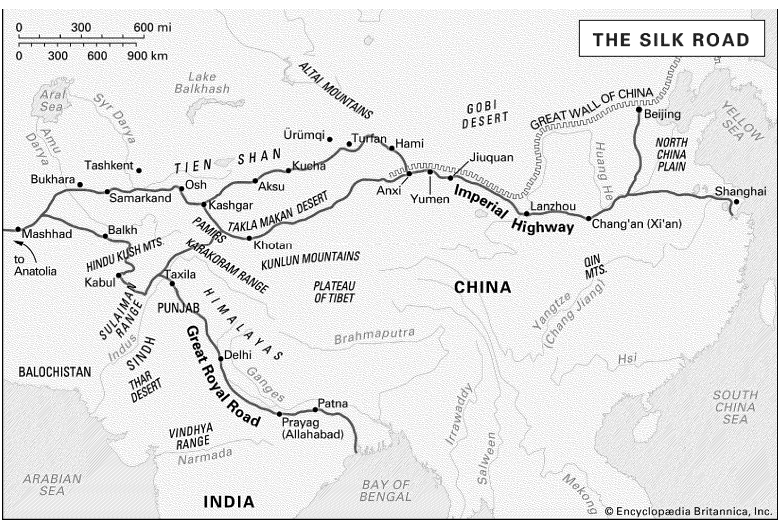

تاریخی شاہراہِ ریشم (سورس: برٹینیکا)

ایک یادگار سرمایہ کاری:

او بی او آر یا بی آر آئی کے اعلان سے قبل چینی کمیونسٹ پارٹی اور چینی پالیسی سازوں کے درمیان بحث چل رہی تھی کہ ملک کی ''سٹریٹیجک سمت کیا ہونی چاہیے۔'' اگرچہ منصوبے کی ٹوٹل لاگت کا ابھی کسی کو علم نہیں لیکن کچھ کا کہنا ہے کہ یہ لاگت اکیس ٹریلین ڈالر ہو سکتی ہے، جس میں پینسٹھ پارٹنر ہوں گے، اور دنیا کی اسی فیصد آبادی پر اس کا مثبت اثر ہوگا۔ اس کے علاوہ اٹلانٹک کونسل کا کہنا ہے کہ 2019ء کے اعداد و شمار کے مطابق ایک سو اکتیس ممالک بی آر آئی پر دستخط کر چکے ہیں، جبکہ پانچ سو پچھتّر بلین ڈالر کی سرمایہ کاری حرکت میں آ چکی ہے، لہٰذا بی آر آئی کا منصوبہ دنیا بھر میں انفراسٹرکچر کی ترقی سے پیراڈائم شفٹ کر سکتا ہے۔

اپنے آغاز سے ہی بی آر آئی منصوبہ بھی قابل ذکر نمو کو دیکھ چکا ہے۔ صرف 2018ء کے پہلے چار مہینوں میں بیجنگ نے رکن ریاستوں کے ساتھ 390 بلین ڈالر کے معاہدوں پر دستخط کیے تھے۔ چینی کامرس منسٹری کے ترجمان گاؤ فینگ کے مطابق ان ڈیلز سے پتا چلتا ہے کہ بی آر آئی سال بہ سال انیس فیصد کے حساب سے ترقی کر رہی ہے۔ تازہ ترین اعداد و شمار کے مطابق چین بھی دعویٰ کرتا ہے کہ اب سو ممالک اور بین الاقوامی ادارے بی آر آئی کی حمایت کرتے ہیں۔ ان میں ایک ملک پاکستان ہے جو چین کا اہم اتحادی اور شراکت دار ہے جسے بی آر آئی کے اہم آف شوٹ منصوبے سی پیک سے بھی بہت فائدہ ملا ہے۔

بی آر آئی سے کس طرح بڑے بڑے ترقیاتی کام ہو رہے ہیں اور کیسے کیسے ادارے قائم کیے جا رہے ہیں اس کا اندازہ ایشین انفراسٹرکچر انوسٹمنٹ بینک (اے آئی آئی بی) کے قیام سے بھی لگایا جا سکتا ہے جو پچیس دسمبر 2015ء کو بیجنگ میں عمل میں آیا۔ اے آئی آئی بی کے قیام کا مقصد انفراسٹرکچر منصوبوں کے لیے سرمایہ فراہم کرنا ہے جو چین کے سلک روڈ انیشی ایٹو کا حصہ ہیں، جن میں فوکس ایشیا، مشرق وسطیٰ، افریقہ اور یورپ کے درمیان رابطوں کو بڑھانا ہے۔ بینک کا قیام اس لیے بھی عمل میں آیا کہ بہت سے اہم ممالک آئی ایم ایف کے کام کرنے کے طریقے پر تحفظات رکھتے تھے جس کی پالیسیوں میں امریکہ کا اہم اثر و رسوخ اور عمل دخل شامل تھا۔ اے آئی آئی بی میں ستاون

مما لک شامل ہیں اور اس کا ابتدائی سرمایہ ایک سو بلین ڈالر ہے۔ اے آئی آئی بی ایشیائی ترقیاتی بینک کے ساتھ ان دو ایشیائی بینکوں میں شامل ہے جنہوں نے کورونا سے نمٹنے کے لیے ترقی پذیر اور غریب معیشتوں کو قرضے دیئے۔

بی آر آئی کے اجزا اور اس سے وابستہ توقعات:

بی آر آئی دو بڑے حصوں پر مشتمل ہے، جن میں ایک سلک روڈ اکنامک بیلٹ اور دوسرا نیو میری ٹائم سلک روڈ کہلاتا ہے۔ سلک روڈ اکنامک بیلٹ کا افتتاح قازقستان کی نذر بائیوف یونیورسٹی میں اس وقت کیا گیا جب چینی صدر شی جن پنگ سات ستمبر 2013ء کو سرکاری دورے پر قازقستان پہنچے تھے۔ نیو میری ٹائم سلک روڈ کا افتتاح انڈونیشیا کی پارلیمنٹ میں کیا گیا۔ جب چینی صدر شی جن پنگ تین اکتوبر 2013ء کو انڈونیشیا کے سرکاری دورے پر وہاں گئے تھے۔ یقین کیا جاتا ہے کہ صدر شی جن پنگ بی آر آئی کو ایک موقع کے طور پر دیکھتے ہیں تاکہ چین کے معاشی وسائل کو علاقائی استحکام اور معاشی نمو کو پروموٹ کرنے کے لیے استعمال کیا جا سکے۔ دوسری جانب مغربی نقاد ہیں جو بی آر آئی کو عالمی غلبے کی ''چینی سازش'' قرار دیتے ہیں جس کو صدر شی جن پنگ مسلسل مسترد کرتے آ رہے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ بی آر آئی ایک کوشش ہے جو کہ جنوب مشرقی ایشیا، وسطی ایشیا، مشرقِ وسطیٰ، یورپ اور افریقہ کو مربوط کرنے کے لیے کی جا رہی ہے۔

صدر شی جن پنگ نے 2018ء میں جنوبی صوبے ہینان میں منعقدہ باؤ فورم فار ایشیا سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ بیلٹ اینڈ روڈ انیشی ایٹو چین کا پلاٹ نہیں ہے جیسا کہ کچھ لوگ کہتے ہیں اور نہ ہی یہ دوسری جنگ عظیم کے بعد والے مارشل پلان جیسی کوئی چیز ہے۔ یہ کوئی چینی سازش بھی نہیں۔ اگر آپ اس کو کوئی نام دینا ہی چاہتے ہیں تو یہ ایک ''آشکار پلاٹ'' ہے۔ چین خود غرضی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کسی جیو پولیٹیکل گیم میں شامل نہیں ہوگا۔ نہ ہی یہ کوئی مخصوص کلب تخلیق کرے گا اور نہ ہی یہ دوسروں پر تجارتی سودے بازیاں ٹھونسے گا۔

جھانگ وئے وئے کا خیال ہے کہ بی آر آئی علاقائی اور عالمی امن کے لیے شومن ڈیکلریشن سے بھی بڑا کردار ادا کر سکتا ہے۔ یاد رہے کہ شومن ڈیکلریشن پر 1950ء میں جرمنی اور

فرانس کے مابین دستخط ہوئے تھے۔ بی آر آئی کا مقصد نئے سلک روڈ روٹس کے ساتھ ساتھ زمینی تہذیبوں کو زندہ کرنا ہے۔ یہ سلک روٹس ستر سے زیادہ ممالک کو آپس میں ملاتے ہیں جو چار سے پانچ ارب انسانوں کی آبادی پر مشتمل ہیں۔ زمین پر مبنی تہذیبوں کی یہ حیاتِ نو اتنی صلاحیت رکھتی ہے کہ سٹیک ہولڈر ممالک کے درمیان ترقی کے مواقع پیدا کر سکے اور دیرپا اثرات مرتب کر سکے۔ جھانگ وئے وئے یہ بھی یقین رکھتا ہے کہ بی آر آئی منصوبہ جغرافیائی و سیاسی عالمی اور مغربی ذہنیت کو بدل دے گا اور یہ منصوبہ اس میں شامل ہر ملک کے لیے جیت کی نوید لائے گا، لہٰذا چین کی جانب سے 'ایک ساتھ ترقی کرنے، مل کر بات چیت کرنے اور مل کر فائدہ اٹھانے کی نئی تجویز کا مقصد تمام شراکت داروں کو اعتماد میں لینا' آگے بڑھانا ہے اور ہر ایک کے لیے جیت کی صورتحال پیدا کرنا ہے۔ مختصر یہ کہ بی آر آئی عالمی خوشحالی اور آسودگی کے لیے کام کرنے کے مشترکہ مقصد کے لیے تمام شراکت داروں کی شمولیت پر زور دیتا ہے۔

باب ہفتم

چین اور عالمی برادری

چین کے دنیا کے ساتھ تعلقات خاص طور پر حالیہ برسوں کے دوران اعلیٰ معیاراتی لحاظ سے تبدیل ہوئے ہیں، جس کی وجہ ایک طرف چین کا ایک معاشی دیو کے طور پر ابھرنا ہے اور دوسری طرف اس کا ترقی پذیر دنیا کے ساتھ ترقیاتی طور پر شراکت داری قائم کرنا ہے، چنانچہ مغرب بالخصوص وہ ممالک جن کی قیادت نیٹو کرتا ہے، بشمول امریکہ، برطانیہ، جرمنی اور فرانس، اور ایشیا بحرالکاہل کے ان کے اتحادی جیسے آسٹریلیا اور جاپان وغیرہ، چین کو ایک سیاسی اور معاشی چیلنج کے طور پر دیکھتے ہیں جو اس وقت عالمی سیاست میں اپنے غلبے کا بگل بجانے کے لیے تیار ہے۔

حالیہ برسوں کے دوران، بالخصوص چینی معیشت کے ابھرنے اور گلوبل ساؤتھ میں واقع بڑے ممالک کے ساتھ چین کی شراکت داری کے نتیجے میں سامنے آنے والی چین کی بڑھوتری کو روکنے کے لیے کئی مغربی بلاک سامنے آئے ہیں، جن میں سے ایک بلاک کواڈری لیٹرل سکیورٹی ڈائیلاگ (یا کواڈ) ہے جس میں امریکہ، جاپان، بھارت اور آسٹریلیا شامل ہیں۔ کواڈ کے رکن چاروں ممالک چین کے ساتھ ہر وقت سینگ پھنسائے رکھتے ہیں، خاص طور پر جب سے چین نے اپنے عظیم الشان منصوبے بیلٹ اینڈ روڈ انیشی ایٹو (BRI) کا اعلان کیا ہے۔

اس تناظر میں مذکورہ چاروں ممالک میں سے ہر ایک کے چین کے ساتھ انفرادی تعلقات کا الگ الگ ذکر کرنا اہم ہوگا، تاہم چین اور جاپان کے مابین زیریں سطح کی کشیدگی کی وجہ سے زیرِ نظر سطور میں امریکہ، آسٹریلیا، انڈیا کے ساتھ ساتھ برطانیہ کے حوالے سے بھی بات کی جائے گی۔ برطانیہ اگرچہ کواڈ کا رکن نہیں لیکن ایک اہم ملک ضرور ہے اور اپنا الگ اثر ورسوخ رکھتا ہے۔

امریکہ

دو ہزار سولہ میں جب ڈونلڈ ٹرمپ امریکہ کے صدر بنے تو خارجہ پالیسی اور بین الاقوامی تعلقات کے بہت سے ماہرین نے غلط طور پر یہ سمجھ لیا تھا کہ ٹرمپ جیسے ایک ''غیر روایتی'' صدر کی موجودگی میں امریکہ اور چین کے تعلقات میں بہتری آئے گی' تاہم اپنے پیش رو صدور کی پیروی کرتے ہوئے ٹرمپ نے جلد ہی جان لیا کہ ملک کے اندرونی مسائل سے عوام کی توجہ ہٹانے کا آسان حل یہ ہے کہ انہیں چین کے ساتھ معاملات میں الجھا دیا جائے اور چین کو مطعون کیا جاتا رہے' چنانچہ اس کے نتیجے میں ٹرمپ نے چین بالخصوص اس کی ٹیکنالوجی کی ترقی کے لیے کام کرنے والی کمپنیوں اور بی آر آئی کے خلاف معاشی جنگ چھیڑ دی۔ مزید یہ کہ امریکہ نے چینی خود مختار کمپنی ہواوے کے خلاف کارروائی کر کے بھی چین کو نشانہ بنایا۔ ہوا یہ کہ امریکہ نے ہواوے کے فائیو جی نیٹ ورک پر پابندی عائد کر دی تھی۔ علاوہ ازیں امریکی کمپنیوں کو خبردار کیا گیا کہ وہ ہواوے کے ساتھ نہ تو کوئی تعاون کریں گی اور نہ ہی اس کے ساتھ کوئی کاروبار کریں گی' اس کے نتیجے میں گوگل (سب سے زیادہ استعمال ہونے والے اینڈرائڈ فون آپریٹنگ سسٹم کا تیار کنندہ) نے ہواوے سے اپنی ایپس اور آپریٹنگ سسٹم ہٹا لیے۔

ستمبر 2020ء میں ٹرمپ کی جانب سے چینی ایکسپورٹ پر متکبرانہ قدغنیں لگانے کے عمل کو بھی ہر سمت سے تنقید کا سامنا کرنا پڑا، یہاں تک کہ ورلڈ ٹریڈ آرگنائزیشن (ڈبلیو ٹی او) نے دو سو بلین ڈالر مالیت کی چینی اشیاء پر امریکی ٹیرف کو غیر قانونی قرار دے دیا۔ یہ چین کے لیے ایک بڑی تصدیق اور توثیق تھی کہ وہ درست ہے۔ اس طرح جنیوا میں عالمی تجارت کے حوالے سے قائم اس تنظیم نے ٹرمپ حکومت کے عائد کردہ ان ہائی پروفائل ٹیرفز کے خلاف پہلی بار فیصلہ دیا جو اس نے مختلف ممالک پر لگائے تھے جو دوست بھی تھے اور حریف بھی۔

امریکہ نے متعدد مرتبہ چین کی معاشی اور داخلی پالیسیوں میں مداخلت کی کوشش کی۔ سابق امریکی وزیر خارجہ مائیک پومپیو نے دو ستمبر دو ہزار بائیس کو فاکس نیوز کو دیئے گئے ایک انٹرویو میں چین کو امریکہ کے لیے ایک خطرہ قرار دیا تھا۔ ان کے ان ریمارکس کا جواب دیتے ہوئے چینی

وزارتِ خارجہ کی ترجمان ہوا چن ینگ (Hua Chunying) نے کہا کہ اس طرح کے بیانات دے کر امریکہ نہ صرف اپنی شہرت کو نقصان پہنچا رہا ہے بلکہ امریکہ کی بین الاقوامی تصویر اور ساکھ کو بھی دھندلا رہا ہے۔

پومپیو نے کہا کہ پچھلے چالیس برسوں سے امریکہ چین کی منت سماجت کر رہا ہے لیکن اب صدر ٹرمپ کہتے ہیں کہ بس بہت ہو چکا۔ اس کا جواب دیتے ہوئے ہوا چن ینگ نے کہا کہ ہم سب جانتے ہیں' پومپیو ہمیشہ جھوٹ بولتے ہیں۔ سچ اور بنیادی اخلاقیات سے قطع نظر پومپیو نے اپنے مقاصد حاصل کرنے کے لیے ہمیشہ چین کو داغ دار کیا اور اس کے لیے غلط طریقے اختیار کیے۔ انہوں نے کہا کہ یہ کہنا بھی بے بنیاد ہے کہ چین نے امریکہ کا استحصال کیا' گزشتہ چالیس برسوں کے دوران امریکی اور چینی عوام نے دونوں ملکوں کے مابین باہمی تعلقات کا فائدہ حاصل کیا۔ ہوا چن ینگ نے مزید کہا کہ اعداد و شمار سے پتا چلتا ہے کہ دونوں ممالک کے تجارتی تعلقات کے نتیجے میں امریکہ میں چھبیس لاکھ نئی ملازمتیں پیدا ہوئیں جبکہ ہر امریکی خاندان کو ہر سال ساڑھے آٹھ سو ڈالر کی بچت کرنے میں بھی مدد ملی۔ انہوں نے مزید کہا، ''ایک عظیم طاقت کے طور پر کیا امریکہ کسی ملک کو اجازت دے گا کہ وہ اس کا استحصال کرے؟ اور وہ بھی دس سال سے زیادہ عرصے سے؟ کیا آپ کے خیال میں امریکی کبھی یہ برداشت کریں گے؟، اس کا جواب ہے، نہیں۔''

اسی طرح ہانگ کانگ کے حوالے سے چین کے اندرونی معاملات میں مبینہ امریکی مداخلت پر چینی وزارت خارجہ کے اعلیٰ اہلکار نے کہا کہ امریکی سیاست دان ہانگ کانگ کے بارے میں بیان بازی اور چین کے اندرونی معاملات میں مداخلت بند کریں۔ ستمبر دو ہزار بیس میں کمشنر آفس کے ترجمان کی جانب سے ایک زیرِ تفتیش مقدمے کے بارے میں امریکی سیاست دانوں کے ریمارکس کے خلاف بیان دیا گیا۔ یہ مقدمہ ہانگ کانگ کے رہائشیوں کی مشتبہ غیر قانونی بارڈر کراسنگ کے بارے میں تھا۔

چینی ترجمان نے واضح کیا کہ چین میں قانون کی حکمرانی ہے۔ انہوں نے مزید کہا کہ امریکہ کو شدید معاشی اور سماجی مسائل کا سامنا ہے' نسلی تنازعات اپنی جگہ ہیں' اس کے علاوہ کورونا کا پھیلاؤ اور اس سے ہونے والی اموات ہیں' تاہم کچھ امریکی سیاست دان اپنے ملک کے گمبھیر مسائل

سے تو آنکھیں بند کیے رکھتے ہیں' لیکن دوسرے ممالک کے اندرونی معاملات میں مداخلت کرنا اپنا فرض منصبی سمجھتے ہیں۔ ترجمان نے مزید کہا' ''ہم شدت کے ساتھ امریکی سیاست دانوں پر زور دیتے ہیں کہ وہ عالمی قوانین کی پابندی کریں' بین الاقوامی تعلقات کو چلاتے ہوئے بنیادی آداب کا خیال رکھیں' اور اپنے کام سے کام رکھتے ہوئے فوری طور پر ہانگ کانگ کے معاملات میں اور خاص طور پر چین کے اندرونی معاملات میں مداخلت بند کر دیں۔''

دو ہزار بیس میں ہونے والے الیکشن کے نتیجے میں اگرچہ ڈونلڈ ٹرمپ کو امریکہ کی صدارت سے ہٹا دیا گیا اور ان کی جگہ ڈیموکریٹ کے جو بائیڈن صدر بن گئے' لیکن امریکہ اور چین کے مابین کشیدگی تا حال موجود ہے۔ ڈیموکریٹک کیمپ سے ملنے والے تازہ ترین اشاروں کے مطابق دکھائی دیتا ہے کہ صدر بائیڈن اینٹی چائنہ پالیسی پر ڈٹے ہوئے ہیں' جس کا آغاز ٹرمپ کے دور میں ہوا تھا اور یہ کہ وہ چین کو ایشیا بحرالکاہل کے علاقے تک محدود رکھنا چاہتے ہیں۔ واشنگٹن میں امریکی انتظامیہ اور پالیسی ساز اعتراف کرتے ہیں کہ چین دنیا میں امریکہ کا واحد حریف ہے' جس کا مطلب یہ ہے کہ کواڈ کے رکن ممالک کے درمیان تعلقات اور تعاون مزید بڑھایا جائے گا تاکہ بیجنگ کو مزید آگے بڑھنے سے روکا جا سکے اور محدود کیا جا سکے۔ صدر بائیڈن نے بھی اس بات کا اشارہ دیا کہ چین کو روکنے کے لیے مختلف اقدامات کئے جائیں گے۔ ان اقدامات میں سے ایک، کواڈ کے رکن اتحادی ممالک میں فوجی تعلقات میں اضافہ ہے تاکہ ایشیا بحرالکاہل خطے میں امریکہ کی برتری اور غلبے کو برقرار رکھا جا سکے۔

کواڈ کو متحرک اور متعلقہ رکھنے کے لیے سابق امریکی صدر ٹرمپ نے اپنے اقتدار کے آخری دنوں میں لیجن آف میرٹ (ایل او ایم) (Legion of Merit) ایوارڈ دیے تھے۔ یہ ایوارڈ آسٹریلوی وزیرِ اعظم سکاٹ موریسن، بھارتی وزیرِ اعظم نریندر مودی اور سابق جاپانی وزیرِ اعظم شنز وایبے کو دیے گئے تھے۔ انڈین میڈیا نے ان ایوارڈز کو اعلیٰ ترین امریکی ایوارڈز قرار دیا تھا' جبکہ چین نے ان کو ''محض ایوارڈز'' قرار دیا تھا جن کا اینٹی چین اتحاد کے رکن ممالک کو کوئی حقیقی فائدہ نہیں ہونے والا تھا۔ دوسری طرف جاپان ہے' جو ابھی تک یہ فیصلہ نہیں کر پا رہا کہ وہ کواڈ الائنس میں خود کو ملٹری فوکسڈ رکن قرار دینے کا اعلان کرے یا نہ کرے۔

بائیڈن کے قومی سلامتی کے مشیر جیک سلیوان (Jake Sullivan) نے ایک انٹرویو میں کہا تھا کہ چین، افغانستان اور ایران امریکہ کی نئی انتظامیہ کے لیے بنیادی ترجیحات ہیں۔ انہوں نے مزید کہا' ''ہمارے تناظر میں دیکھا جائے تو ہمارے لیے ایک تشویشناک معاملہ اور پہلی ترجیح ایران ہے جہاں ایک نیوکلیئر بحران کی صورت حال ہے کیونکہ ایران ایٹمی ہتھیار بنانے کے بہت قریب پہنچ چکا ہے۔''

انہوں نے مزید کہا کہ امریکہ کو صاف صاف بات کرنے اور عمل کے لیے تیار رہنے کی ضرورت ہے اور چین جو کچھ سنکیانگ میں کر رہا ہے، جو وہ ہانگ کانگ میں کر رہا ہے اور جو دھمکیاں اور خطرات وہ تائیوان کے لیے پیدا کر رہا ہے اس پر اس کے نتائج مسلط کرنے کے لیے بھی تیار رہنا چاہیے۔ یہ بیانات اور پابندیاں واحد ذرائع نہیں ہیں جو امریکہ چین پر دباؤ ڈالنے کے لیے استعمال کر رہا ہے۔ سنکیانگ پر مغربی بیانیے کو غلط ثابت کرنے اور مسترد کرنے کے لیے چینی حکومت نے مارچ' اپریل دو ہزار اکیس میں اکیس ملکوں کے تیس سفارت کاروں کو سنکیانگ کا دورہ کرایا تھا۔ سفارت کاروں نے وہاں سماج کے مختلف حلقوں سے تعلق رکھنے والے مقامی افراد سے گفتگو کی۔ مختلف مقامی سکولوں اور کاروباری اداروں کا دورہ کیا' اور سنکیانگ کے حوالے سے پھیلائی گئی افواہوں کو رد کر دیا۔ امریکہ اکثر سنکیانگ اور ہانگ کانگ' دونوں کے نام پر نہ صرف چین کے اندرونی معاملات میں مداخلت کرتا ہے بلکہ اس کو عالمی پریشر کے طور پر بھی استعمال کرتا ہے۔

حقائق سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ جب کورونا وائرس نے دنیا بھر میں تباہی مچائی ہوئی تھی تو امریکہ' برطانیہ اور آسٹریلیا میں ہانگ کانگ کے بارے میں کئی قسم کی خبریں لگ رہی تھیں جو کہ کورونا سے ہٹ کر تھیں۔ مغرب کی تین بڑی طاقتیں چین کے خلاف ایک نظریاتی سیاسی بیانیے کو آگے لا رہی تھیں' جبکہ ہانگ کانگ میں جمہوریت کے لیے ہونے والے مظاہروں کے نتیجے میں انہیں ایک سنہری موقع مل رہا تھا کہ وہ چین پر دباؤ کو بڑھا سکیں۔ چین نے جب نیا سکیورٹی قانون بنایا تو یہ سب اس کے خلاف اکٹھے ہو گئے اور وقفے وقفے سے ہانگ کانگ کی صورت حال پر تشویش کا اظہار کرنے لگے۔

اس سے ہمیشہ قائم رہنے والا ان مغربی طاقتوں کا دوہرا معیار آشکار ہوتا ہے جس کو وہ شہریت کے قوانین کو اپنے جیو پولیٹیکل مفادات کے تحت رکھنے کے لیے استعمال کرتی ہیں۔ اس

حوالے سے برطانیہ کے سابق وزیراعظم بورس جانسن نے کہا تھا: ہم واضح کرتے ہیں کہ اگر چین اس راستے پر چلتا رہا تو ہم برٹش نیشنل اوورسیز رتبے کے حامل افراد کے لیے ایک نیا راستہ متعارف کرائیں گے جس کے تحت وہ برطانیہ میں رہ سکیں گے اور کام کر سکیں گے اور یوں برطانوی شہریت کے لیے درخواست دے سکیں گے۔

اسی طرح امریکہ کے سابق وزیرِ خارجہ مائیک پومپیو نے کہا تھا کہ امریکہ اس بات پر غور کر رہا ہے کہ جو لوگ ہانگ کانگ میں آسودگی اور سہولت محسوس نہیں کرتے، انہیں امریکہ آنے کی اجازت دے دی جائے۔ جانسن اور پومپیو، دونوں چین کے ہانگ کانگ میں نئے قانون پر تو تنقید کرتے ہیں لیکن گیارہ ستمبر کے حملوں کے بعد ہوم لینڈ سکیورٹی کے نام پر بنائے گئے کالے قوانین، گوانتاناموبے میں غیر قانونی حراستی مرکز اور عراق، افغانستان اور مشرق وسطیٰ کے کئی ممالک میں انسانی حقوق کی بڑے پیمانے پر ہونے والی خلاف ورزیوں پر فخر کا اظہار کرتے ہیں۔

بورس جانسن پر تنقید کرنے والے انہیں بدنامِ زمانہ ''ونڈرش سیکنڈل'' کے بارے میں یاد دلاتے ہیں، جس سے پتا چلتا ہے کہ کس طرح کیریبین کے جزیروں سے آنے والے بزرگ شہریوں کو، جو انیس سو اڑتالیس اور انیس سو اکہتر میں لیبر کی قلت کو پورا کرنے کے لیے برطانیہ آئے تھے، غیر قانونی طور پر ڈی پورٹ کیا گیا، حراست میں رکھا گیا اور ان کے انسانی حقوق کی خلاف ورزیاں کی گئیں۔ اسی طرح پومپیو کا بیان بھی تعجب خیز ہے کیونکہ ٹرمپ نے تو اپنی ساری انتخابی مہم ہی ''سب سے پہلے امریکہ'' کے نام پر چلائی تھی اور امیگریشن کو بند کر دیا تھا۔ اسی طرح دو ہزار اٹھارہ اور دو ہزار انیس میں بھی ٹرمپ کی ہی حکومت تھی جب بدنام زمانہ فیملی سیپریشن پالیسی (Family Separation Policy) کا نفاذ کیا گیا جس کے تحت وفاقی حکام نے بچوں کو ان کے والدین اور گارڈینز سے الگ کر دیا اور انہیں جانوروں کی طرح پنجروں میں بند کر دیا گیا تھا۔

اہم مغربی طاقتوں کی جانب سے یہ بیانات ایک سوال بھی اٹھاتے ہیں کہ کیوں نہ انسانی حقوق کے حوالے سے اور ہانگ کانگ اور سنکیانگ میں جمہوریت کے حوالے سے 'تشویش' کو لے کر نہ ختم ہونے والے مذاکرات شروع کیے جائیں، چاہے ان پر یقین کرنا مشکل ہو۔ یہاں تک کہ چین نے بھی اس مغربی مہم پر فوری ریکوری کی ہے۔

چینی وزارت خارجہ کی ترجمان ہوا چن ینگ اس حوالے سے کہتی ہیں: ''سنکیانگ مکمل طور پر چین کا اندرونی معاملہ ہے اور امریکہ کو اس میں مداخلت کا کوئی حق نہیں۔ چینی حکومت کا اپنی خود مختاری کی حفاظت کرنے اور دہشت گردی، علیحدگی پسندی اور مذہبی انتہا پسند قوتوں کے خلاف کریک ڈاؤن کا عزم غیر متزلزل ہے۔'' انہوں نے ان خیالات کا اظہار 13 جولائی کو 'ادلے کا بدلہ' کے طور پر متعدد امریکی اعلیٰ حکام کے خلاف ویزے کی پابندیاں عائد کرنے کا اعلان کرتے ہوئے کیا۔

امریکہ میکسیکو بارڈر پر والدین سے الگ کیے گئے بچے پنجروں میں بند ہیں

یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ تائیوان کے امریکہ میں ڈی فیکٹو سفیر نے سرکاری دعوت پر امریکی صدر جو بائیڈن کی تقریب حلف برداری میں شرکت کی تھی۔ یہ پہلا موقع تھا جب تائیوان کے کسی عہدیدار نے امریکی صدر کی تقریب حلف برداری میں شرکت کی تھی۔ چین نے اس کے جواب میں اپنی ہی طرز کا سخت ردِعمل ظاہر کرتے ہوئے واشنگٹن کو واضح پیغام دیا۔ جنوری دو ہزار اکیس میں چین نے سابق ٹرمپ انتظامیہ کے درجنوں عہدیداروں پر پابندیاں لگا دیں۔ جن عہدیداروں پر پابندیاں لگائی گئیں ان کے نام یہ ہیں: ٹرمپ کے وزیر خارجہ مائیک پومپیو، نیشنل سکیورٹی ایڈوائزر رابرٹ او برائن، اقوام متحدہ کے سفیر کیلی کرافٹ، معاشی مشیر پیٹر ناوارو، سفیر ڈیوڈ سٹل ویل، ہیلتھ اینڈ ہیومن سروسز سیکرٹری ایلکس آزر، سابق نیشنل سکیورٹی ایڈوائزر جان بولٹن' تزویراتی ماہرین سٹیفن بینن اور کئی دوسرے لوگ شامل ہیں۔

امریکہ اور مغرب گزشتہ کئی برسوں سے سنکیانگ کے نام پر چین اور مشرق وسطیٰ کے مسلم ممالک کے درمیان فساد کا بیج بونے کی کوشش کر رہے ہیں' تاہم چینی پالیسی سازوں اور ماہرین کا کہنا ہے کہ چین اور امریکہ میں اختلافات کے باوجود دونوں ملکوں میں مختلف ایشوز' جیسے ماحولیاتی تبدیلی اور ایران کے ایٹمی پروگرام' کے حوالے سے پالیسیوں کو لاگو کیا جا رہا ہے جس سے ایک مصالحت کار کے طور پر چین کا کردار سامنے آتا ہے۔ مزید برآں چین مختلف ملکوں' جیسے ایران' میں ترقیاتی کاموں کے ذریعے ایک معاشی کردار بھی ادا کر رہا ہے۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ چین ایک ''امن ساز'' ملک ہے اور مغربی طاقتوں کی طرح ''جارح'' اور اشتعال انگیز نہیں۔

برطانیہ (یو کے)

امریکہ کے متعدد اتحادیوں کی طرح برطانیہ کو بھی امریکی دباؤ کا سامنا ہے کہ وہ اپنے ملک میں چینی سرمایہ کاری کو ختم کرے۔ دیگر مغربی طاقتوں کی طرح ان دونوں ملکوں کے باہمی تعلقات بھی مسلسل خراب ہو رہے ہیں' بالخصوص اس لیے کہ برطانیہ چینی سرمایہ کاری کے خلاف شدید ایکشن کے لیے کوئی مناسب جواز پیش کیے بغیر امریکی پالیسی لائن کی پیروی کر رہا ہے۔ چین بھی کہہ چکا ہے کہ اگر برطانیہ میں چینی کاروباروں کو کام کرنے کی اجازت نہ دی گئی تو چین بھی جوابی اقدامات کرے گا۔

برطانوی حکومت نے حال ہی میں اعلان کیا ہے کہ وہ اپنے آئی ٹی ٹیلی کام نیٹ ورکس سے چین کی کمپنی ہواوے ٹیکنالوجیز کے آلات کو ہٹا دے گا۔ اس کے جواب میں ووڈافون گروپ نے خبردار کیا کہ اگر برطانیہ ہواوے کا بائیکاٹ کرتا ہے تو وہ اپنی فائیو جی ٹیکنالوجی میں دنیا کی قیادت کرنے کی صلاحیت کو کھو دے گا۔ ووڈافون کے چیف ٹیکنالوجی آفیسر سکاٹ پیٹی (Scott Petty) کہتے ہیں کہ اگر موبائل آپریٹرز کو مجبور کیا گیا کہ وہ موجودہ آلات کو تبدیل کرنے میں پیسہ اور وقت لگائیں تو برطانیہ فائیو جی میں عالمی قیادت کو کھو دے گا۔ انہوں نے مزید کہا کہ برطانوی حکومت کو فائیو جی کو ملک بھر میں پھیلانے کے لیے کام کرنا چاہیے اور چینی ٹیلی کام جائنٹ کے آلات کو ہٹانے کے بجائے فائیو جی ٹیکنالوجی میں سرمایہ کاری کرنی چاہیے۔ انہوں نے مزید کہا کہ ہم کسی ایک سپلائر کے ساتھ

بندھے ہوئے نہیں ہیں لیکن ہمارے لیے یہ سمجھنا اہم ہے کہ جو چیز یہاں داؤ پر لگی ہے اس کی شدت کیا ہے۔ کچھ عرصہ قبل ہی اس بات کا انکشاف ہوا تھا کہ برطانیہ ہواوے آئی ٹی انفراسٹرکچر کو استعمال کرتے ہوئے ووڈافون، تھری اور بی ٹی کے ساتھ فائیو جی کو لانچ کرنے والا پہلا ملک بننے جا رہا ہے۔

سابق برطانوی وزیراعظم بورس جانسن نے بھی جنوری دو ہزار بیس میں 35 فیصد مارکیٹ شیئر کے ساتھ برطانوی نیٹ ورکس کی تعمیر میں ہواوے کے کردار کی توثیق کی تھی لیکن پھر وہ آگے بڑھے اور ہواوے کو 'ہائی رسک وینڈر' قرار دیتے ہوئے اسے کور (core) نیٹ ورک آلات سے نکال دیا۔ بظاہر یہ اقدام امریکی دباؤ کا نتیجہ تھا۔ مئی میں بورس جانسن نے ایک بار پھر معاملات کو الٹایا اور دو ہزار تئیس تک ہواوے کے مارکیٹ شیئر کو صفر کر دیا جو بظاہر قدامت پسند بیک بینچرز کے دباؤ کا نتیجہ تھا۔

جون دو ہزار بیس کے اوائل میں امریکی سینیٹر ٹام کاٹن نے یو کے ڈیفنس کمیٹی کے اجلاس کے دوران الزام عائد کیا کہ ہواوے کے آلات برطانیہ میں موجود امریکی فوج کے طیاروں کو نقصان پہنچا سکتے ہیں، تاہم کاٹن نے اپنے دعووں کا کبھی کوئی ثبوت پیش نہیں کیا۔ مئی دو ہزار انیس میں ہواوے پر پابندی لگا کر اور دیگر ستر چینی کمپنیوں کو اینٹیٹی لسٹ (تجارتی پابندیوں کی فہرست) میں شامل کر کے دراصل برطانیہ نے امریکہ کی پیروی کی تھی۔ اگرچہ، جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا، امریکہ نے ہواوے پر مغربی نیٹ ورکس کی جاسوسی کا الزام عائد کیا اور امریکی اتحادیوں نے بھی یہی لائن اختیار کی، تاہم چینی ٹیلی کام جائنٹ کو اس معاملے میں ملوث کرنے کے لیے بہت کم ثبوت پیش کیے گئے۔

برطانوی ماہرین یہ یقین بھی رکھتے ہیں کہ مبینہ طور پر امریکی دباؤ پر ہواوے پر پابندی لگانا برطانیہ کے لیے طویل مدتی تناظر میں نقصان کا باعث بن سکتا ہے، بالخصوص برطانیہ کے یورپی یونین سے نکلنے کی وجہ سے۔ کیمبرج یونیورسٹی میں ڈیپارٹمنٹ آف پولیٹکس اینڈ انٹرنیشنل سٹڈیز کے ایک سابق سینئر فیلو مارٹن جیکوئس (Martin Jacques) نے خبردار کیا ہے کہ برطانوی حکومت کا ہواوے پر پابندی لگانے کا فیصلہ برطانیہ اور اس کے چین سے تجارتی تعلقات کے لیے طویل المیعاد

نتائج واثرات کا باعث بنے گا۔ان خیالات کا اظہار انہوں نے چینی روزنامے گلوبل ٹائمز کے بات چیت کے دوران کیا۔

اسی حوالے سے اظہار خیال کرتے ہوئے انہوں نے مزید کہا تھا،''برطانیہ یورپی یونین سے نکل رہا ہے۔ یہ عمل یکم جنوری دو ہزار اکیس کو فائنل ہونے جا رہا ہے اور یورپی یونین برطانیہ کی سب سے بڑی ٹریڈ پارٹنر ہے؛ چنانچہ اس کے نتیجے میں اچانک ایک بہت بڑا خلا پیدا ہو گیا ہے۔اب برطانیہ نے ہواوے کے ساتھ تعلقات ختم کرنے اور ہواوے کے تمام آلات ہٹانے کا فیصلہ کیا ہے، نہ ہی وہ فائیو جی کے لیے ہواوے کے آلات استعمال کر رہا ہے؟ چنانچہ اس کے نتیجے میں برطانیہ اور چین کے معاشی اور تجارتی تعلقات پر بہت منفی اثر پڑا ہے،اس طرح اب ایک ایسی صورت حال ہے جس میں برطانیہ بیک وقت یورپ اور چین کو مسترد کر رہا ہے۔ یہ ایک ایسی صورت حال بھی ہے جس میں برطانوی معیشت تاریخی طور پر زوال کا شکار ہے۔ برطانوی معاشی تاریخ میں یہ ایک بدترین دور ہے۔میرے نزدیک برطانیہ انتہائی خراب حالات میں گھر چکا ہے' لیکن یہ بھی ہے کہ وہ یورپ اور چین کو مسترد کرنے کی صورت حال کا ازالہ امریکہ کو گلے لگا کر' کر رہا ہے' لیکن اس سے برطانیہ کو زیادہ فائدہ نہیں ہوگا کیونکہ امریکہ اور برطانیہ کے معاشی اور تجارتی تعلقات برطانیہ کے لیے اتنے اہم نہیں ہیں۔اگر امریکہ اور برطانیہ کوئی تجارتی معاہدہ کرتے ہیں' جیسا کہ میرے خیال میں وہ کریں گے' تو اس سے برطانوی جی ڈی پی کو بہت کم فائدہ ہوگا۔اسے دنیا کے ساتھ اپنے تعلقات کے بہت وسیع تناظر کی ضرورت ہے۔تزویراتی پیمانے پر بات کی جائے تو اس حوالے سے فیصلہ کن ملک چین ہے۔ سب سے پہلے یہ کہ چین ایک بہت بڑی معیشت ہے اور مسلسل مزید بڑھ رہی ہے اور جلد ہی یہ دنیا کی سب سے بڑی منڈی بھی ہوگی۔''(مارٹن جیکوئس' گلوبل ٹائمز' 2020ء)

چینی حکام اور میڈیا نے خبردار کیا ہے کہ برطانیہ کی جانب سے امریکی دباؤ پر چینی ٹیکنالوجی پر پابندی لگانے سے دونوں ملکوں کے تعلقات زہر آلود ہو جائیں گے' اور پوائنٹ آف نو ریٹرن پر پہنچ جائیں گے۔ ہواوے کمپنی پہلے ہی برطانیہ میں بڑے پیمانے پر سرمایہ کاری کر چکی ہے۔ یہ سرمایہ کاری ریسرچ اور ڈویلپمنٹ کے شعبوں میں کی گئی ہے' جبکہ اس کی فائیو جی ٹیکنالوجی برطانوی ٹیلی کام کمپنیوں کو ارزاں نرخوں پر خدمات فراہم کرتی ہے۔مزید برآں ہواوے کمپنی پہلے ہی اشارہ

دے چکی ہے کہ وہ کیمرج میں ایک سٹیٹ آف دی آرٹ ریسرچ اور ڈویلپمنٹ کا ادارہ قائم کرے گی جس میں آپٹیکل ڈیوائسز کی تیاری پر توجہ مرکوز رکھی جائے گی تاہم امریکہ کو خوش کرنے کے لیے برطانوی حکومت کی جانب سے چینی کمپنیوں کو نشانہ بنانے سے نہ صرف برطانیہ چین تعلقات کو نقصان پہنچے گا بلکہ ''بریگزٹ'' کے بعد کے منظرنامے میں برطانوی مارکیٹ پر بھی منفی اثرات مرتب ہوں گے۔

آسٹریلیا

آسٹریلیا کے چین کے ساتھ تعلقات حالیہ برسوں میں زوال کا شکار ہوئے ہیں' خصوصاً اس لیے کہ آسٹریلیا کی خارجہ پالیسی پر امریکی اثر ورسوخ زیادہ نظر آتا ہے۔ کینبرا (آسٹریلیا کا دارالحکومت) میں بہت سے لوگ یقین رکھتے ہیں کہ کورونا وائرس اور امریکہ و برطانیہ کی جانب سے چینی کمپنی ہواوے کے فائیو جی نیٹ ورک کے خلاف اقدامات کی وجہ سے چین اور آسٹریلیا کے تعلقات اس وقت نچلی ترین سطح پر ہیں۔ تعلقات میں یہ خرابی نہ صرف آسٹریلیا کے اس مطالبے کی طرف اشارہ ہے جو وہ کورونا کی عالمی وبا پھیلنے کی بین الاقوامی سطح پر تحقیقات کے حوالے سے رکھتا ہے بلکہ آسٹریلیا کی جانب سے ہانگ کانگ کے بارے میں بیان بازی اور دس سالہ دفاعی اخراجات' جو امریکہ کے ساتھ دفاعی تعاون سے براہ راست منسلک ہیں' بھی تعلقات کی اس خرابی کی وجوہات میں سے ہیں۔ یاد رہے کہ ان دفاعی اخراجات میں چین کے خلاف دفاعی انفراسٹرکچر کو مزید مضبوط بنانے کے معاملات بھی شامل ہیں۔ حتمی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ قدامت پسند وفاقی حکومت نے وکٹوریہ کی ریاستی حکومت کے ساتھ بھی سینگ پھنسا رکھے ہیں' جس نے چین کے بیلٹ اینڈ روڈ انیشی ایٹو (بی آر آئی) کے ساتھ تعاون کا اشارہ دیا ہے۔

چین میں پالیسی ساز بھی یہ سمجھتے ہیں کہ آسٹریلیا نے چین کے حوالے سے جو پالیسی تبدیل کی ہے اس کے پیچھے امریکہ کا اثر ورسوخ کارفرما ہے۔ تاریخی طور پر، بالخصوص اوائل انیس سو نوے میں سیاست دان اور تاجر طبقہ اس پر متفق ہو گیا تھا کہ ملک کو دنیا کی سب سے تیز رفتاری سے بڑھنے والی معیشت یعنی چین پر فوکس کرنا ہوگا تاکہ اس طرح اپنی معیشت کو مضبوط بنایا جا سکے۔ کورونا وبا سے پہلے آسٹریلیا کو اپنی آخری کساد بازاری کا سامنا انیس سو اکانوے میں ہوا تھا۔

ستمبر دو ہزار بیس میں آسٹریلیا کی حکومت نے کسی قسم کی پیشگی وارننگ کے بغیر آسٹریلیا میں موجود چینی صحافیوں اور سکالرز کے ویزے منسوخ کر دیے تھے۔ ان میں چائنا نیوز سروس کے آسٹریلین بیورو چیف تاؤ شیلان، چائنہ ریڈیو انٹرنیشنل کے سڈنی بیورو چیف لی دیونگ، سکالر پروفیسر چن ہانگ اور سکالر لی جیان جون شامل تھے۔ چینی حکومت نے آسٹریلیا کے اس فیصلے پر شدید تنقید کی۔ نتیجے کے طور پر آسٹریلیا کی حکومت کو اپنے چین میں موجود صحافیوں کو وہاں سے واپس بلا لیا۔

چائنا انسٹی ٹیوٹ آف انٹرنیشنل سٹڈیز کے لیو چنگ نے آسٹریلیا کے اس اقدام پر تنقید کرتے ہوئے لکھا کہ اگست کے مہینے میں آسٹریلیا کی چین کو ایکسپورٹ میں ایک چوتھائی کمی واقع ہوئی۔ آسٹریلیا کا ٹریڈ سرپلس جولائی میں لگ بھگ نصف ہو گیا' جون کی بلندی سے 43.8 فیصد نیچے آ گیا اور ایکسپورٹ تیزی سے گر گئیں۔ سب سے زیادہ جس چیز کی برآمدات کم ہوئیں وہ لوہے کی کچ دھات تھی۔ چینی صحافیوں کے ساتھ ظالمانہ سلوک کے بعد محسوس ہوتا ہے کہ آسٹریلیا کی ایکسپورٹ کا گراف نیچے آنا تو محض ابتدا تھی۔ تجارت کے علاوہ آسٹریلیا میں چینی باشندوں' جو مقامی قوانین اور ضوابط کی بھرپور پابندی کرتے ہیں، کے ساتھ ناروا سلوک کے بلاشبہ مقامی انڈسٹریز' جیسے رئیل اسٹیٹ، سیاحت اور تعلیم' پر بھی منفی اثرات مرتب ہوں گے۔

چین اور آسٹریلیا دو ہزار بیس کے اختتام کے قریب بھی تنازعات کا شکار تھے۔ چین نے آسٹریلیا کے اقدامات کا جواب دیتے ہوئے اس کی درآمدات پر پابندیاں لگا دیں' بالخصوص سی فوڈ اور وائن پر، جس سے آسٹریلیا کی معیشت پر ضرب لگی۔ دسمبر دو ہزار بیس میں آسٹریلیا نے شراب کی چین میں ڈمپنگ پر چین نے انکوائریاں شروع کر دیں' اور ساتھ ہی آسٹریلیا کی لابسٹر سی فوڈ کی سخت سکریننگ کا عمل شروع کر دیا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس وقت سیاسی ماحول بہت کشیدہ ہو گیا کیونکہ چین نے محسوس کیا کہ آسٹریلیا بیجنگ کے خلاف امریکہ کا کھلے عام ساتھ دینے لگا تھا۔ آسٹریلیا سے درآمدات پر پابندیوں سے یہ چیز بھی سامنے آئی کہ چین نے آسٹریلیا سے مصنوعات پر انحصار کم کرنے کے لیے دوسرے ممالک پر درآمدات کے دروازے کھول دیئے۔

جولائی دو ہزار بیس میں آسٹریلیا کے قائم مقام وزیر امیگریشن ایلن ٹجّ (Alan Tudge)

نے اعلان کیا کہ ان کا ملک ہانگ کانگ کے ہزاروں آسٹریلین شہریوں کو موقع دے گا کہ وہ آسٹریلیا کا ویزا ختم ہونے کے بعد آسٹریلوی پی آر (Permanent Residence) کے لیے درخواست دیں۔ یہ اعلان ایک بڑا سرپرائز تھا کیونکہ ہانگ کانگ آسٹریلین ویزا کا سسٹم اور شہریت کے قوانین دنیا بھر میں سخت ترین قوانین میں سے ایک ہیں' خاص طور پر ان لوگوں کے لیے جو غیر یورپی ہیں اور ایشین بیک گراؤنڈ کے حامل ہیں۔ دو ہزار انیس میں شائع ہونے والی ایک رپورٹ کے مطابق آسٹریلوی وزیر برائے داخلی امور پیٹر ڈٹن (Peter Dutton) نے پارٹنر ویزا کی تعداد کم کر دی جس کے نتیجے میں اسی ہزار درخواستیں زیرالتوا چلی گئیں۔ یہ معاملہ واضح طور پر آسٹریلیا کے مائیگریشن ایکٹ کی روح کے خلاف تھا۔ درخواست دہندگان کی اکثریت' جنہوں نے آسٹریلوی باشندوں سے شادیاں کر رکھی ہیں، کا تعلق جنوبی ایشیا اور مشرقِ وسطیٰ سے ہے جو اپنی درخواستوں کے حوالے سے انتظار کی قطار میں کھڑے ہیں۔ یہ ایک امتیازی اقدام ہے جس میں ایشیائی امیگرینٹس کو تعصب کا نشانہ بنایا جا رہا ہے' اور یہ اقدام جیوپولیٹکس کے حوالے سے دوہرے معیارات کا بھی غماز ہے۔

اور اگر جیوپولیٹکس کو ایک گائیڈ سمجھ لیا جائے تو ہمیں حیران نہیں ہونا چاہیے۔ آسٹریلیا کواڈ کا حصہ ہے۔ امریکہ، جاپان اور بھارت اس اتحاد کے دیگر ارکان ہیں جس کو انڈیا بحرالکاہل خطے میں امریکی قیادت میں جیوپولیٹیکل بساط کی توسیع قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس گروپ میں شامل تمام ہی ملک چین کی بڑھتی ہوئی طاقت سے بیک وقت خائف بھی ہیں اور خوف زدہ بھی' اور یہ بنیادی طور پر ایشیا بحرالکاہل خطے میں چائنہ فوکسڈ شراکت داری ہے۔

دوسری جانب آسٹریلیا ایک اینٹی بی آر آئی اپروچ بھی رکھتا ہے' امریکہ اور برطانیہ کے مطابق سوچتا ہے' اور اپنی ریاستوں کے چین کے ساتھ کسی قسم کے تجارتی معاہدے کرنے کی حوصلہ شکنی کرتا ہے۔ دو ہزار اٹھارہ میں لیبر حکومت کے تحت وکٹوریہ ریاست نے بی آر آئی کے معاملے پر چین کے ساتھ ایک سمجھوتے کی یادداشت (میمورنڈم آف انڈرسٹینڈنگ یعنی ایم او یو) پر دستخط کیے تھے۔ اس ایم او یو کے مطابق وکٹوریہ ریاست کو بی آر آئی کے منصوبوں میں شامل ہونا تھا' تاہم ریاست کے حکمران ڈین اینڈریوز اور ان کی لیبر حکومت کو اس ایم او یو پر دستخط کرنے پر امریکہ اور آسٹریلیا کی وفاقی حکومت کی جانب سے شدید تنقید کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وکٹورین

حکومت اور چین کے مابین منصوبے کھٹائی میں پڑ گئے۔

اگرچہ آسٹریلیا میں ابتدائی اشاروں سے پتا چلتا تھا کہ جب چین کا معاملہ آتا تو تمام پارٹیاں ایک ہو جاتی تھیں، لیکن یہ سب کچھ اس وقت بدل گیا جب اپوزیشن لیڈر انتھونی البانیز نے دسمبر دو ہزار بیس میں وزیراعظم سکاٹ موریسن پر کاٹ دار حملہ کیا اور ان پر چین سے تعلقات خراب کرنے کا الزام عائد کیا۔ ان کا کہنا تھا: ''محسوس ہوتا ہے کہ یہ حکومت تعلقات کے مکمل خاتمے کے لیے برسرِ اقتدار آئی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وزراء ایک دوسرے کے فون تک نہیں اٹھاتے۔ میرے خیال میں یہ صورتحال غیر معمولی ہے۔ جب میں وزیر تھا تو چینی وزراء نے آسٹریلیا کے دورے کیے اور میں بھی قومی مفاد میں چین گیا تھا اور آسٹریلین ملازمتوں کو پروموٹ کرنے کے لیے چین کا دورہ کیا تھا۔''

نومبر دو ہزار بیس میں چینی سفارت خانے کے ایک عہدیدار نے نام ظاہر نہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ آسٹریلیا کو چین کے خلاف اپنی سرد جنگ کی ذہنیت سے جان چھڑانا ہوگی ورنہ چینی وزراء آسٹریلوی وزراء کے فون اٹھانا بند کر دیں گے۔

انہوں نے مزید کہا، ''یقیناً آپ کہہ سکتے ہیں کہ ٹینگو (ایک مغربی ڈانس) کے لیے دو افراد کی ضرورت ہوتی ہے، لیکن یہاں آپ دیکھ سکتے ہیں کہ سارا مسئلہ آسٹریلیا کا پیدا کردہ ہے۔ ایک خطرے کے بجائے چین کو موقع کے طور پر دیکھنے کے لیے سرد جنگ کے زمانے کی ذہنیت ترک کرنی چاہیے۔ چین یہ پیغام دینے کی کوشش کر رہا ہے کہ آسٹریلیا کو ذہنیت بدلنی چاہیے کہ وہ چین اور اس کی ترقی کو کیسے دیکھتا ہے، آیا یہ ایک خطرہ ہے یا ایک موقع۔ یہی اصل معاملہ ہے۔''

اگرچہ بیجنگ کے ساتھ کشیدہ تعلقات کے نتیجے میں آسٹریلیا کی معیشت کو مختصر مدتی اور طویل مدتی، دونوں قسم کے نقصانات ہوں گے، لیکن آسٹریلیا کی طرف سے جو پیغامات موصول ہوئے ہیں، ان سے پتا چلتا ہے کہ آسٹریلیا چین کے حوالے سے برآمدات اور ریونیو میں نقصان اٹھانے کو تیار ہے لیکن وہ جاپان، امریکہ اور انڈیا کے ساتھ ''کواڈ اتحاد'' کو مضبوط بنانا چاہتا ہے۔

بھارت

جب چین کورونا وائرس کی عالمی وبا سے نمٹنے کی کوششوں میں مصروف تھا تو امریکی صدر

ڈونلڈ ٹرمپ بیجنگ کو آڑے ہاتھوں لے رہے تھے اور برطانیہ، آسٹریلیا، بھارت اور فرانس کے ساتھ ہم آواز ہو کر ایک کورس کی صورت میں کورونا وائرس کو ''ووہان وائرس'' یا ''چائنہ وائرس'' کا نام دے رہے تھے۔ جب اس سے کام نہ بنا تو بھارت اور چین کے درمیان اکسائے چن (Aksai Chin) کا مسئلہ اٹھا کر چین کے خلاف نیا ڈنڈا اٹھا لیا گیا۔ اس سے ایشیا میں مفادات کی کثیر جہتی جنگ اور شدید جیو پولیٹیکل فطرت سامنے آئی۔ ہند امریکہ اتحاد خطے میں چین پاکستان اور روس کے بڑھتے ہوئے اثر و رسوخ کو روکنے کی کوشش کر رہا ہے۔

جنوبی ایشیا میں زیادہ تر مشاہدہ کار گلوان تنازع، جو کہ تین ہزار میٹر کی بلندی کے ساتھ دنیا کے بلند ترین میدان جنگ میں سے ایک ہے، کو انڈیا کی اس حرکت کے تناظر میں دیکھتے ہیں جو اس نے کشمیر میں کی، یعنی پانچ اگست دو ہزار انیس کو اپنے ہی آئین کے آرٹیکل تین سو ستر کی کھلی خلاف ورزی اور کشمیر کا زبردستی انڈین علاقے میں ادغام۔ یہ اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل کی قراردادوں کی کھلی خلاف ورزی تھی۔

موجودہ جغرافیائی و سیاسی (جیو پولیٹیکل) آراء یہ بات بالکل واضح کر دیتی ہیں کہ بھارت اور پاکستان، دونوں بالترتیب امریکہ اور چین کی نظر میں بہت اہم پوزیشن رکھتے ہیں۔

لداخ، اعصاب کا امتحان

وسط جون دو ہزار بیس میں لداخ خطے کے بارڈر کے علاقے گلوان وادی میں چینی اور انڈین فوجیوں کے درمیان لڑائی ہوئی۔ اس لڑائی کے ہونے تک کوئی تصور نہیں کر سکتا تھا کہ اس دست بدست لڑائی میں اول الذکر اس قدر طیش کا مظاہرہ کرے گا۔ لڑائی میں بیس بھارتی فوجی ہلاک ہوئے۔ بتایا جاتا ہے کہ لڑائی کے دوران ایک بھارتی کمانڈنگ آفیسر کو دریا میں دھکا دے دیا گیا، جس کے بعد دونوں اطراف کے سینکڑوں فوجی لڑنے لگے، اس لڑائی میں ڈنڈوں اور پتھروں کا آزادانہ استعمال کیا گیا۔ انیس سو پچھتر کے بعد یہ انڈیا کی چین کے ساتھ مہلک ترین جھڑپ تھی جس سے نہ صرف خطے میں کشیدگی بڑھ گئی بلکہ دنیا بھر میں خطرے کی گھنٹیاں بج اٹھیں۔

یہ لڑائی دیگر قابل ذکر لڑائیوں سے مختلف تھی، بالخصوص ان لڑائیوں سے مختلف جن میں

پاکستان اور بھارت ملوث ہوتے تھے۔تقریباً بیس فوجیوں کی ہلاکت کے بعد بھارتی حکومت محض اپنی خفت مٹانے کی کوشش کرتی رہ گئی جبکہ اس کے قوم پرست اور جنگ پسند میڈیا نے صبر کا مشورہ دیا۔نئی دہلی زیادہ سے زیادہ جو کرسکتا تھا وہ یہی تھا کہ چین کی چند موبائل ایپس پر پابندی لگا دے' اور بی جے پی کے کارکنوں کو ٹھنڈا کرنے کے لیے کچھ کرے' جو چین کے ساتھ ایک مکمل جنگ کا مطالبہ کر رہے تھے۔

لداخ میں یہ لڑائی کئی سفارتی اور فوجی سطح کے مذاکرات کے بعد بھی جاری رہی۔ایک جزوی ڈس انگیج منٹ بھی شروع ہوئی۔پہلی بار اس وقت جب دونوں ملکوں کے خصوصی نمائندوں اجیت ڈوول اور وانگ یی' جن کو ذمہ داری سونپی گئی تھی کہ وہ اس سرحدی تنازع کا کوئی حل نکالیں' نے پانچ جولائی دو ہزار بیس کو اس پر بات کی تھی۔پھر اسی سال کے ماہِ ستمبر میں وانگ یی (جو رسمی طور پر چینی سٹیٹ کونسلر اور وزیر خارجہ ہیں) اور بھارتی وزیر خارجہ سبرامنیم جے شنکر ماسکو میں شنگھائی تعاون تنظیم کے اجلاس کی سائیڈ لائن پر ملے تھے۔اس حوالے سے جاری کیے گئے اعلامیہ میں کہا گیا' ''دونوں وزرائے خارجہ میں اس بات پر اتفاق ہوا ہے کہ بارڈر ایریاز کے موجودہ حالات دونوں ملکوں کے مفاد میں نہیں چنانچہ ان میں اتفاق ہوا کہ دونوں طرف کے سرحدی فوجیوں کو بات چیت جاری رکھنی چاہیے' تیزی سے ڈس انگیج کرنا چاہیے' مناسب فاصلہ رکھنا چاہیے' اور ٹینشن میں کمی لانی چاہیے۔''

اس بیان پر تبصرہ کرتے ہوئے اخبار 'ڈیلی ہندو' نے دعویٰ کیا تھا کہ چینی فوج نے لداخ میں ایک ہزار مربع کلومیٹر کے بھارتی علاقے پر قبضہ کر رکھا ہے۔

اخبار نے 'دی وائر' کے حوالے سے لکھا ''انڈیا نے امن کے لیے جتنی زمین چھوڑی اس کی تقابلی نقطہ نظر سے بات کی جائے تو بھارت کے قومی دارالحکومت کا کل رقبہ 1464 مربع کلومیٹر ہے۔انڈیا نے اس حقیقت کو تسلیم کر لیا ہے کہ چینی فوج اکسائے چن میں واقع اس علاقے کو خالی نہیں کرے گی۔''

'دی وائر' نے اس بات کی بھی نشان دہی کی کہ مشترکہ اعلامیہ میں بھارت کا مؤقف موجود نہیں تھا کہ چینی فوج 'سٹیٹس کو' کو بحال کر دے گی' یعنی جھڑپوں سے پہلے والی اپریل کی پوزیشن پر

واپس چلی جائے گی۔ 'دی وائر' کا یہ بھی کہنا تھا کہ اعلامیہ میں 1993ء والی لائن آف ایکچوئل کنٹرول (ایل او سی) کا بھی کوئی حوالہ موجود نہ تھا۔

اس تمام تر تنازع کے دوران جو چیز سب سے واضح تھی، وہ چین کا صبر و تحمل کا رویہ اور بات چیت پر زور تھا۔ چینی اخبار 'گلوبل ٹائمز' کے ایڈیٹر ہوشی جن کا دعویٰ ہے کہ اس معاملے پر غیر ضروری قیاس آرائیوں کو روکنے کے لیے چینی فوج نے اس تنازع میں ہلاک اور زخمی ہونے والے فوجیوں کے اعداد و شمار شائع نہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ وہ لکھتے ہیں: ''میں سمجھتا ہوں، چین نہیں چاہتا کہ دونوں ملکوں کے عوام مرنے والے فوجیوں کی تعداد کے حوالے سے کوئی موازنہ کریں تاکہ عوامی جذبات مشتعل نہ ہوں۔ یہ بیجنگ کی جانب سے ایک طرح کا خیر سگالی کا پیغام ہے۔''

چین بھارت تعلقات کا ریورس گیئر

بھارت کی جانب سے نہایت ڈھٹائی کے ساتھ کشمیر کا اپنے اندر انضمام اور اکسائے چن کے علاقے میں فوجی تصادم، دونوں سفارتی منفی اثرات سے خالی اقدامات نہیں ہیں۔

اکتوبر دو ہزار انیس کے دوران جنوبی بھارت کے شہر چنائی میں چینی صدر شی جن پنگ کے ساتھ ایک غیر رسمی ملاقات میں بھارتی وزیر اعظم مودی نے اتفاق کیا تھا کہ دو ہزار بیس کے سال کو 'چین بھارت کا سال' قرار دیا جائے گا جس میں ثقافتی اور عوامی وفود کے تبادلے ہوں گے جبکہ چین بھارت سفارتی تعلقات کے ستر سال پورے ہونے پر ستر پروگرام منعقد کیے جائیں گے۔ مودی اور شی جن پنگ نے اس بات پر بھی اتفاق کیا تھا کہ دو ہزار بیس میں بھارت اور چین کے تعلقات کے ستر سال پورے ہونے پر ہر سطح پر وفود کے تبادلے کیے جائیں گے۔

مشرقی لداخ کے علاقے اکسائے چن میں فوجی تصادم اور پھر کووڈ 19 وبا کے پھوٹ پڑنے کی وجہ سے دونوں لیڈروں کے مابین جو بھی کچھ بھی طے ہوا تھا اس کا کوئی نتیجہ نہ نکل سکا اور یوں وہ سارے اقدامات بھی ضائع گئے جو صدر شی جن پنگ نے بھارت کو وسیع تر خطے کے مفاد میں اٹھانے کی طرف مائل کرنے کے لیے کیے تھے۔

پاکستان پر اثرات

ان سب چیزوں کا پاکستان پر بھی براہ راست اثر پڑا۔ تزویراتی صلاحیتوں کے حوالے سے بات کی جائے تو بارڈر پر بھارت کی چین کے ساتھ لڑائی سے نئی دہلی کا پاکستان پر سے فوکس ہٹ جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ بھی ہے کہ چین کے ساتھ لڑائی کے نتیجے میں بھارت کو مقبوضہ کشمیر میں موجود اپنے جنگی آلات اور ہتھیاروں کو چین کے ساتھ بارڈر پر منتقل کرنا پڑیں گے۔

آسٹریلوی سکالر ڈاکٹر کلاڈ راکیسٹس (Dr. Claude Rakisits) اس حوالے سے لکھتے ہیں: ''لداخ میں ضروری فوجی ری انفورسمنٹ کے لیے نہ صرف بھارت کو شدید افرادی اور مالی اخراجات برداشت کرنا پڑیں گے بلکہ اس کا مطلب یہ بھی ہوگا کہ ان فوجی اثاثوں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنے سے بھارت کی آزاد کشمیر اور گلگت بلتستان میں کسی قسم کی موو (Move)' اگر اس کا موقع ملا تو' کی صلاحیت کمزور ہو جائے گی۔ اس لحاظ سے یہ پاکستان کے لیے ایک اچھی خبر ہے۔''

امریکی تھنک ٹینکر اور جنوبی ایشیا کے حوالے سے سکالر مائیکل کوگل مین بھی اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ بھارت نے جس طرح چین کو اپنے دماغ پر سوار کر لیا ہے' اس سے پاکستان اور بھارت کے مابین مسئلہ کشمیر پر براہ راست اثر پڑے گا۔ وہ مزید کہتے ہیں ''ہم لداخ بحران کو مسئلہ کشمیر سے الگ نہیں کر سکتے۔ چین اور بھارت کے مابین لائن آف ایکچوئل کنٹرول (ایل اے سی) پر جب تک کشیدگی ہے' اور مستقبل قریب تک صورت حال کشیدہ ہی نظر آتی ہے' پاک بھارت لائن آف کنٹرول (ایل او سی) بھی گرم رہے گی۔

ایک اور چیز جس پر بھارت کو غصہ اور تشویش ہے' بالخصوص نئی دہلی میں سکیورٹی اسٹیبلشمنٹ کے لیے' یہ یقین ہے کہ گلوان وادی میں لڑائی سے پہلے پاکستان نے چین کو ضرور انٹیلی جنس معلومات فراہم کی ہوں گی۔ امریکی انٹیلی جنس ذرائع کا حوالہ دیتے ہوئے انڈین آن لائن اخبار 'دی پرنٹ' نے حال ہی میں نئی دہلی میں پالیسی سازوں کو خبردار کیا کہ گلوان وادی میں بھارتی فوج کی پوزیشن کے بارے میں بہتر معلومات سے ثابت ہوتا ہے کہ اسلام آباد نے چین کو انٹیلی جنس فراہم

کی۔(دی پرنٹ'2020ء)

اس کے علاوہ بھارت کا زیادہ تر میڈیا پاکستانی سوشل میڈیا پر الزام عائد کرتا ہے کہ وہ غلط معلومات پھیلاتا ہے اور اکسائے چن میں چینی بیانیے کی حمایت کرتا ہے۔ پاکستان نے اس معاملے پر کوئی بات کرنے سے گریز کیا' لیکن اگر یہ سچ ہے تو بھی یہ پاک چین تعلقات کے حوالے سے ایک نئی جہت کو اجاگر کرتا ہے جو کہ سی پیک کے تحت سامنے آئی ہے۔ پھر یہ بھی ہے کہ دو قریبی تزویراتی اتحادیوں کے لیے ایسا تعاون غیر معمولی بھی نہیں ہے۔

یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ خارجہ پالیسی کے حوالے سے وزیرِ اعظم مودی کا جارحانہ رویہ اس وقت مزید اڑیل ہو گیا جب مارچ دو ہزار سولہ میں پاکستان نے انڈین جاسوس کلبھوشن یادیو کو پکڑا جو کہ انڈین نیوی کا افسر تھا جس کے پاس جعلی پاسپورٹ تھا' اور جس پر اس کا اسلامی نام مبارک حسین پٹیل درج تھا۔ چھبیس فروری دو ہزار انیس کو بھارت کا سرجیکل سٹرائیک کے نام پر پاکستان میں مبینہ ٹریننگ کیمپ پر حملہ اور اگلے دن پاکستان کی جانب سے انڈین طیارہ مار گرائے جانے کے بعد دونوں ملکوں میں کشیدگی بہت بڑھ گئی تھی۔ 5 اگست کو بھارت کے کشمیر پر قبضے کے بعد تو یہ کشیدگی ایک نئے لیول پر پہنچ گئی تھی۔ دریں اثناء بھارت کے ضدی رویّے کی وجہ سے اس کے ہمسایہ دوست ملکوں' جیسے نیپال اور بنگلہ دیش' کے ساتھ تعلقات بھی خراب ہوئے۔

2020ء میں مائیک پومپیو نے اپنے بھارتی ہم منصب سبرامنیم جے شنکر کو کال کی اور کہا تھا کہ انڈیا امریکہ تعلقات کی طاقت سے ہند بحرالکاہل (انڈو پیسفک) اور پوری دنیا میں امن' خوشحالی اور سلامتی لانے میں مدد ملے گی۔ اس تجدید شدہ شراکت داری میں جاپان اور آسٹریلیا بھی شامل ہیں جو کواڈ کا حصہ ہیں جبکہ کچھ چھوٹی علاقائی ریاستیں بھی ان کے ساتھ ہیں۔ اگرچہ انڈو پیسفک میں چین مخالف اس امریکی اتحاد کا مقصد پاکستان کو نشانہ بنانا نہیں ہے لیکن اس کا چین پر فوکس پاکستان کے لیے تزویراتی مضمرات کا حامل ہو سکتا ہے اور یوں پاکستانی لیڈرز پر ایک بھاری ذمہ داری عائد کرتا ہے کہ وہ اپنے دیرینہ بااعتماد دوست ملک کے طور پر بیجنگ کو نہایت احتیاط سے ہینڈل کریں جو بحیرہ عرب کے کنارے پر سیاسی طور پر مستحکم اور معاشی طور پر ترقی پذیر دوست ملک کی خواہش رکھتا ہے۔

پاکستان کی 'تنہائی'

چین کی ہمہ جہت سپورٹ نے مودی حکومت کی ان کوششوں کو بھی ناکام بنانے میں مدد دی جو وہ پاکستان کو دنیا میں تنہا کرنے کے لیے کر رہی تھی۔ اس کے برعکس جب گیارہ ستمبر 2020ء کو دوحا میں انٹرا افغان مذاکرات شروع ہوئے تو امریکہ، برطانیہ، ناروے اور چین نے ان مذاکرات کے انعقاد میں پاکستان کے کردار کی خوب تعریف کی تھی۔

افغان امن عمل کے دوران امریکی صدر ٹرمپ کے خصوصی نمائندے زلمے خلیل زاد خصوصی طور پر اسلام آباد آئے اور اس سلسلے میں اپنی حکومت کی جانب سے شکریے کا پیغام دیا۔

امریکی سفارت خانے کی ایک پریس ریلیز میں اس سلسلے میں کہا گیا: ''امریکی سفیر خلیل زاد نے اپنی حکومت کی جانب سے تعریفی کلمات پیش کیے، بالخصوص پاکستان کے وزیراعظم (اب سابق) عمران خان اور آرمی چیف جنرل باجوہ (اب سابق) کے اہم کردار کی تعریف کی، جو انہوں نے بارہ ستمبر کو دوحا میں افغانستان امن مذاکرات کے انعقاد میں ادا کیا۔''

یہ بات شک و شبہے سے بالاتر ہے کہ سی پیک کی شراکت داری نے ایک ایسے ملک میں اعتماد کی روح پھونکی جو دو ہزار پندرہ تک زخموں سے چور چور، سیاسی طور پر بدحال، بین الاقوامی طور پر تنہائی کا شکار اور معاشی طور پر جدوجہد کی حالت میں تھا، لیکن اس کے بعد کے واقعات سے پاکستان کی ایک مختلف تصویر دنیا کے سامنے آئی، جس کی نمائندگی دو ہزار اٹھارہ سے (سابق) وزیراعظم عمران خان اور (سابق) آرمی چیف جنرل قمر جاوید باجوہ کر رہے تھے۔ زیادہ تر خارجہ پالیسی ایشوز میں دونوں ہم آہنگ تھے اور اپنے امریکی، چینی اور عرب مذاکرات کاروں سے ایک ہی آواز میں گفتگو کر رہے تھے۔

اس کا مطلب جغرافیائی سیاسی نقشے پر پاکستان کی بحالی بھی ہے جو دونوں کے اعتماد سے لطف اندوز ہو رہا ہے، دونوں یعنی دنیا کی واحد سپر پاور امریکہ اور اس کو براہ راست چیلنج کرنے والا چین۔ درحقیقت پاکستان کے یوم آزادی چودہ اگست کے موقع پر چینی اور امریکی سفیر جو خصوصی پیغام دیتے ہیں، ان سے بھی پتا چلتا ہے کہ بیجنگ اور واشنگٹن اسلام آباد کو خوش کرنے کی کوشش کر رہے

ہیں۔اس ویڈیو پیغام میں اس وقت کے امریکی سفیر پال جونز نے کہا تھا کہ ہمیں پاکستان کے ساتھ شراکت داری پر فخر ہے کیونکہ جب پاکستان پھلتا پھولتا ہے تو دنیا ایک بہتر اور محفوظ جگہ بنتی ہے۔

چینی نمائندے یاؤجِنگ نے اس سے بھی زیادہ طاقتور پیغام دیا ''میں پاکستانی قوم کو اس کے یوم آزادی پر نیک خواہشات کا پیغام دیتا ہوں۔ میری نیک تمنائیں برادر ملک پاکستان کے ساتھ ہیں۔اللہ کرے کہ پاکستان میں امن قائم ہو اور یہاں آسودگی بڑھے۔''

کمیونسٹ پارٹی آف چائنا سنٹرل کمیٹی کے انٹرنیشنل ڈیپارٹمنٹ کے سربراہ سونگ تاؤ نے اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھتے ہوئے پاکستانی سیاست دانوں کے ساتھ ایک ویبینار (webinar) میں یہ کہا کہ ہم سونے یعنی گولڈ کو تو چھوڑ سکتے ہیں لیکن پاکستان کے ساتھ اپنی دوستی کو نہیں چھوڑ سکتے۔

اس دوران متعدد بھارتی فوجی تزویراتی ماہرین کچھ ہمسایہ ممالک کے ساتھ وزیراعظم نریندر مودی کے جارحانہ رویے کے حوالے سے محتاط رہے، جس کے بارے میں ان کا خیال ہے کہ اس سے بھارتی فوج کی کمزوریاں واضح ہو کر سامنے آئی ہیں، بالخصوص اکسائے چن میں۔

ماضی میں بھارت کی چین اور پاکستان کے ساتھ ہونے والی جھڑپوں میں ایک ہی وقت میں لائن آف کنٹرول (پاکستان کے ساتھ) اور لائن آف ایکچوئل کنٹرول (چین کے ساتھ) دونوں گرم ہو گئی تھیں، جس سے یہ خطرہ پیدا ہو گیا تھا کہ پاکستان اور چین، دونوں مل کر یا ایک اکٹھ بنا کر بھارت کو نشانہ بنا سکتے ہیں، اور وہ بھی ایک ایسے موقع پر جب بھارت میں کورونا وائرس نے تباہی مچائی ہوئی ہے۔

گرفتھ یونیورسٹی آسٹریلیا کے پروفیسر آف انٹرنیشنل ریلیشنز ایان ہال نے اس حوالے سے اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہا کہ نئی دہلی واضح طور پر شدید دباؤ میں ہے، چاہے یہ کورونا کا مسئلہ ہو، لائن آف کنٹرول پر پاکستان کے ساتھ جھڑپ ہو یا چین کے ساتھ کوئی خطرہ ہو۔ وہ انڈیا کے لیے اسی قسم کی تشویش کا اظہار کرتے ہیں، تاہم یہی صورت حال پاکستان کے لیے بھی خطرناک حالات پیدا کر سکتی ہے۔ اپنے حامیوں کو یہ بتانے کے لیے کہ بھارت اب بھی طاقتور ہے، مودی پاکستان کے خلاف ایک اور مس ایڈونچر کر سکتے ہیں۔

ریٹائرڈ جنرل اور پاکستان کے سابق نیشنل سکیورٹی ایڈوائزر محمود درانی یقین رکھتے ہیں کہ چین بھارت کے لیے ایک بڑی شرمندگی اور خجالت کا باعث ہے۔ چین کی طاقت کی وجہ سے بھارت اس پر حملہ نہیں کرسکتا۔ ان کا خیال ہے کہ اس کا نتیجہ یہ ہوسکتا ہے کہ بھارت اپنی طاقت اور مسلز کے اظہار کے لیے پاکستان کے خلاف کچھ کرے جو کہ چین کا ایک چھوٹا پارٹنر ہے۔

تاہم فروری دو ہزار انیس میں بالاکوٹ سرجیکل سٹرائیک، جس میں بھارت کا پائلٹ ابھینندن گرفتار ہوا' میں شرمندگی اٹھانے کے بعد بھارت پاکستان کے ساتھ کسی قسم کا تنازع کھڑا کرنے سے پہلے کئی مرتبہ سوچے گا' حتیٰ کہ موجودہ صورت حال میں بھارت کے دفاعی اور ایئر فورس ماہرین کھلے عام یہ اعتراف کرنے پر مجبور ہیں کہ کم بجٹ اور کم وسائل کے باوجود پاکستانی ایئر فورس انڈین ایئر فورس سے کہیں زیادہ برتر اور بہتر ہے۔

جریدے 'دی پرنٹ' میں 2020ء میں سامنے آنے والی ایک رپورٹ میں کہا گیا کہ پاکستان کے پاس بہتر لڑاکا طیارے، بیونڈ وژول رینج ایئر ٹو ایئر میزائل جیسے AMRAAM اور سٹیٹ آف دی آرٹ ایئر بورن وارننگ اینڈ کنٹرول سسٹم (AWACS) موجود ہیں جس کے نتیجے میں انڈین ایئر فورس متعدد شعبوں میں پاکستان سے پیچھے رہ گئی ہے۔

علاوہ ازیں پاکستان کا چین کے ساتھ الائنس بھی اسے بھارت پر ایک طرح کی برتری اور نفسیاتی ایج (edge) دیتا ہے۔ انڈیا کے کچھ فارن پالیسی ایکسپرٹ نئی دہلی کو کہہ رہے ہیں کہ وہ اسلام آباد کو سنجیدگی سے لے' بالخصوص ایک ایسی صورت حال میں جب چین کے پاکستان کے ساتھ معاشی مفادات میں اضافہ ہو رہا ہے۔ یہ مفادات ترقیاتی کاموں اور انفراسٹرکچر میں سرمایہ کاری ذریعے پیدا ہو رہے ہیں' اور ان کا مطلب یہ بھی ہے کہ چین ایک مستحکم اور خوش حال جنوبی ایشیا کے لیے کوشش کر رہا ہے' چاہے اس میں بھارت شامل ہو یا نہ ہو؛ چنانچہ اس میں کوئی حیرانی کی بات نہیں کہ اس سے پہلے پاکستان میں جو دہشت گردانہ حملے خیبر پختون خوا میں افغان بارڈر کے اس پار سے ہوتے تھے' اب وہ بلوچستان سے ہونے لگے تھے جو کہ سی پیک کے منصوبوں' جن میں گوادر پورٹ سرفہرست ہے، کا مرکز ہے۔ جب جون دو ہزار بیس میں بلوچستان لبریشن آرمی کے دہشت گردوں نے پاکستان سٹاک ایکسچینج پر حملہ کیا تھا تو پارلیمنٹ سے خطاب کرتے ہوئے اس وقت کے پاکستانی

وزیراعظم عمران خان نے کہا تھا کہ بلوچستان میں موجود دہشت گردوں کو بھارت کی پشت پناہی حاصل ہے۔اس سے پہلے دو ہزار اٹھارہ میں بی ایل اے نے کراچی میں چینی قونصل خانے پر حملے کی ذمہ داری بھی قبول کی تھی جبکہ مئی دو ہزار انیس میں پرل کانٹی نینٹل ہوٹل گوادر پر حملے کی ذمہ داری کو بھی قبول کیا تھا۔

حکام ان دہشت گردوں کو بھارت سے منسلک کرتے ہوئے حیرت کا اظہار کرتے ہیں کہ آخر وہ کیا چیز ہے جو ان دہشت گرد گروپوں کو متحرک کرتی ہے۔

گوادر میں ایک بلوچ سکول ٹیچر نے اپنا نام ظاہر نہ کرنے کی شرط پر دہشت گردی کے حوالے سے اظہار خیال کرتے ہوئے بتایا کہ کوئی بھی باشعور بلوچ صوبے کو غیر مستحکم کرنا، چینیوں کو وہاں سے نکالنا اور صوبے کو ایک بار پھر غربت اور پسماندگی کے چکر میں دھکیلنا نہیں چاہے گا۔

سابق وزیراعظم عمران خان نے اگست 2020ء میں پارلیمنٹ سے خطاب کرتے ہوئے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ اس بات میں کوئی شک وشبہ نہیں کہ ان حملوں کے پیچھے بھارت ہے۔

ان حملوں سے اشارہ ملتا ہے کہ بھارت مستقبل میں اس قسم کے پراکسی عناصر کو استعمال کرے گا تاکہ سی پیک کو نقصان پہنچا سکے اور پاک چین دوستی میں دراڑ ڈال سکے۔ بھارت اور امریکہ پہلے ہی کھلے عام سی پیک کی مخالفت کرتے ہیں جبکہ اول الذکر تو اس وجہ سے بھی سی پیک کا مخالف ہے کہ اس کے خیال میں سی پیک کے کچھ منصوبے گلگت بلتستان میں واقع ہیں جبکہ بھارت کا دعویٰ ہے کہ یہ علاقہ (گلگت بلتستان) متنازع کشمیر ریجن کا حصہ ہے۔

تاہم بیجنگ ان اعتراضات کو مسترد کرتا ہے اور کہتا ہے کہ پاکستان جہاں چاہے گا سی پیک کے منصوبے وہاں سے ہی شروع کیے جائیں گے۔ چین کا دنیا میں ابھرنا امریکہ اور بھارت' دونوں کے لیے ایک بہانہ ہے کہ وہ ایک دوسرے کے قریب آئیں' اور دنیا بھر میں پھیلتے ہوئے چین کے خلاف اپنی تزویراتی شراکت داری کو گہرا کریں۔

ایشیا اور بھارت کے لیے امریکی سٹریٹیجی نے اس وقت ایک نیا موڑ لیا جب امریکی صدر ڈونلڈ ٹرمپ نے ایک نئی اصطلاح کا استعمال کیا۔ یہ اصطلاح انڈو پیسفک تھی۔ جب اس اصطلاح کی وضاحت کرنے کے لیے کہا گیا تو امریکی پالیسی سازوں نے کہا کہ ہم انڈو پیسفک کی اصطلاح کو

وقفے وقفے سے استعمال کرتے ہیں یعنی انڈو..... پیسفک کیونکہ اس لفظ سے انڈیا کے عروج کی اہمیت سامنے آتی ہے۔

پاک چین تعلقات کی اہمیت کے حوالے سے سابق وزیراعظم عمران خان کا کہنا ہے کہ پاکستان کا مستقبل چین کے ساتھ جڑا ہوا ہے۔ہمیں اس حوالے سے واضح ہونا چاہیے کہ ہمارے ملک کی معاشی ترقی چین کے ساتھ جڑی ہوئی ہے۔انہوں نے ان خیالات کا اظہار اگست 2020ء میں الجزیرہ ٹی وی اور دنیا ٹی وی سے گفتگو کرتے ہوئے کیا تھا۔

''ہم خوش قسمت ہیں کہ ہمیں ایک ایسا دوست ملا جو ہر مشکل وقت میں ہمارے ساتھ کھڑا ہوا۔ ہمارا کوئی دوست ایسا نہیں جیسا چین ہے؛ جس نے ہر سطح پر ہمارا ساتھ دیا اور ہمارا دفاع کیا۔''

چین اور ایران کی تزویراتی شراکت داری ڈیل برائے معاشی و دفاعی تعاون کئی بلین ڈالرز کی ہے؛ جس نے بھارت کی نیندیں حرام کردی ہیں کیونکہ بھارت نے اپنا تمام تر انحصار ایران کی چاہ بہار بندرگاہ پر کر رکھا تھا جو کہ بحیرہ عرب سے مختصر راستے کا حامل ہے۔

چین ایران تعلقات سے بھی پاکستان کو فائدہ ہوتا ہے کیونکہ ان تعلقات سے یہ ہوگا کہ اسلام آباد اور تہران کے مابین جو تعلقات کبھی کبھی ایرانی بارڈر پر دہشت گردی کے واقعات پیش آنے کی وجہ سے خراب ہو جاتے ہیں ان کو بہتر بنایا جا سکے گا۔ان واقعات میں مبینہ طور پر بلوچستان سے تعلق رکھنے والے بنیاد پرست سنی گروپ ملوث ہوتے ہیں۔اگر تہران اور اسلام آباد؛ دونوں چینی نصیحت کو مان لیں تو دہشت گردی کے واقعات کے باوجود وہ پائیدار تعاون کی راہ اختیار کر سکتے ہیں۔

اور آخری بات یہ کہ محسوس ہوتا ہے، چین ایران ڈیل کو ایرانی ریوولوشنری کورز کی حمایت حاصل ہے؛ پاکستانی ملٹری کے ساتھ جن کی مڈبھیڑ ہوتی رہتی تھی۔چینی سرمایہ کاری اور ایران کے ساتھ اس کی مضبوط شراکت داری کے بعد اب اسلام آباد مستقبل میں تہران کے ساتھ کسی سرحدی چپقلش کی صورت میں بیجنگ سے مصالحت کے لیے کہہ سکے گا، لہٰذا یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ (1) بیجنگ ہر موقع پر پاکستان کی مدد کو پہنچتا رہا ہے؛ چاہے وہ مالی ضمانتیں ہوں؛ جیسے بیلنس آف پیمنٹ سپورٹ اور رعایتی قرضے یا توانائی اور انفراسٹرکچر کے حوالے سے طویل مدتی سرمایہ کاری کے

منصوبے، اور (2) چین بھارت جھگڑے نے نہ صرف بھارتی سکیورٹی اسٹیبلشمنٹ کو ہلا کر رکھ دیا ہے بلکہ چین پاکستان پارٹنرشپ کو بھی پہلے سے زیادہ مضبوط بنا دیا ہے اور یہ صورت حال بہت سوں کے لیے حسد اور رقابت کا موضوع بن چکی ہے۔

باب ہشتم

خطے میں امن کے لیے جستجو

''میں پختہ یقین رکھتا ہوں کہ ہر لحاظ سے ایک معتدل' خوش حال معاشرہ تشکیل دینے کا ہدف 2021ء تک حاصل کیا جا سکتا ہے، جب کمیونسٹ پارٹی آف چائنا اپنی صد سالہ تقریبات منا رہی ہوگی' جبکہ چین کو ایک جدید سوشلسٹ ملک یعنی خوش حال، مضبوط، جمہوری، ثقافتی طور پر ترقی یافتہ اور ہم آہنگ ملک بنانے کا ہدف 2049ء تک پورا کیا جا سکتا ہے، جب عوامی جمہوریہ چین اپنی صد سالہ تقریبات کے لیے تیار ہوگا۔ چینی قوم کی بحالی کا خواب تب شرمندہ تعبیر کیا جا چکا ہوگا۔''

(صدر شی جن پنگ، گورننس آف چائنا)

چین حیرت انگیز رفتار کے ساتھ اپنے مشہور و معروف ہو جانے والے بیلٹ اینڈ روڈ انیشی ایٹو (BRI) منصوبے کے ذریعے ایک منافع بخش معاشی رابطہ کار (کنیکٹر) کے طور پر ابھرا ہے' جس نے اپنے شراکتی ممالک میں مختلف منصوبوں پر اربوں ڈالر لگا دیئے ہیں۔ بی آر آئی کے حوالے سے سرمایہ کاری کے بارے میں تخمینہ ہے کہ اس کے ذریعے چین 2017ء سے شروع کر کے اگلے دس برسوں میں دوسرے ممالک میں انفراسٹرکچر کی تعمیر پر مزید ایک ٹریلین ڈالر لگائے گا۔

صدر شی جن پنگ نومبر 2012ء میں اس منصوبے کے حوالے سے اپنے عزم کو عوام کے سامنے لائے تھے۔ تب سے اب تک وہ قومی و بین الاقوامی' دونوں سطحوں پر اس کا پرچم لہراتے رہے ہیں۔ ان کے نزدیک ہمسایہ ممالک کے ساتھ عمدہ سفارت کاری ''چین کے صدیوں (کمیونسٹ پارٹی آف چائنا کے 100 سال اور عوامی جمہوریہ چین کے 100 سال) کے حوالے سے دو اہداف اور چینی قوم کی بحالی کے چینی خواب'' کو عملی شکل دینے کے لیے بنیادی شرط کا درجہ رکھتی ہے۔

صدر شی جن پنگ مزید یہ یقین بھی رکھتے ہیں کہ ''چین خطے کی ترقی کے لیے مستحکم علاقائی ماحول قائم کرنے کے سلسلے میں کوشاں ہے اور اپنی ترقی کے ذریعے اپنے ہمسایہ ملکوں کو بھی فائدہ پہنچاتا ہے اور ان کے ساتھ مشترکہ ترقی کا ہدف پورا کرے گا'' (بحوالہ گورننس آف چائنا' پہلا حجم' 2015ء) چنانچہ انہوں نے ابھرتے ہوئے چین کی باگ ڈور سنبھالنے کے بعد جلد ہی بی آر آئی منصوبے کو پوری توانائی کے ساتھ آگے بڑھایا جو کہ کسی ملک کی جانب سے وضع کیا گیا بلند عزائم والا ایک عظیم منصوبہ ہے؛ تاہم صدر شی جن پنگ ان رکاوٹوں سے بھی پوری طرح آگاہ ہیں جو اس منصوبے کے راستے میں حائل ہیں' جن میں افغانستان میں دہشت گردی کے خلاف جنگ اور اس کے باقی دنیا پر اثرات سرفہرست ہیں۔ بالخصوص دسمبر 2014ء میں جنگ سے تباہ حال اس ملک میں موجود امریکی اور نیٹو فورسز کی تعداد میں واضح کمی کیے جانے کے بعد یہ واضح ہو گیا کہ اس سے پیدا ہونے والا خلا اب علاقائی طاقتوں کو پُر کرنا پڑے گا' اور سرحدوں کے آر پار دہشت گردی کے خلاف فائر وال یا مزاحمتی دیواریں تخلیق کرنا پڑیں گی۔

افغانستان میں چین کا کردار

چین کا بڑھا ہوا کردار اور تھری سٹیپ اپروچ

مئی 2021ء میں چین علاقے میں اپنی پس منظر میں رہ کر کردار ادا کرنے کی پالیسی سے پیچھے ہٹا اور اس نے آگے بڑھ کر افغان امن عمل میں تمام افغان سٹیک ہولڈرز کو براہ راست ثالثی، امداد اور سہولت کاری کی پیش کش کر دی تھی۔

چین کی پیشکش کا تناظر

افغان فریقین کو سہولت کاری کی پیش کش کرنے کے فیصلے کی تاریخ ہمیں کافی پیچھے لے جاتی ہے۔

چین نے جب جولائی 2014ء میں انسداد دہشت گردی کے حوالے سے اپنا خصوصی

نمائندہ مقرر کیا تھا تا کہ افغان سٹیک ہولڈرز تک براہ راست رسائی حاصل ہو سکے تو اس سے اس تشویش کی اہمیت اجاگر ہوئی تھی جو افغانستان میں بڑھتے ہوئے دہشت گردانہ تشدد کی وجہ سے پیدا ہو رہی تھی۔

سفیر سن یوشی، جو 1981ء سے ایک نوجوان سفارت کار کی حیثیت سے افغانستان کے بارے میں خاصا کچھ جانتے تھے، کی تعیناتی چین کی اس شدید خواہش کے حوالے سے واضح اظہار تھا جو وہ افغانستان کے معاملات میں شمولیت کے لیے رکھتا تھا۔

یہ سپیشل ریپریزنٹیٹو فار افغانستان اینڈ پاکستان (SRAP) کے کلب میں ایک لحاظ سے تاخیری انٹری تھی۔ مختلف ممالک کی جانب سے افغانستان اور پاکستان کے لیے خصوصی نمائندوں کی تعیناتی ان کی افغانستان میں امن کے قیام کی شدید خواہش کی عکاس تھی اور بون کانفرنس کا ایک نتیجہ تھی جو اقوام متحدہ کے زیر اہتمام 2001ء میں ہوئی تھی۔

2014ء میں سن یوشی نے بی بی سی کو دیئے گئے اپنے ایک انٹرویو میں کہا تھا، ''امریکہ اور نیٹو گزشتہ 13 برسوں سے افغانستان میں اہم کردار ادا کر رہے ہیں اور اس میں ہم نے اپنے حصے کا کچھ کردار ادا کیا اور مدد کی، لیکن اب امریکہ یہاں سے نکل رہا ہے تو افغانستان ایک نازک دور سے گزر رہا ہے.....اس لیے اب ہم مزید کچھ کرنے کے لیے تیار ہیں، اور ہم بڑا کردار ادا کرنا چاہتے ہیں۔''

چینی سفیر سن یوشی نے بات جاری رکھتے ہوئے یہاں تک پیشکش کر دی کہ چین انٹرا افغان ڈائیلاگ کی میزبانی کرنے کے لیے بھی تیار ہے۔ انہوں نے زور دے کر کہا، ''ہم طالبان کا کسی بھی غیر جانب دار مقام جیسے کہ چین میں خیر مقدم کریں گے.....ہم مذاکرات کرائیں گے لیکن اس کا پراسیس افغانوں کا اپنا ہوگا اور افغان ہی اس عمل کی قیادت کریں گے۔ اس پراسیس کا ایجنڈا بھی صدر (اب سابق) اشرف غنی کا تجویز کردہ ہونا چاہئے۔''

جنوری 2020ء میں سن یوشی کی جگہ لیو جیان کو افغان امور پر چین کا نیا نمائندہ مقرر کیا گیا۔ لیو جیان اس سے پہلے افغانستان، ملائیشیا اور پاکستان میں چین کے سفیر رہ چکے تھے، اور ان کی افغانستان کے لیے تعیناتی کا مطلب یہ تھا کہ چین افغانستان کے حوالے سے معاملات کو ایک تجربہ کار ہاتھ کے ذریعے چلانے کے لیے پُرعزم ہے۔ تقریباً دو سال بعد جنوری 2016ء میں چین نے

افغان وزیرِ خارجہ صلاح الدین ربانی کی میزبانی کی جس کا واضح مقصد افغانستان کے جنگجو دھڑوں کو مذاکرات کی میز پر لانے کی راہ ہموار کرنا تھا۔

دس ماہ بعد طالبان لیڈرز بھی چینی میزبانی کا لطف اٹھا رہے تھے۔ چین کے افغان طالبان سے رابطوں کا یہ پہلا عوامی سطح پر اعتراف تھا۔ افغان طالبان کے قطر آفس کے سربراہ شیر عباس ستانکزئی نے پانچ رکنی وفد کے ساتھ چینی حکام کے ساتھ اہم مذاکرات کی قیادت کی تھی۔ وفد میں شہاب الدین دلاور، جان محمد مدنی، سلام حنفی اور ڈاکٹر صالح شامل تھے۔

''یہ دورہ سیاسی دفتر کے یورپی ممالک جیسے ناروے، جرمنی، فرانس، برطانیہ کے ساتھ ساتھ دیگر ہمسایہ اور علاقائی ممالک کے ساتھ تعلقات استوار کرنے کے عمل کا حصہ تھا۔'' یہ بات طالبان ذرائع نے اس وقت بتائی جب ان سے دورے کے مقصد کے بارے میں سوال کیا گیا۔ ڈیلی ایکسپریس ٹریبون نے طالبان ذرائع کے حوالے سے بتایا: ''لیکن ان تعلقات کا فوکس افغانستان میں امن لانا اور اس مسئلے کو بات چیت کے ذریعے حل کرنا تھا۔'' طالبان ذرائع کے حوالے سے اخبار نے مزید بتایا کہ چین ایک اہم سٹیک ہولڈر ہے اور وہ افغانستان میں امن اور استحکام لانا چاہتا ہے، اسی لیے اس نے طالبان کو مدعو کیا۔

طالبان کے بیجنگ کے دورے کے چند دن بعد افغانستان کے لیے چین کے خصوصی نمائندے ڈینگ شی جُن کابل پہنچے تاکہ اس وقت کے افغان صدر اشرف غنی کو بتا سکیں کہ ان کے ملک نے طالبان کی حوصلہ افزائی کی ہے کہ وہ امن عمل میں شریک ہوں۔ صدر غنی کے دفتر نے بھی شی جُن کی (سابق) صدر اشرف غنی سے ملاقات کی تصدیق کی۔ اس حوالے سے جاری کیے گئے بیان میں شی جُن کا حوالہ دیتے ہوئے کہا گیا کہ چین نے طالبان کے ساتھ ملاقاتوں میں ہمیشہ واضح کیا کہ وہ افغان حکومت اور صدر کو تسلیم کرتا ہے اور مذاکرات ہی ان کے لیے واحد آپشن ہے۔''

دلچسپ بات یہ ہے کہ افغان طالبان کے دورۂ بیجنگ سے پہلے چینی، روسی اور پاکستانی حکام کے درمیان ماسکو میں دسمبر 2016ء میں قریبی مشاورت ہوئی تھی، جس میں سب نے بعض طالبان رہنماؤں پر سے عالمی پابندیاں اٹھانے کا خیر مقدم کیا تھا۔ افغان طالبان کے قطر آفس نے فوری طور پر اپنا ردعمل ظاہر کیا جس میں ماسکو میٹنگ کے نتائج کی تعریف کی گئی تھی کہ یہ اہم فریقوں کی

جانب سے اس حقیقت کو تسلیم کرنا ہے کہ امارات افغانستان ایک سیاسی اور فوجی قوت ہے۔

افغان وزیر خارجہ کو مدعو کر کے' اس کے بعد طالبان وفد کو دعوت دے کر اور ماسکو میٹنگ میں سرگرم شرکت کر کے چینی قیادت نے علاقائی امن کے لیے اپنی جستجو کی اہمیت پر زور دیا تھا' چاہے اس کے لیے کوئی بھی ممکنہ راستہ اختیار کیا جائے۔ چین کا خیال ہے کہ علاقائی امن اس کے بی آر آئی منصوبے کے لیے بہت اہم ہے۔

افغانستان میں امن، بی آر آئی (BRI) کی کامیابی کی کنجی

چین کی افغانستان کے ساتھ سرگرم مصروفیت بیجنگ میں پیدا ہونے والے اس احساس کی اہمیت پر زور دیتی ہے کہ بیلٹ اینڈ روڈ انیشی ایٹو (بی آر آئی)' جس کا سی پیک ایک سرِ فہرست منصوبہ ہے' کی کامیابی کا دارومدار خطے میں دہشت گردی کے تحت پھیلے تشدد پر قابو پانے کی صلاحیت پر ہے۔ ایک ریجنل سکیورٹی آرکیٹیکچر' جس میں علاقائی فریق، جیسے روس، ایران اور پاکستان، شامل ہوں' انتہائی اہم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ (چین) 2014ء سے اس خیال کو آگے بڑھا رہا ہے کہ فریق ممالک کو دہشت گردی اور اس کی تمام پراکسیز' جن کے بارے میں تصور کیا جاتا ہے کہ زیادہ تر افغانستان کے باہر سے آپریٹ ہو رہی ہیں' کے خلاف مشترکہ طور پر رکاوٹیں کھڑی کرنی چاہئیں۔ لہٰذا چین کا واحد فوکس یہ ہے کہ ان قوتوں کو کیسے بے اثر کیا جائے جو اس کے مفادات کے لیے نقصان دہ ہیں۔

چنانچہ اس میں کوئی حیرانی کی بات نہیں کہ چین اور افغانستان کے تعلقات میں بتدریج اضافہ ہوا بالخصوص 2014ء کے بعد سے' جب افغان صدر (اب سابق) اشرف غنی نے اپنا چین کا پہلا دورہ کیا تھا' اور دونوں ممالک میں اس بات پر اتفاق ہوا تھا کہ ایسٹ ترکستان اسلامک موومنٹ (ETIM)، جو چین میں دہشت گردانہ سرگرمیوں میں ملوث رہی ہے، سے مل کر نمٹا جائے گا۔ شی جن پنگ سے اپنی ملاقات کے دوران (سابق) افغان صدر اشرف غنی نے اس بات کا عہد کیا تھا کہ ایسٹ ترکستان اسلامک موومنٹ کے خلاف جنگ میں ان کا ملک چین کی مدد کرے گا۔ مبینہ طور پر انہوں نے پندرہ ایغور جنگجوؤں کو چین کے حوالے کرنے کی ہامی بھی بھری تھی۔ پھر جولائی 2015ء میں اسلام آباد کی مدد سے چین نے اُرمچی میں طالبان کے نمائندوں اور افغانستان کی اعلیٰ امن کونسل

(HPC) کے معصوم ستانکزئی کے درمیان ملاقات کرائی تا کہ افغانستان تنازع میں کشیدگی کو کم کیا جا سکے۔ ان کوششوں سے پتا چلتا ہے کہ چین کسی جانبداری کے بغیر افغانستان میں امن کے قیام میں کردار ادا کرنے میں دلچسپی رکھتا ہے؛ چنانچہ اس میں حیرانی کی کوئی بات نہیں کہ چین افغان مصالحتی عمل میں ایک شراکتی اپروچ کا قائل ہے۔ دوحا میں انٹرا افغان ڈائیلاگ کی افتتاحی تقریب سے خطاب کرتے ہوئے چینی وزیر خارجہ وانگ یی نے بتایا تھا، ''چین سفارش کرتا ہے کہ امن عمل سیاسی مفاہمت کی بنیادی سمت میں بڑھتا رہے اور یہ کہ مذاکرات افغان قیادت کے درمیان افغانوں کی مرضی کے ساتھ ہوں اور تمام فریق ایک وسیع اور شراکتی فریم ورک کے ہدف کا تعاقب کریں۔''

عالمی رتبے (سٹیٹس) کے دباؤ

چینی سکالرز اور سابق سفارت کاروں کا کہنا ہے کہ ان کے لیڈرز اس دباؤ کو محسوس کرتے ہیں جو اس قدر بے نظیر معاشی ترقی کے نتیجے میں آتا ہے۔

''بڑا پس منظر یہ ہے کہ امریکہ افغانستان سے اپنے زیادہ تر فوجی نکال لے گا جبکہ ابھی انسداد دہشت گردی کا مشن پورا نہیں ہوا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ملک کو شدید افراتفری اور بحران میں چھوڑ دینا۔'' یہ ڈویو کانگ کا کہنا ہے، جو اسلام آباد پاکستان میں ایک سفارت کار کے طور پر کام کر چکے ہیں اور اس وقت فودان یونیورسٹی شنگھائی میں ڈائریکٹر آف ساؤتھ ایشیا سٹڈیز سنٹر ہیں۔

وہ مزید کہتے ہیں، ''افغانستان کی چین کے ساتھ سرحد ہے؛ چنانچہ اس صورت میں چین کو اس معاملے میں شامل ہونا ہوگا تا کہ خطے میں استحکام کے لیے بات چیت اور مذاکرات کو فروغ دیا جا سکے۔'' افغانستان پر یہ متحرک موقف بیجنگ کی اس خواہش کو بھی ابھارتا ہے کہ وہ اپنی سوچوں اور افعال میں مطابقت اور ہم آہنگی پیدا کرے؛ چنانچہ یہ کوئی حیرانی کی بات نہیں کہ اپنے اپنے مسابقانہ مفادات کے باوجود امریکہ، چین، روس، ایران اور پاکستان امن اور مصالحت کے حوالے سے یکسو ہیں، بالخصوص دوحا میں انٹرا افغان ڈائیلاگ شروع ہونے کے بعد سے اس یکسوئی میں اضافہ ہو گیا تھا۔

اس طرح چین نے خود کو افغان امن عمل میں ایک سرکردہ فریق میں تبدیل کر لیا۔ زیادہ تر

افغان چین کو اچھی نظر سے دیکھتے ہیں کیونکہ اس (چین) نے افغانستان کے اندرونی سیاسی معاملات میں کبھی مداخلت نہیں کی۔ اس کے علاوہ چین ضرورت کے وقت ہمیشہ افغانستان کی مدد کرتا رہا ہے۔ افغانستان چین کی خارجہ پالیسی میں بھی خصوصی مقام رکھتا ہے اور چین کی ہمسایوں کے بارے میں سفارت کاری کا حصہ بن چکا ہے جو تمام ہمسایوں کے ساتھ ثمر آور تعلقات پر زور دیتی ہے۔

مزید یہ کہ کئی سالوں سے چین نے افغانستان میں اپنے تجارتی اور معاشی سٹیک بھی بہت بڑھا دیے ہیں جس کے بعد چین افغانستان میں سب سے زیادہ سرمایہ کاری کرنے والا ملک بن گیا ہے۔ افغانستان میں بیجنگ کی پہلی بڑی سرمایہ کاری 2007ء میں ہوئی تھی جب اس نے افغانستان کے مشرقی صوبے لوگر میں تانبے کی کان ''میس آئناک'' (Mes Aynak) میں چار اعشاریہ چار ارب ڈالر کا کنٹریکٹ حاصل کیا تھا۔ اس کے بعد سے چین نے افغانستان میں مختلف معدنیات، ریلویز اور انفراسٹرکچر کے منصوبوں میں بھاری سرمایہ کاری کی ہے۔ یہ سرمایہ کاریاں اس بات کی اہمیت کو اجاگر کرتی ہیں کہ کس طرح چین نے افغانستان کے حوالے سے اپنی سکیورٹی پر مرتکز پالیسی کو تجارت اور شراکت داری پالیسی میں تبدیل کیا۔ اس کے علاوہ چین کا کہنا ہے کہ افغانستان 2 لاکھ 23 ہزار میگا واٹ شمسی توانائی پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے جبکہ افغانستان 23 ہزار میگا واٹ پن بجلی اور 68 ہزار میگا واٹ پوّن بجلی (ونڈ انرجی) بھی پیدا کرسکتا ہے تاہم اس قدر صلاحیت ہونے کے باوجود افغانستان کا 40 فیصد حصہ بجلی سے محروم ہے اور ملک کے پالیسی ساز شدت سے یقین رکھتے ہیں کہ چین اس کمی کو پورا کرسکتا ہے۔

امن کی شراکت داریاں اور انسداد دہشت گردی کی ہتھیار بندی

1993ء سے 2014ء کے دوران چین مسلسل کوشاں رہا کہ وہ ملکوں اور ریاستوں کے ساتھ سٹریٹیجک اور جامع شراکت داریاں استوار کرے بالخصوص گلوبل ساؤتھ میں، جہاں سے ٹوٹل ستاون عالمی شراکت داریاں بنتی ہیں۔ ان شراکت داریوں میں، جیسا کہ ذیل میں دیئے گئے جدول سے پتا چلتا ہے، پاکستان چین کے لیے اہم ترین شراکت داروں میں سے ایک ہے جس کا درجہ ''آل ویدر سٹریٹیجک کوآپریٹو پارٹنرشپ'' یعنی 'ہر طرح کی صورت حال میں تزویراتی تعاون پر مبنی شراکت

داری' کا بنتا ہے۔ مزید یہ کہ افغانستان بھی جنوبی کوریا، بھارت اور سری لنکا کی طرح سٹریٹیجک پارٹنرشپ آف کوآپریشن کے درجے میں چین کا اہم ساتھی بن چکا ہے؛ چنانچہ اس میں بھی حیرانی کی کوئی بات نہیں کہ جب انفراسٹرکچر میں سرمایہ کاری' افغان امن عمل میں اہم کردار ادا کرنے' اور امریکہ طالبان امن مذاکرات کی بات آتی ہے تو بیجنگ اس میں سب سے آگے آگے ہوتا ہے۔ ٹونگجی یونیورسٹی میں سکول آف پولیٹیکل سائنس اینڈ انٹرنیشنل ریلیشن کے ہونگ ہوامن (Honghua Men) بھی کہتے ہیں کہ چین تسلسل کے ساتھ اپنی قومی سلامتی کو بہتر بنا رہا ہے اور بین الاقوامی سلامتی کو برقرار رکھنے کے لیے متحرک انداز میں اپنا کردار نبھا رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ چین اپنی زمینی سرحدوں (جو روس، وسطی ایشیا، افغانستان، بھارت اور پاکستان کے ساتھ ملتی ہیں) پر امن اور استحکام کو اپنی ایک تزویراتی بنیاد سمجھتا ہے۔

چین منشیات' جو کہ افغانستان کے متعدد حصوں میں اگائی اور پراسیس یعنی تیار کی جاتی ہیں' کی تجارت کی بیخ کنی کے لیے بھی امن اور استحکام کو بہت ضروری سمجھتا ہے۔ اس میں سے کچھ منشیات سنکیانگ کے راستے بھی چین میں پہنچتی ہیں۔ اپنی موجودگی کو محسوس کرانے کے لیے بیجنگ پہلے ہی کثیر جہتی (چین، افغانستان اور پاکستان) سیاسی اور انسداد دہشت گردی تعاون پر مبنی مذاکرات کے راستے پر چل رہا ہے اور ایسا سرکاری اور سول سوسائٹی' دونوں سطحوں پر ہو رہا ہے۔ یہ ایک علاقائی گروپ ''سکس پلس ون'' کا بھی حصہ ہے جس میں امریکہ' روس' چین' بھارت' پاکستان، ایران اور افغانستان شامل ہیں۔

1993ء سے 2014ء کے درمیانی عرصے میں تشکیل پانے والی چین کی سٹریٹیجک پارٹنرشپس کی تفصیل اس طرح ہے:

پارٹنرشپ کی اقسام اور ملک:

☆ کمپری ہینسیو سٹریٹیجک پارٹنرشپ آف کوآرڈی نیشن (روس)

☆ آل ویدر سٹریٹیجک کوآپریٹو پارٹنرشپ (پاکستان)

☆ کمپری ہینسیو سٹریٹیجک پارٹنرشپ فار کوآپریشن (ویت نام، کمبوڈیا، میانمار، لاؤس، تھائی لینڈ)

☆ سٹریٹیجک پارٹنرشپ آف کوآپریشن (جنوبی کوریا، انڈیا، سری لنکا، افغانستان)

(Source: Xiao, X. (ء2016). Defining and Safeguarding Priorities in China's National Security. China in the Xi Jinping Era.)

ایک اور سہ رکنی فورم جس میں چین، امریکہ اور افغانستان شامل ہیں، ان ایک ہی جیسے اہداف کو حاصل کرنے کی کوشش کر رہا ہے' ظاہر ہے کہ سیاسی مقاصد کے لیے۔ چینی حکام اس کی اس طرح سے تشہیر نہیں کر رہے ہیں جس طرح وہ باقی ٹریکس یا پروگراموں کی کرتے ہیں۔ چین طویل عرصے سے افغان تنازع سے دامن بچاتا رہا ہے اور غیر جانب دار رہنا چاہتا رہا ہے لیکن افغان حکام' سابق صدر حامد کرزئی کے دور سے شروع کر کے' ہر موقع پر بہ اصرار چینی لیڈروں پر دباؤ ڈالتے رہے ہیں کہ وہ طالبان کو کچلنے کے لیے اسلام آباد پر اپنا اثر و رسوخ استعمال کریں۔ (بحوالہ وانگ ای اور جولی ڈی نیویارک ٹائمز 25 جنوری 2016ء)

چین اسی طرح کے ایک اور ٹریک کا بھی حصہ رہا ہے جو کوآڈری لیٹرل کوآرڈی نیشن گروپ (QCG) کہلاتا ہے' لیکن یہ اس وقت اچانک رک گیا جب امریکہ کے ایک ڈرون حملے کے نتیجے میں مئی 2016ء میں طالبان لیڈر اختر منصور نے وفات پائی۔ چینی سکالر اور چینی ایسوسی ایشن آف مڈل ایسٹ سٹڈیز کے نائب صدر لی شاؤ شیان کا کہنا ہے کہ ان کا یقین ہے کہ چین کے لیے یہ بہت اہم ہے کہ وہ طالبان کے نمائندوں کے ساتھ براہ راست روابط استوار کرے۔ لی شاؤ شیان نے افغانستان کے اکثریتی نسلی گروہ کا حوالہ دیتے ہوئے کہا: ''میں 2000ء میں افغانستان گیا تھا اور میں یہ کہنا چاہوں گا کہ طالبان کو ختم کرنا اتنا آسان نہیں ہے کیونکہ وہ معاشرے میں بہت گہرائی کے ساتھ جڑے ہوئے ہیں اور پشتونوں کے نمائندے ہیں۔'' انہوں نے مزید کہا کہ اب بیجنگ، واشنگٹن اور کابل سب اس حقیقت کو قبول کر چکے ہیں کہ ہمیں انہیں (طالبان کو) امن اور مصالحت کے عمل میں شامل کرنے کی ضرورت ہے۔

وسیع تناظر میں بات کی جائے تو چین افغانستان میں امن کے لیے کثیر جہتی مصروفیت کو آگے بڑھانے پر زور دیتا ہے جس میں بین الاقوامی سطح پر دہشت گرد تنظیموں' جسے وہ 'سکیورٹی کے

لیے مشترک خطرہ' قرار دیتا ہے پر مضبوط لیکن کم واضح فوکس کو تقویت ملتی ہو؛ چنانچہ یہ اتفاق کی بات نہیں ہے کہ چائنہ ایسوسی ایشن فار فرینڈ شپ (CAF)' جو چین کی وزارت برائے عوامی تحفظ کا ایک مددگار بازو ہے، نے بیجنگ میں پہلا غیر سرکاری انسداد دہشت گردی سمپوزیم منعقد کیا جس میں پاکستان، افغانستان اور میزبان ملک نے شرکت کی۔ ایسوسی ایشن کے صدر چن زیمن نے ڈائیلاگ کا افتتاح کیا' اور اعلان کیا کہ دہشت گرد تنظیموں اور نیٹ ورکس کی کراس بارڈر نقل و حرکت اور ان کی تکنیکی صلاحیتیں تمام علاقائی سٹیک ہولڈرز کے لیے ایک بڑا خطرہ ہیں۔ اس کے ساتھ ہی چن زیمن نے تمام علاقائی طاقتوں کے درمیان ربط بہتر بنانے کی ضرورت پر بھی زور دیا۔ انہوں نے مزید کہا کہ فریق ممالک کے درمیان حقیقی ربط و تعلق سے دہشت گردوں کے درمیان نیٹ ورکنگ کے امکانات ختم ہو جائیں گے اور دہشت گردوں اور مجرمانہ سرگرمیوں میں ملوث نیٹ ورکس کے درمیان گٹھ جوڑ کو توڑنے میں مدد ملے گی۔ چن زیمن نے تسلیم کیا کہ دہشت گردی کے خلاف جنگ میں ''اگلے محاذ'' پر ہونے کی وجہ سے افغانستان اور پاکستان کو سب سے زیادہ نقصان اٹھانا پڑا ہے۔ انہوں نے کہا: ہم آپ کے ساتھ ہیں اور ایسٹ ترکستان اسلامک موومنٹ (ETIM) سے لڑنے کا شکریہ، اور تمام دہشت گرد اور جرائم پیشہ تنظیموں کے خلاف کھڑے ہونے کا شکریہ۔ اس سے صرف دو ہفتے قبل چینی حکام نے اسلام آباد میں اپنے ہم منصب روسی، ایرانی اور پاکستانی حکام سے ایک بے مثال ملاقات کی تھی تاکہ جنگ زدہ افغانستان میں داعش کے زور پکڑنے پر خصوصی توجہ مرتکز رکھتے ہوئے اپنے اردگرد ہونے والی پیش رفتوں پر تبادلہ خیالات کر سکیں۔ (وائس آف امریکہ نیوز' 2018ء)

روس کی فارن انٹیلی جنس سروس کے ترجمان نے یہ تصدیق بھی کی کہ افغانستان میں داعش کے ابھرنے سے اسلام آباد میں غور و فکر شروع ہو گیا ہے اور یہ کہ روسی جاسوس ایجنسی کے ڈائریکٹر سرگئی نارشکن نے ایک میٹنگ میں اپنے ملک کی نمائندگی کی' جس نے بہت سے مغربی دارالحکومتوں میں حکام کو حیران کر دیا۔ سرگئی نے سرکاری نگرانی میں چلنے والی طاس میڈیا ایجنسی سے گفتگو کرتے ہوئے بتایا'' کانفرنس اس اہم نتیجے پر پہنچی ہے کہ شام اور عراق کے داعش کے دہشت گردوں کو افغانستان میں جمع ہونے سے روکنے کے لیے مشترکہ کوششوں کی ضرورت ہے کیونکہ افغانستان سے

یہ دہشت گرد ہمسایہ ملکوں کے لیے خطرہ بن سکتے ہیں۔''

اس اجلاس میں افغانستان میں آئی ایس آئی ایس (داعش) کی موجودگی کے پراسرار عمل پر تقریباً ایک جیسے خیالات کا اظہار کیا گیا۔ اگرچہ چین نے روس کے اس الزام پر کبھی عوامی موقف نہیں اپنایا کہ داعش امریکہ کی تیار کردہ دہشت گرد تنظیم ہے' بالخصوص شمالی افغانستان میں جہاں ملک کی وسط ایشیائی ریاستوں سے سرحدیں ملتی ہیں تاہم اس کی اسلام آباد میں کوارڈی لیٹرل میٹنگ میں موجودگی مغرب میں مختلف افراد کے خیال میں روسی الزام کی توثیق تھی۔ اقوام متحدہ میں روس کے نمائندے ویسلی نبنز یا نے جون 2018ء میں سلامتی کونسل سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا کہ داعش افغانستان میں ٹریننگ کیمپ قائم کر رہی ہے جہاں دہشت گردوں بالخصوص وسط ایشیائی ریاستوں سے تعلق رکھنے والے دہشت گردوں کو تربیت دی جاتی ہے۔

نبنز یا نے مزید کہا کہ یہ ایک ایسا گروپ ہے جس کے پاس 10 ہزار جنگجو ہیں اور یہ پہلے ہی افغانستان کے 34 میں سے 9 صوبوں میں سرگرم ہیں.....اور ملک کے شمالی حصے میں مسلسل اپنی پوزیشن کو مضبوط بنا رہے ہیں اور خود کو وسطی ایشیا تک توسیع کے لیے تیار کر رہے ہیں۔ نبنز یا نے اپنے ملک کے جس موقف کو دہرایا اسے ایران بھی تسلیم کرتا ہے' جس کا افغانستان کے ساتھ طویل بارڈر ہے۔ امریکہ نے روس کے اس الزام کو محض افواہ قرار دیتے ہوئے مسترد کر دیا اور اسے روس کے طالبان کی عسکریت پسندی سے تعلقات کے لیے جواز فراہم کرنے کی کوشش گردانا۔ داعش نے اپنی افغان شاخ کا نام خراسان رکھا ہے یعنی اسلامک سٹیٹ آف خراسان پرووِنس (ISKP) جو کہ جنگ سے تباہ حال افغانستان میں آئے روز مہلک خودکش حملے کرتی رہتی ہے اور کبھی کبھار ہمسایہ ملک پاکستان کو بھی ایسی ہی سرگرمیوں کا نشانہ بناتی ہے۔ پاکستان اور چین' دونوں کو یقین ہے کہ دہشت گرد گروپ جیسے داعش دیگر پراکسی اور دہشت گرد گروہوں مثلاً ایسٹ ترکستان اسلامک موومنٹ (ETIM) کے لیے راستے اور پناہ کا کام کرتے ہیں اور ان کو روکنے اور ختم کرنے کے لیے کثیر جہتی کوششوں کی ضرورت ہے۔ ایسٹ ترکستان اسلامک موومنٹ (ETIM) کے بارے میں چینی اضطراب کی گونج نومبر 2020ء میں اس دن بھی سنائی دی تھی جب چائنا، پاکستان، افغانستان سکیورٹی سمپوزیم ہوا تھا۔

چائنا ایسوسی ایشن آف فرینڈ شپ (CAF) کے چن زیمن کہتے ہیں کہ ایسٹ ترکستان اسلامک موومنٹ سنکیانگ اور مین لینڈ چین کے خلاف بڑا خطرہ ہے' وہ تینوں ملکوں میں کام کرتے ہیں اور ہمیں چاہیے کہ ہم ان گروپوں سے لڑائی کے لیے اپنے انٹیلی جنس تعاون کو تیز کریں۔ یہ انسدادِ دہشت گردی کو ہمارا مشترکہ ہدف بناتا ہے اور علاقائی سلامتی اور انٹیلی جنس تعاون بڑھانے کو وقت ضرورت بناتا ہے۔ انہوں نے دہشت گردی کے خلاف جنگ میں انفارمیشن ٹیکنالوجی کے زیادہ استعمال اور زیادہ بڑے انٹیلی جنس ڈیٹا کی ضرورت پر بھی زور دیا۔ ''دہشت گرد انٹرنیٹ کو استعمال کرتے ہیں۔ وہ دہشت گرد حملوں کے لیے ویڈیو کانفرنسنگ کرتے ہیں تو ہم ان کے دہشت گردانہ حملوں کو روکنے کے لیے ایسا کیوں نہیں کر سکتے؟''

اتفاق کی بات ہے کہ اس سے صرف ایک دن پہلے اس وقت کے امریکی وزیر خارجہ مائیک پومپیو نے دہشت گرد تنظیم ایسٹ ترکستان اسلامک موومنٹ کو دہشت گرد تنظیموں کی فہرست سے نکال دیا جو کہ واضح طور پر امریکہ کی جانب سے چین کے لیے ''نئی سرد جنگ'' کا پیغام تھا۔ جارج ڈبلیو بش انتظامیہ نے 2003ء میں ETIM کو دہشت گرد تنظیموں کی فہرست میں شامل کیا تھا تا کہ عراق پر امریکی حملے کے لیے چین کا اتفاق رائے حاصل کیا جا سکے۔ اس امریکی فہرست بندی کے لیے سرکاری چینی لٹریچر کو استعمال کیا گیا تا کہ ای ٹی آئی ایم کو فہرست میں شامل کرنے کا جواز پیش کیا جا سکے۔ اس کے علاوہ یہ دعویٰ بھی کیا گیا کہ سنکیانگ میں گزشتہ دس سالوں کے دوران جتنے بھی دہشت گردانہ حملے کیے گئے اس میں یہی ای ٹی آئی ایم ملوث تھی۔ گزشتہ سال ایک جائزے میں امریکی حکام نے حساب لگایا کہ افغانستان میں کم و بیش سو کے قریب ای ٹی آئی ایم جنگجو موجود ہیں جبکہ اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل کی ایک حالیہ رپورٹ کے مطابق یہ تعداد 500 ہے جو افغانستان اور زیادہ تر شمالی بدخشاں میں سرگرم ہیں۔

سنکیانگ اور چین کے بارے میں کتابیں لکھنے والے امریکی مصنف جیمز مل وارڈ طنزیہ انداز میں کہتے ہیں کہ آج، جب امریکہ الیکشن کے بخار میں مبتلا ہے، فہرست میں سے نام نکال کر وزیر خارجہ مائیک پومپیو نے بیجنگ کو ایک صاف اور واضح پیغام بھیجا ہے۔ (بحوالہ Delisting of anti-China ETIM: beginning of a new proxy war?' امتیاز گل' دی ڈیلی

ٹائمز' 2020ء)

ایک مشاہدہ کار نے تنقید کرتے ہوئے اس حرکت کو انسدادِ دہشت گردی کی ہتھیار بندی سے تعبیر کیا اور قرار دیا کہ یہ صورت حال ہمیں ''نئی سرد جنگ'' کے دور میں درپیش ہے۔ چینی براڈ کاسٹر سی جی ٹی این نے امریکی اقدام پر شدید ردعمل کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ''ایک جانب جب دنیا کی توجہ امریکہ کے صدارتی الیکشن ڈرامے اور تنازعات پر مرکوز ہے تو دوسری جانب امریکی وزیر خارجہ مائیک پومپیو نے ایک خاموش اور مذموم اقدام کیا ہے۔''

چین اور پاکستان

چین پاکستان علاقائی ہم آہنگی:

تمام علاقائی مسائل پر چین پاکستان کو آرڈی نیشن اس بات سے بھی پھوٹتی ہے کہ اول الذکر یعنی چین اہم علاقائی فریقوں کے ساتھ شراکت داری کی خواہش رکھتا ہے' چنانچہ چین اور پاکستان' دونوں میں افغان امن عمل کے حوالے سے بہت قریبی مشاورت اور شراکت ہوتی ہے۔ پاکستان انسداد دہشت گردی کے حوالے سے اپنی مہارت اور افغانستان کے بارے میں اپنی معلومات شیئر کرتا ہے جبکہ چین پاکستان کو تنازع کے حل اور اس کی شدت میں تخفیف کے حوالے سے ٹھنڈے دل سے سفارت کاری کے بارے میں مشورہ دیتا رہا ہے۔ بی آر آئی کو کامیاب بنانے کے لیے اپنی تمام تر توجہ مرتکز کرنے کے علاوہ چین افغانستان میں امن کے قیام میں بھی خصوصی دلچسپی رکھتا ہے' کابل میں حکمرانی کے ڈھانچے میں طالبان کی شمولیت کی حمایت کرتا ہے' اور اس کے خیال میں ایسا کرنا ہر قسم کی دہشت گردی کے خلاف ایک دفاعی دیوار کی حیثیت رکھتا ہے۔

چین یقین رکھتا ہے کہ اگر علاقے کے ملکوں میں سیاسی تنازعات ہوں تو اہداف کو حاصل کرنا بہت مشکل ہو جاتا ہے' چنانچہ بی آر آئی اور اس کے ایک بڑے منصوبے سی پیک کا ایک بڑا پہلو یہ ہے کہ یہ دونوں پروجیکٹ چین اور خطے کے کروڑوں لوگوں کو غربت کی دلدل سے نکال رہے ہیں۔ اس سے لوگوں کے مجموعی حالات زندگی بہتر ہوں گے اور لوگوں کو پُرتشدد انتہا پسندی سے دور رکھنے

میں بھی مدد ملے گی۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ چین کے لیے بی آر آئی کی کامیابی کا دارومدار پاکستان اور افغانستان' دونوں ملکوں میں سلامتی اور استحکام پر ہے اور اسی وجہ سے چین کابل کے ساتھ تجارت اور امن کے تعلقات کو بہتر بنا رہا ہے' تاہم چین کے اس عمل سے نئی دہلی ناراض ہے کہ حکام اور سکیورٹی کے تجزیہ کاروں کا یقین ہے کہ افغانستان کے ساتھ چین کی بڑھتی ہوئی قربتیں افغانستان پر بھارت کے اثر ورسوخ کو گہنا رہی ہیں' تاہم علاقائی ترقی کے لیے چین کا واحد ہدف ایک یکجا ایشیا ہے' جس کی وجہ سے وہ اس قسم کی باتوں کو نظر انداز کر دیتا ہے۔

چینی حکام، دانشوروں اور انٹیلی جنشیا کے ساتھ حالیہ برسوں کے دوران میرے اپنے رابطوں سے یہ سبق آموز بصیرت سامنے آئی ہے کہ کیسے وہ اس یکجا ایشیائی خطے کو بی آر آئی کی کامیابی کی کلید سمجھتے ہیں۔ چین محسوس کرتا ہے کہ پاکستان اور بھارت کے مابین امن' اور افغانستان میں مصالحت کے لیے انٹرا افغان مذاکرات بی آر آئی کے سب سے بڑے منصوبے سی پیک کے لیے بہت اہم ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ چین نے وزارتی، بیوروکریٹک اور سول سوسائٹی کے چینلز کے ذرائع استعمال کرتے ہوئے سخت محنت کی اور پاکستان اور افغانستان کو پیغام دیا کہ وہ اپنے معاملات درست کریں۔

چینی انٹیلی جنشیا طالبان کو ''تاریخی واقعات کی میراث'' قرار دیتی ہے اور کہتی ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جو افغانستان سے تعلق رکھتے ہیں' اس لیے ان کے ساتھ اسی مناسبت سے سلوک کیا جانا چاہیے۔ چین کی جانب سے انٹرا افغان ڈائیلاگ کو بحال کرنے پر بہت زور دیا جاتا رہا ہے۔ چین یقین رکھتا ہے کہ کابل میں حکومت اور طالبان کا رویہ مصالحتی عمل کی بحالی کے لیے بہت ضروری ہے؛ چنانچہ موجودہ امن عمل کی کامیابی کا زیادہ تر دارومدار صبر اور اعتماد کے ساتھ کچھ ''پُرکشش حالات'' پر بھی ہے تاکہ عسکریت پسندوں کے سخت گیر مؤقف کو نرم کیا جا سکے۔

چینی حکام اور دانشوروں کا یقین ہے کہ افغانستان پاکستان کے خطے کو مشترکہ دشمنوں کا سامنا ہے جیسے داعش، القاعدہ، ای ٹی آئی ایم اور تحریک طالبان پاکستان، اور ان کے علاوہ منظّم جرائم، غربت اور معاشی پسماندگی وغیرہ، اور اس سے کابل اور اسلام آباد' دونوں کو سبق ملتا ہے کہ وہ مل

کر بیٹھیں اور اپنے اختلافات دور کریں، غلط فہمیوں کو ختم کریں اور ایک دوسرے پر الزام تراشی سے باز رہیں۔ وہ تسلیم کرتے ہیں کہ افغانستان ایک 'ٹریجڈی کنٹری' ہے جو بیرونی عناصر کی وجہ سے تا حال مسائل جھیل رہا ہے۔

چینی قیادت افغانستان پر بیرونی اثرات کے بارے میں بھی آواز بلند کرتی رہی ہے۔ چین اس بات پر یقین رکھتا ہے کہ کسی بھی غیر ملکی طاقت کو افغانستان کی سرزمین کو کسی تیسرے ملک کو نشانہ بنانے کے لیے استعمال نہیں کرنا چاہئے۔ چین نے افغانستان میں برسرِ اقتدار اپنے افغان دوستوں کو یہ نصیحت کی ہے کہ جب تک دوسری قومیں ان کی پالیسیوں پر اثر انداز ہوتی رہیں گی، ان کی المناک صورت حال برقرار رہے گی' چنانچہ بیجنگ اس چار رکنی اجلاس کو سپورٹ اور اس کی میزبانی کر چکا ہے جن میں افغانستان، پاکستان، چین اور طالبان شامل ہیں۔ مزید یہ کہ چین ماسکو مذاکرات کی بھی حمایت کرتا ہے جس نے تمام اہم فریقوں کے درمیان ایک سیاسی مفاہمت کرانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔

حالیہ سالوں کے دوران چینی ماہرین اور تجزیہ کار اس خواہش کا اظہار کر چکے ہیں کہ تمام ہمسایہ ممالک بشمول امریکہ کو ایک مشترکہ میکنزم پر متفق ہونا چاہیے تا کہ افغانستان سے غیر ملکی افواج کے نکلنے کے بعد پیدا ہونے والی صورت حال سے نمٹا جا سکے۔ ان کا کہنا ہے کہ یہ میکنزم سیاسی، نسلی اور علاقائی توازن کو یقینی بنا دے گا۔ اس تمام صورت حال میں ایک اصطلاح چینی حلقوں میں تواتر کے ساتھ سننے میں آتی ہے اور وہ ہے ''ذمہ دارانہ انخلا''، جس کے مطابق چین ان نتائج سے خوفزدہ تھا جو کہ افغانستان سے امریکی افواج کے اچانک انخلا کی صورت میں سامنے آ سکتے تھے؛ چنانچہ صدر بائیڈن کی جانب سے انخلا کے لیے گیارہ ستمبر دو ہزار اکیس کی تاریخ رکھے جانے سے تمام فریق چوکنا ہو گئے تھے۔

فروری 2014ء میں چینی وزیر خارجہ وانگ یی نے اپنے کابل کے دورے کے موقع پر خاص طور پر زور دے کر کہا تھا، ''افغانستان میں امن اور استحکام کا مغربی چین کی سلامتی پر ایک خاص اثر ہوتا ہے اور اس سے بھی زیادہ اہم یہ کہ اس سے پورے خطے کا سکون اور ترقی، دونوں متاثر ہوتے ہیں۔'' زیادہ تر مشاہدہ کار اسے چین کی اس تشویش کا اظہار سمجھتے ہیں جو وہ سنکیانگ میں علیحدگی پسند

تحریک کے حوالے سے رکھتا ہے۔ پھر دو ہزار پندرہ میں وانگ یی نے ایک بار پھر افغانستان کی پولیٹیکل ٹرانزیشن کے لیے اپنے ملک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے عالمی برادری پر زور دیا کہ وہ چار بڑے شعبوں میں کابل کی معاونت کریں۔ یہ شعبے درج ذیل ہیں:

☆ افغانستان کے عوام کی مدد کی جائے کہ وہ اکٹھے ہو کر ایک مؤثر حکومت تشکیل دیں۔

☆ تمام گروہوں بشمول طالبان میں سیاسی مصالحت کرائیں۔

☆ افغانستان کی معیشت کی تعمیر نو میں مدد کریں۔

☆ علاقائی تعاون میں افغانستان کے داخلے کی اعانت کریں۔

تاہم بیجنگ، شنگھائی، اُرمچی اور گوانگ زو میں میری چینی سکالرز اور دانشوروں سے جو ملاقاتیں ہوئیں وہ اس تشویش اور ان تفکرات سے آگے کی تھیں۔ چینی سکالرز علاقائی تعاون کے حوالے سے اپنے ملک کے کردار اور ویژن کے بارے میں بلند آہنگ اور زیادہ پُر اعتماد ہو گئے ہیں؟ چنانچہ 2014ء سے افغانستان اور پاکستان کے حوالے چینی پالیسی میں بھی ارتقا ہوا ہے اور اس کو اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے:

☆ افغان مصالحت کے عمل میں ایران کی شمولیت کی خواہش۔

☆ امریکہ کی یک طرفہ، مداخلت پسندانہ پالیسیوں کو مسترد کرنا (افغانستان، عراق اور پاکستان میں)

☆ پاکستان کی مرکزیت، اس کی قربانیوں اور سپورٹ کی تحسین کرنا۔

☆ امن اور استحکام کے لیے بنیادی عنصر کے طور پر افغانستان کے لیے علاقائی اپروچ کی حمایت کرنا۔

☆ پورے خطے کے وسیع تر مفاد کے حوالے سے بھارت سے قریبی اشتراک کے لیے تیار رہنا۔

پاکستان کا مرکزی کردار

پاکستان میں چین کے سابق سفیر چو گانگ (Zhou Gang) پاکستان کی حمایت کے

لیے بلند آواز رکھتے ہیں اور اپنے اس قریبی دوست ملک کو افغان مصالحت کاری کے لیے مرکزی اہمیت کا حامل سمجھتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے ''ہمیں پاکستان کے بارے میں بہت تشویش ہے اور ہماری حکومت معاشی امداد اور سیاسی یکجہتی کے ایک قدم کے طور پر 128 سے زیادہ منصوبوں کو جلد از جلد مکمل کرنے کے لیے پُرعزم ہے۔'' یہ بات کئی سال پہلے ان کے ساتھ ہونے والی ملاقاتوں میں انہوں نے مجھے بتائی تھی۔ کچھ دیگر ہم وطنوں اور پاکستانی مہمانوں کی موجودگی میں سفیر چو گانگ نے اعتراف کیا تھا کہ پاکستان نے دہشت گردی کے خلاف عالمی جنگ میں جتنی قربانیاں دی ہیں اور اس جنگ کے جتنے تباہ کن سیاسی، سماجی اور معاشی اثرات کا سامنا کیا ہے ان کو پیشِ نظر رکھا جائے تو بین الاقوامی سطح پر جتنا اعتراف کیا جانا چاہئے تھا' اتنا نہیں کیا گیا۔

وہ رابطہ فخر کا اور سوچ بچار کا ایک لمحہ تھا۔ سرکاری چینی سکالرز نے پاکستان کا کیس اس طرح لڑا کہ شاید پاکستان خود بھی نہ لڑ پاتا۔ دانشوروں کی جانب سے امریکہ کے لیے ان کا پیغام زوردار اور واضح تھا: پاکستان بہت تکلیف اٹھا چکا ہے اور ناجائز توقعات رکھتے ہوئے ہر وقت پاکستان کی مذمت کرنے کے بجائے چین اس کے ساتھ کھڑا ہے چاہے کچھ بھی ہو جائے۔

چین افغان مصالحتی عمل میں ایران کی شرکت کو بھی ایک ایسی مجبوری سمجھتا ہے جس سے بچنا ممکن نہیں۔ مزید یہ کہ ایران کی بی آر آئی میں شمولیت کے ذریعے چین مختلف علاقائی فریقوں اور ہمسایوں بالخصوص پاکستان، ایران اور افغانستان کے ساتھ ہم آہنگی تخلیق کرنے کا خواہاں ہے۔

جولائی 2020ء میں یہ رپورٹ سامنے آئی تھی کہ ایران اور چین اگلے پچیس سالوں کے لیے 400 ارب ڈالر کی ڈیل کر سکتے ہیں جس کے تحت چین ایرانی انفراسٹرکچر میں سرمایہ کاری کرے گا' اور اس کے بدلے ایران سے رعایتی نرخوں پر تیل لے گا۔ اس خبر سے امریکی میڈیا میں ہلچل مچ گئی تھی' جس نے نہ صرف اس ڈیل کے حوالے سے مبالغہ آرائی سے کام لیا' بلکہ یہ الزام بھی لگایا تھا کہ اس ڈیل کے ذریعے چین ایران پر عائد امریکی پابندیوں کا مذاق اڑا رہا ہے حالانکہ ایران ایک ایسا ملک ہے جو ایٹمی اور فوجی عزائم رکھتا ہے۔ تہران اور بیجنگ' دونوں نے امریکی میڈیا کی اس چیخ و پکار کو مسترد کر دیا اور قرار دیا کہ یہ ڈیل دونوں ملکوں کے مابین جامع سٹریٹیجک پارٹنرشپ معاہدے کا حصہ ہے' جو 2016ء میں چینی صدر شی جن پنگ اور ایرانی صدر حسن روحانی (Hassan Rouhani)

کے مابین ہوا تھا۔

مزید یہ کہ یہ ڈیل امریکہ کے لیے چینی پیغام کا حصہ بھی تھی جس میں امریکہ کو کہا گیا تھا کہ وہ ایران کے حوالے سے ایک شراکتی یا مشمولہ رویہ اختیار کرے۔ چینی حکام کے مطابق ایران افغانستان کے مختلف فریقوں میں مفاہمت کرانے میں بنیادی کردار ادا کر سکتا ہے' اور خطے میں طویل مدتی امن اور استحکام کے لیے بھی مدد کر سکتا ہے۔ اس سلسلے میں ایران کی وزارت خارجہ نے جولائی 2020ء میں اعلان کیا تھا کہ ایران افغانستان میں تمام افغان پارٹیوں کی شراکت کے ساتھ امن عمل کی حمایت کرتا ہے۔ ایران کے ڈپٹی وزیر خارجہ برائے سیاسی امور عباس اراقچی کا کہنا تھا کہ تمام افغان گروپوں بشمول طالبان کو افغانستان میں امن کے لیے کوششوں میں حصہ لینا چاہیے۔ انہوں نے کہا'' طالبان افغانستان میں ایک حقیقت ہیں اور امن مذاکرات ملک کے آئین اور حکومت کے فریم ورک میں رہتے ہوئے ہونے چاہئیں اور یہ ایک پُر سکون اور پُر امن ماحول میں ہونے چاہئیں''۔

چین نے افغان امن عمل میں تمام اہم فریقوں کو شامل کرنے کی حمایت کرتے ہوئے افغانستان سے امریکی فوج کے یقینی اور جلد بازی میں انخلا کے حوالے سے امریکہ کو تب انتباہی پیغام بھی دیا تھا'' اب وقت ہے کہ امریکہ مذاکرات کاروں کو دوبارہ یقین دہانی کرائے کہ وہ ان کے ساتھ طویل عرصے کے لیے چلے گا' اور ایسا نہیں ہوگا کہ فوری اہداف حاصل کرنے کے لیے انہیں آلے کے طور پر استعمال کر کے چلتا بنے۔ چین اپنے سیاسی اور سفارتی اثر ورسوخ کو امریکہ کی افغانستان سے اپنی فوجیں نکالنے میں بھی استعمال کرے گا اور ایک پُر امن افغانستان کے لیے سہولت کاری کرے گا' تاہم ایسا کسی دوسری قوم کی قیمت پر نہیں کیا جانا چاہئے۔''

یہ سوچیں نہ صرف امریکہ کے دیگر ممالک میں مداخلت (ہانگ کانگ اور سنکیانگ میں اپوزیشن کی مدد) کے خلاف چین کی محتاط تنقید سے پھوٹتی ہیں بلکہ یہ چین کے اصولوں میں شامل ہیں' جس کے تحت وہ دوسرے ممالک کے معاملات میں مداخلت نہیں کرتا اور پُر امن معاشی اشتراک چاہتا ہے جبکہ اس کی خطے میں بڑھتی ہوئی مصروفیات اور اس کا پاکستان پر فوکس اس کی اپنی ضروریات، عدم مداخلت کی پالیسی اور تجارتی و معاشی ترقی کے حوالے سے کمٹمنٹ سے پھوٹتا ہے۔

چین اس بات کا بھی شعور رکھتا ہے کہ باہمی فائدوں (win -win) کے ایجنڈے سے پارٹنر کو اعتماد دینا ہے' اور ایسا اعتماد سازی کے اقدامات سے ممکن ہوتا ہے، امریکہ کی طرح غنڈہ گردی والے رویے سے نہیں۔ پاکستان کی طرف سے ہمدردانہ طرز عمل اہمیت کا حامل ہے۔ اس کے لیے غیر مشروط سیاسی' معاشی سپورٹ بے مثال ہے اور پاکستان کو اس سے بین الاقوامی فورمز' جیسے ایف اے ٹی ایف' پر بڑا ریلیف ملتا ہے۔

تجارت کی ہتھیار بندی

چین پاکستان اور افغانستان میں مصالحت کرانے کے لیے اکثر اشارہ دیتا رہا ہے تاہم چینی حکام کے مطابق ان دونوں ملکوں کے رویے سے ہی پتا چلے گا کہ وہ چین کو اس معاملے میں کہاں تک شامل کرتے ہیں۔ وہ دونوں ملکوں کے حکام اور دورے پر آنے والوں کو یاد دلاتے رہتے ہیں کہ اگر چین آگے بڑھ سکتا ہے اور اپنے سیاسی طور پر حریف ممالک امریکہ، جاپان اور بھارت سے تجارتی تعلقات کو فروغ دے سکتا ہے تو پاکستان اور افغانستان ایسا کیوں نہیں کر سکتے۔ اگر دونوں ملک مشترکہ تاریخ، نسل، ثقافت، مذہب اور سرحدوں کے حامل ہو سکتے ہیں تو وہ اپنے مقدر یعنی سیاسی استحکام اور معاشی ترقی میں ایک دوسرے کو شریک کیوں نہیں کر سکتے؟ چینی حکام کا کہنا ہے کہ دونوں ملک دہشت گردی کی وجہ سے بہت نقصان اٹھا چکے ہیں۔

دونوں ملک تشدد کا خاتمہ چاہتے ہیں۔ دونوں ملک اپنی معیشت کی بحالی چاہتے ہیں۔ چینی حکام کا کہنا ہے کہ افغانستان تا حال عسکریت پسندی کو روکنے کی جدوجہد کر رہا ہے جبکہ پاکستان نے جون 2014ء میں اپنی فوجی مہم ''ضرب عضب'' کے ذریعے دہشت گرد گروہوں کے خلاف کامیابی حاصل کی تھی۔ حکام کا کہنا ہے کہ ہم تینوں کے لیے جو چیز سب سے اہم ہے وہ ہمارا اتفاق رائے اور ایک صفحے پر اکٹھا ہونا ہے۔ بیجنگ سے یہ پیغام ملتا ہے کہ ایک خوشگوار اور تعمیری ماحول بنانے کے لیے صبر اور تحمل سے کام لینا چاہیے۔

دوحا امن مذاکرات کے دوران چینی وزیر خارجہ وانگ یی نے بیان دیا تھا کہ ان کا ملک پورے اخلاص کے ساتھ امید رکھتا ہے کہ افغانستان میں امن کے حوالے سے تمام فریق اپنے لوگوں

اور اپنے ملک کے مفادات کے لیے اپنی ترجیحات مرتب کریں گے۔ انہوں نے زور دیا کہ سیاسی حل کی بنیادی سمت، جو کہ افغانوں کی اپروچ کا بنیادی اصول ہے، اور وسیع شراکت داری کے فریم ورک گول کی پابندی کی جانی چاہیے۔ وانگ یی کے مذکورہ بالا بیان میں ایک اہم نکتہ یہ تھا کہ انہوں امید ظاہر کی تھی کہ نئی افغان حکومت کا سٹرکچر اس قابل ہوگا کہ دہشت گردی کے خلاف لڑ سکے' ایک پُر امن اور دوستانہ خارجہ پالیسی کو چلا سکے' اور افغانستان کو سنجیدگی کے ساتھ امن، استحکام اور ترقی کے راستے پر گامزن کر سکے۔

انسداد دہشت گردی اور پُر امن خارجہ پالیسی کے حوالے سے یہ امید بی آر آئی کے تحت چین کے ان اہداف سے بھی مطابقت رکھتی ہے جو وہ علاقائی امن اور ارتباط کے حوالے سے رکھتا ہے۔ چین ہمیشہ کی طرح افغانستان میں مصالحتی عمل کے لیے معاون، مصالحت کار اور سہولت کار کا کردار جاری رکھے گا۔ چین یقین رکھتا ہے کہ عالمی برادری کو انصاف سے جڑے رہنا چاہیے۔ امریکہ کے افغانستان سے انخلا سے پہلے چین اس بات پر بھی یقین رکھتا تھا اور زور دیتا رہا تھا کہ افغانستان کی پُر امن تعمیرِ نو اور غیر ملکی افواج کے منظّم طریقے سے انخلا کے حوالے سے مل کر کام کرنا چاہیے تا کہ جنگ سے تباہ حال اس ملک میں ہموار ٹرانزیشن کو یقینی بنایا جا سکے۔

دوسری جانب پاکستان افغانستان کو اپنی اشیاء کی ایکسپورٹ سے بھی فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ تجارتی اعداد و شمار ان تین اہم ملکوں کے درمیان باہمی تعاون کو بھی بڑھاتے ہیں۔ یہ تینوں اہم ملک (چین' پاکستان' افغانستان) علاقے کی خوشحالی اور باہمی ربط کے لیے بھی اہم ہیں۔ پاکستان اور افغانستان کے مابین امن اور تعاون چین کے لیے اس کے ویژن کے ہموار طریقے سے نفاذ کو بھی یقینی بناتا ہے۔ تب چین کو اس بات کا بھی یقین تھا کہ افغانستان سے امریکی فوج کے انخلا کے بعد کے منظر نامے میں وہ ایک اہم سٹیک ہولڈر ہوگا' چنانچہ کابل میں پالیسی سازوں کے لیے بہت ضروری ہے کہ وہ امن کے لیے بیجنگ کے مشوروں اور کوششوں کو سنجیدگی سے لیں۔ مزید برآں افغانستان کو چین کی کسی بھی ایسی کوشش کا خیر مقدم کرنا چاہیے جس سے اول الذکر کے پاکستان سے تعلقات میں بہتری واقع ہو۔

افغانستان پاکستان کے ساتھ تقریباً 18 بارڈر کراسنگ چوکیاں شیئر کرتا ہے جن میں کے

پی یعنی خیبر پختونخوا کا طورخم اور بلوچستان کا چمن بارڈر بھی شامل ہیں جو کہ تجارتی مقاصد اور انسانی راہداری کے لیے مرکزی چوکیاں ہیں۔ یہ طورخم اور چمن کی سرحدی چوکیوں کی اہمیت کی وجہ سے ہے کہ چین نے مبینہ طور پر پاکستان سے درخواست کی ہے کہ وہ افغان ٹرانزٹ ٹریڈ کو دوبارہ شروع کرنے کے لیے ان چوکیوں کو کھولے۔ چین یہاں تک پیش کش کر چکا ہے کہ وہ ان سرحدی چوکیوں کی اپ گریڈیشن کے لیے مالی امداد بھی دے گا۔ اس سے چین کی اس شدید خواہش کا اندازہ ہوتا ہے جو وہ دونوں ملکوں کے مابین بلا رکاوٹ تجارت کے لیے رکھتا ہے۔ چین سی پیک کے فوائد کو افغانستان تک لے جانا چاہتا ہے کیونکہ اس کا ارادہ ہے کہ وہ افغانستان کو مستحکم کرے اور کابل کے ساتھ اپنے سیاسی اور معاشی تعلقات کو بہتر بنائے۔ دوسری طرف افغانستان بھی اس بات کو سمجھتا ہے کہ بی آر آئی اور سی پیک اس کی معیشت کو بحال کرنے کے لیے ایک کنجی کی حیثیت رکھتے ہیں، چنانچہ خطے کے ان تین اہم ممالک یعنی چین، پاکستان اور افغانستان کے درمیان سوچ کی مطابقت اور ہم آہنگی بھی افغانستان اور پاکستان کے خطے میں طویل مدتی معاشی اور سیاسی استحکام کے لیے ایک کنجی کی حیثیت رکھتی ہے۔

بی آر آئی (BRI) منصوبے کی وجہ سے چین گزشتہ ایک عشرے کے دوران ایک بڑے معاشی کنیکٹر کے طور پر ابھرا ہے۔ اسی عرصے میں چین خاموشی کے ساتھ افغان مصالحتی عمل میں ایک بڑے رابطے کے طور پر بھی سامنے آیا ہے اور پاکستان، افغانستان اور ایران کو ایک دوسرے کے قریب لانے اور ایک لڑی میں پرونے کے لیے بھی سرگرم کوششیں کر رہا ہے۔ حکام، ماہرین تعلیم (دانشور) اور بیجنگ میں پالیسی سازوں کا پختہ یقین ہے کہ علاقائی امن، ہم آہنگی اور روابط کا 'چینی وژن' صرف افغانستان اور پاکستان میں امن و استحکام کے ذریعے ہی حاصل کیا جا سکتا ہے۔ ان کا یہ بھی خیال ہے کہ پائیدار امن کا دارومدار اس بات پر ہے کہ کابل حکومت چین کو کس نظر سے دیکھتی ہے۔

افغانستان اور پاکستان دونوں یقیناً سیاسی اور اقتصادی تعلقات کو منظّم کرنے کے چینی طریقے سے سیکھ سکتے ہیں۔ یہ بھی کہ مخالف ممالک کے ساتھ بھی معاملات کو کیسے آگے بڑھایا جاتا ہے۔ بیجنگ کی عدم مداخلت کی پالیسیاں اور بی آر آئی کے تحت بنیادی ڈھانچے کے منصوبوں میں سرمایہ کاری علاقائی تنازعات، غربت اور دہشت گردی جیسے عدم استحکام پیدا کرنے والے عناصر کے خلاف طویل المیعاد رکاوٹیں کھڑی کرنے میں مددگار ثابت ہو سکتی ہے۔

باب نہم

چین اور انسدادِ دہشت گردی

خطے میں ہونے والے تین ایسے کام ہیں جن سے چین پہلے براہ راست منسلک نہیں تھا تاہم 2014ء کے بعد رونما ہونے والے دہشت گردی کے واقعات پر یہ ہمیں چین کے انسدادِ دہشت گردی کے حوالے سے ردعمل کے بارے میں مطلع کرتے ہیں:

1- سنکیانگ ایغور خودمختار علاقے میں ایغور علیحدگی پسندوں کا تشدد اور اس تشدد آمیز واقعات کی افغانستان میں جڑیں: ایک فکرمندی کا ماحول جو کہ 1990ء کی دہائی کے وسط سے تھا جب یہ علیحدگی پسند افغان طالبان سے منسلک ہوئے تھے۔

2- تجارت اور اقتصادی تعاون کے ذریعے علاقائی ربط کی جستجو۔

3- بڑھتا ہوا بھارت امریکہ تعاون اور خطے میں ان کے پھیلتے ہوئے قدموں کے نشانات چین کو محدود کرنے کی پالیسی کا حصہ دکھائی دیتے ہیں۔ چینی نقطہ نظر یہ ہے کہ یہ جغرافیائی سیاست کے حصے کے طور پر پراکسی دہشت گردی کے اندیشے کو بھی بڑھاتا ہے۔

خطے کے ممالک اور طاقتوں کے ساتھ مصروف ہوتے ہوئے چین ایک متحرک کردار ادا کرنے کی کوشش کرتا رہا ہے جو کہ مختلف تنازعات کو ختم کرنے میں مدد دے سکتا ہے اور اگر پراکسی دہشت گردی کو مکمل طور پر ختم نہیں تو کم ضرور کر سکتا ہے۔ اس سے خطے میں امن اور استحکام میں ایک متحرک کردار کا جنم بھی ہوتا ہے جو اس یقین سے پیدا ہوتا ہے کہ بیلٹ اینڈ روڈ انیشی ایٹو کے تحت تمام اقدامات بشمول چین پاکستان اکنامک کوریڈور (سی پیک) میں ان تمام ملکوں کو شامل کیا جائے گا جو خطے کے مغرب اور جنوب میں واقع ہیں۔

تجارتی ربط کے اس خواب کو پورا کرنے کے لیے چین نے دہشت گردی کے خلاف عالمی جنگ میں کسی قسم کے ناجائز ہتھکنڈوں کو اختیار کیے بغیر غیر معمولی کردار اپنے ذمہ لے لیا ہے، جو مغرب کی مداخلت پسندانہ اور سامراجی پالیسیوں کے برعکس ہے۔

سنکیانگ کا تناظر:

مسلم اکثریت کا حامل چین کا سنکیانگ ایغور خودمختار علاقہ ملک کی انسداد دہشت گردی کی پالیسیوں کے بنیادی عناصر میں سے ایک ہے۔ اسے چین کی دہشت گردی کے خلاف جنگ میں ایک بنیادی میدانِ جنگ تصور کیا جاتا ہے۔ اس لیے اس میں کوئی حیرانی کی بات نہیں کہ چین نے اپنی انسداد دہشت گردی کی کوششوں کو ملک کے سٹیٹ کونسل انفارمیشن آفس کے تیار کردہ وائٹ پیپر میں واضح کیا ہے۔ اس وائٹ پیپر کا عنوان ہے: The Fight against Terrorism and Extremism and Human Rights Protection in Xinjiang. یہ دہشت گردی اور انتہا پسندی کے خلاف چین کا پہلا باقاعدہ پالیسی فرم ورک ہے۔ اس میں چین کی انسداد دہشت گردی کی کوششوں کے بارے میں متعدد حوالے دیئے گئے ہیں۔ یہ حوالے بالخصوص 2014ء کے بعد سے ہیں، جب دہشت گردی کے متعدد واقعات میں سنکیانگ اور کن منگ کے علاقے لرز اٹھے تھے اور جہاں چاقو بردار حملہ آوروں نے مارچ 2014ء میں دو الگ الگ واقعات میں 35 معصوم شہریوں کی جان لے لی تھی۔

کن منگ میں چاقو بردار دہشت گردوں کی جانب سے پہلے منصوبہ بند حملے میں 29 افراد ہلاک اور 140 سے زیادہ زخمی ہو گئے تھے، جبکہ ایک حملہ چانگ شا کے علاقے میں ہوا تھا جو کہ ہونان صوبے کا دارالحکومت ہے اور اس حملے میں چھ افراد ہلاک ہوئے تھے۔

رپورٹوں کے مطابق ثانی الذکر حملے کی وجہ چانگ شا کے کائفو ضلع میں دو خوانچہ فروشوں کے درمیان مقامی منڈی میں پیدا ہونے والا تنازع تھا۔ اس میں ایک خوانچہ فروش نے مبینہ طور پر چاقو سے حملہ کر کے دوسرے خوانچہ فروش کو ہلاک کر دیا تھا۔ اس کے بعد اس نے آس پاس کھڑے دیگر لوگوں پر بھی حملہ کر دیا تھا۔ اس واقعے میں چار افراد ہلاک ہوئے تھے، جن میں سے دو افراد موقع

پر ہی ہلاک ہو گئے تھے جبکہ دو نے ہسپتال میں دم توڑا تھا۔

ابتدائی تحقیقات کے مطابق حکام نے کن منگ ریلوے سٹیشن میں ان مہلک چاقو بردار حملوں کو سنکیانگ علیحدگی پسندوں سے جوڑا تھا۔ مقامی حکام اور مرکزی حکومت نے کہا کہ شواہد کے مطابق اس حملے کے پیچھے علیحدگی پسند دہشت گردوں کا ہاتھ ہے۔ حکام کے دعوے کی تصدیق اس بات سے ہوتی ہے کہ ترکستان اسلامک پارٹی کے رہنما عبداللہ منصور نے نہ صرف یکم مارچ کے حملوں کی حمایت کی بلکہ مزید حملوں کی دھمکی بھی دی تھی۔

عبداللہ منصور نے رائٹر نیوز ایجنسی کو ارسال کئے گئے اپنے ایک ویڈیو پیغام میں کہا تھا: ''اگر آج مشرقی ترکستان کے جنگجو محض تلواروں اور چاقوں سے لڑائی لڑ رہے ہیں تو وہ دن دور نہیں جب انہیں بھی چینیوں کے خلاف لڑنے کے لئے آٹو میٹک گنیں میسر آ جائیں گی۔'' عبداللہ منصور نے خودکش حملوں کی بھی حمایت کی اور کہا کہ ''جو لوگ خودکش حملوں کے ذریعے اپنا لہو بہا رہے ہیں ان کا خون ضائع نہیں جائے گا، بلکہ ان کا خون ہزاروں نئے جہادی پیدا کرے گا۔''

ترکستان اسلامک پارٹی نے اس سے پہلے اکتوبر 2013ء میں تیان من سکوائر میں کار حادثے کی ذمہ داری بھی قبول کی تھی جس میں پانچ افراد ہلاک اور چالیس زخمی ہو گئے تھے۔

چینی وزارت خارجہ نے عبداللہ منصور کی تازہ ویڈیو کی بجا طور پر فوری مذمت کی۔ چینی ترجمان ہانگ لائی نے اس ویڈیو کو ای ٹی آئی ایم (The East Turkestan Islamic Movement) کی دہشت گردانہ فطرت کی عکاسی قرار دیا۔ انہوں نے ای ٹی آئی ایم کے خلاف کریک ڈاون کو دہشت گردی کے خلاف عالمی کوششوں کا حصہ قرار دیا۔

چین کا نائن الیون:

کن منگ کے واقعہ کا چینی حکومت کی جانب سے غیر معمولی ردِعمل ظاہر کیا گیا۔ واقعہ کے فوری بعد سکیورٹی پروٹوکول میں بے تحاشا اضافے سے پتا چلتا تھا کہ چینی حکومت دہشت گردی کے بارے میں کیا سوچتی ہے اور اس سے نمٹنے کے سلسلے میں اس کے کیا ارادے ہیں۔ شینن تزی نے ڈپلومیٹ میں اپنی یہ رائے پیش کی تھی کہ ''کن منگ میں سنکیانگ کے علیحدگی پسندوں کے اچانک

حملوں سے چینی عوام بالکل اسی طرح سکتے میں آ گئے جس طرح نائن الیون کے واقعے میں القاعدہ کے دہشت گردوں کے نیویارک اور واشنگٹن پر حملوں سے امریکی شہری آ گئے تھے۔''

سوشل میڈیا پلیٹ فارمز نے سنکیانگ کے علیحدگی پسندوں کے حملوں پر جس طرح رواں تبصرے کیے اس سے نائن الیون کے امریکی واقعے پر تبصروں کی یاد تازہ ہوگئی تھی۔ چین کے سوشل میڈیا پر مرتکزای میگزین ''ٹی لیف نیشن'' کے ایڈیٹروں رچل لو اور ڈیوڈ ورٹائم نے کالرز کے ردعمل کو شیئر کیا اور ان کا تجزیہ ان الفاظ میں کیا کہ ''متعدد صارفین نے یکم مارچ کے حملے کو ہمارا نائن الیون قرار دیا۔ ان نیٹی زنز (نیٹ پلس سٹیزنز) کے پاس شاید ایک نکتہ تھا کہ گیارہ ستمبر کے حملوں نے دہشت گردی کو امریکہ میں عوامی آگاہی کا مرکزی حصہ بنا دیا اور امریکیوں کے روزمرہ زندگی کے کلیوں قاعدوں کو ہی تبدیل کر کے رکھ دیا تھا۔ ایئر پورٹ سکیورٹی کو مکمل طور پر بہتر بنا دیا گیا۔ عوامی مقامات جیسے سب ویز پلیٹ فارمز میں ایسے بل بورڈ لگا دیے گئے جن پر تحریر ہے'' کچھ دیکھیں تو ضرور آگاہ کریں'' ان سلوگنز کے ذریعے امریکیوں کو کہا گیا کہ وہ چوکنے رہیں۔ (نائن الیون کے سانحے میں بڑے پیمانے پر اموات اور اس حقیقت کہ ایسا حملہ امریکی سرزمین پر ہوا) دونوں نے امریکیوں کی نفسیات کو بدل کے رکھ دیا۔''

امریکہ نے اقوام متحدہ کی قراردادوں کے برخلاف افغانستان اور عراق، دونوں پر حملہ کر دیا۔ ثانی الذکر پر حملے کے لیے بڑے پیمانے پر تباہی پھیلانے والے ہتھیاروں کی موجودگی کے جھوٹے بہانے کو بنیاد بنایا گیا تھا۔

براؤن یونیورسٹی کے واٹسن انسٹی ٹیوٹ کے اعداد و شمار کے مطابق ان جنگوں میں آٹھ لاکھ سے زیادہ افراد ہلاک ہوئے تھے۔ امریکہ نے بڑی تعداد میں لوگوں کو بے گھر کرنے والی ان جنگوں پر 2.261 ٹریلین ڈالرز خرچ کیے۔ علاوہ ازیں کئی ریاستوں کا قومی انفراسٹرکچر مکمل طور پر تباہ ہوگیا اور مشرق وسطیٰ کا بڑا حصہ کھنڈرات میں تبدیل ہوگیا۔ اوپر بیان کیے گئے اعداد و شمار ایک محتاط اندازے کے مطابق ہیں اور صحیح اعداد و شمار اس سے کہیں زیادہ تباہی کی نشان دہی کرتے ہیں۔

وائٹ پیپر:

چین کے سٹیٹ کونسل انفارمیشن آفس نے بھی اس عزم کو پھیلایا۔ پیش لفظ اور اختتام کے

علاوہ یہ وائٹ پیپر سات مرکزی حصوں پر مشتمل ہے:

ایک: سنکیانگ طویل عرصے سے چینی علاقے کا اٹوٹ انگ ہے۔

دو: دہشت گردی اور انتہا پسندی کا منبع سنکیانگ میں ہے۔

تین: متشدد دہشت گردی اور مذہبی انتہا پسندی انسانی حقوق کی سب سے بڑی خلاف ورزی ہیں۔

چار: قانون کے مطابق دہشت گردی اور انتہا پسندی پر ضرب لگانا۔

پانچ: دہشت گردی کے روک تھام پر مبنی انسداد کو سب سے بڑی ترجیح قرار دینا۔

چھ: کاؤنٹر ٹیررازم اور ڈی ریڈیکلائزیشن کا تجربہ حاصل کرنا۔

سات: بین الاقوامی کاؤنٹر ٹیررازم کے تبادلے اور تعاون۔

یہ وائٹ پیپر ٹرانس بارڈر ایشوز سے مشترکہ طور پر نمٹنے کے لیے چین کے بین الاقوامی فورمز ''اقوام متحدہ اور کنونشنز'' کے ساتھ اس عزم کا اعادہ کرتا ہے کہ ٹرانس بارڈر ایشوز سے مشترکہ طور پر نمٹا جائے گا تاکہ اس کا فائدہ دنیا کے تمام ممالک کو پہنچ سکے۔

وائٹ پیپر میں کہا گیا ہے ''بین الاقوامی برادری کے ایک ذمہ دار رکن کے طور پر چین اقوام متحدہ کی اس معاملے میں مکمل حمایت کرتا ہے کہ وہ دہشت گردی کے خلاف بین الاقوامی تعاون میں ایک سرکردہ اور متحرک کردار ادا کرے۔ چین اقوام متحدہ کے چارٹر اور بین الاقوامی قانون کے دیگر اصولوں اور ضوابط کا احترام کرتا ہے اور وہ دہشت گردی سے نمٹنے کے لیے ان متعدد قراردادوں کی حمایت کر چکا ہے جو اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل نے اختیار کیں اور اس نے اقوام متحدہ کی عالمی انسداد دہشت گردی کی سٹریٹیجی کو مکمل اور بھرپور طریقے سے نافذ کرنے کے لیے اپنا کردار ادا کیا۔''

یہ پیپر اس چیز کی بھی نشان دہی کرتا ہے کہ چین کس طرح بین الاقوامی کنونشنز کو تسلیم کرتا اور ان کی پابندی کرتا ہے ''چین زیادہ تر بین الاقوامی انسدادِ دہشت گردی کنونشنز کو تسلیم کرتا ہے اور شنگھائی تعاون تنظیم کے فریم ورک کے تحت چین اور متعلقہ ممالک اس شعبے میں کئی دستاویزات پر دستخط کر چکے ہیں۔''

اس پیپر میں چین کی جانب سے انسدادِ دہشت گردی کے حوالے سے معلومات کے

تبادلوں اور تعاون کے لیے کیے گئے اقدامات پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہ اقدامات انسداد دہشت گردی کے خلاف مشترکہ مشقوں کے طور پر دوطرفہ اور کثیر جہتی میکنزم، مشترکہ سرحدی دفاعی آپریشنز اور دہشت گرد، علیحدگی پسند اور انتہا پسند فورسز کی جانب سے سائبر سپیس کی غیر قانونی سرگرمیوں کو روکنے اور اس کے ساتھ ساتھ سکیورٹی تعاون، انٹیلی جنس معلومات کے تبادلوں اور اہم بین الاقوامی ایونٹس کے دوران عدالتی تعاون کے ذریعے عمل میں لائے گئے۔

سٹیٹ کونسل انفارمیشن آفس کی جانب سے جاری کردہ وائٹ پیپر میں اس بے چینی کے بارے میں خاص طور پر بات کی گئی جس کو ایغور علیحدگی پسند ہوا دیتے ہیں۔ وائٹ پیپر میں لکھا ہے کہ کچھ عرصے سے چین کے صوبہ سنکیانگ میں علیحدگی پسندوں، مذہبی انتہا پسندوں اور دہشت گردوں کے مشترکہ اثرات کے تحت متواتر دہشت گردوں کے حملے ہوتے رہے ہیں۔ یہ حملے سنکیانگ میں ہر مذہب و نسل کے لوگوں کے لیے جان و مال کے حوالے سے نقصان دہ ثابت ہوتے رہے ہیں اور لوگوں کی عزت و حرمت کو پامال کرتے رہے ہیں۔

انسداد دہشت گردی کی کوششوں کے نتیجے میں سنکیانگ ایغور خودمختار ریجن میں مقامی حکام نے 2014ء سے اب تک سنکیانگ میں 1588 متشدد اور دہشت گرد گینگز کو تباہ کیا، بارہ ہزار نو سو پچانوے (12995) دہشت گردوں کو گرفتار کیا، دو ہزار سے زائد (2052) بموں کو ناکارہ بنا کر اپنے قبضے میں لیا، اڑتالیس سو اٹھاون (4858) غیر قانونی مذہبی سرگرمیوں پر تیس ہزار چھ سو پینتالیس (30645) افراد کو سزا دی جبکہ غیر قانونی مذہبی مواد کی حامل تین لاکھ پینتالیس ہزار سے زائد (345229) کاپیوں کو ضبط کیا۔

وائٹ پیپر میں دہشت گردی کے خلاف جنگ میں دوہرے معیارات کا بھی ذکر کیا گیا اور کہا گیا ہے کہ چین نے دہشت گردی اور انتہا پسندی کو کچھ خاص ملکوں، نسلی گروہوں یا مذاہب کے ساتھ منسلک کرنے کی مخالفت کی تھی۔ اس کے بجائے چین ایسے جامع اقدامات کی حمایت کرتا ہے جن کے ذریعے علامات اور بنیادی وجوہات دونوں سے نمٹا جا سکے اور جن کا دوہرا مقصد ہو کہ دہشت گردانہ سرگرمیوں پر کاری ضرب لگائی جائے اور ساتھ ہی غربت کو ختم کیا جائے۔ اس استثنا کا بھی ذکر کیا گیا جو اسرائیل کو حاصل ہے اور جسے ہر قسم کی جوابدہی سے بچایا گیا ہے۔ اسرائیل اور فلسطینیوں

کے مابین جب بھی کسی چوائس کا معاملہ ہوتا ہے تو ہمیشہ اسرائیل کا ساتھ دیا جاتا ہے۔ کشمیر کے معاملے میں بھارتی ظلم وستم کے حوالے سے مغرب نے جس طرح چپ سادھ رکھی ہے اس کا بھی حوالہ دیا گیا، بالخصوص جب 2019ء میں یونین علاقہ جات کے طور پر کشمیر کو بھارت میں شامل کرلیا گیا۔ یہ مغرب کے دوہرے معیار اور اقوام متحدہ کی قراردادوں کی تذلیل کی ایک اور مثال ہے۔

پولیٹیکل اکانومسٹ گاؤ ژیوتانگ نے بیجنگ میں دہشت گردی کے خلاف چائنا فرینڈ شپ ایسوسی ایشن کی منعقد کردہ ایک کانفرنس میں کہا تھا کہ یورپ میں چاقو سے حملے کا ایک واقعہ ہو جائے تو اسے دہشت گردی قرار دے دیا جاتا ہے لیکن اگر چین میں ایسا ہو جائے تو کہا جاتا ہے کہ یہ آزادی کے متوالے حکومت مخالف مسلم عسکریت پسندوں کی کارروائی ہے۔

وفود سے گفتگو کرتے ہوئے چن زیمن نے اس 'دوہرے معیار' کی نفی کرنے کی اہمیت پر زور دیا۔ انہوں نے کہا ''اگر چین یا امریکہ پر کوئی حملہ ہوتا ہے تو اس کے لیے ایک ہی تعریف ہونی چاہئے اور اسے دہشت گردانہ حملہ ہی کہنا چاہیے۔''

چینی شرکا نے فرانسیسی صدر میکرون کے بیانات کا حوالہ دیا جس میں انہوں نے دو متنازع باتیں کی تھیں۔

اول: چین ہمارے دفاع کے لیے ایک اجتماعی ہدف ہونا چاہیے۔

دوئم: داعش یا القاعدہ پر نیٹو کا سب سے زیادہ فوکس ہونا چاہیے اور یہ کہ اسلامی دہشت گردی ہماری دشمن ہے۔

بیجنگ یونیورسٹی میں جنوبی ایشیا کے ماہر وانگ شو نے سوال اٹھایا کہ کیا ہم نے کسی ملک پر حملہ کیا اور کیا ہم نے دیگر ممالک میں جنگوں کو فروغ دیا؟

کانفرنس میں پاکستان کے ساتھ اس سلوک کی بازگشت بھی سنائی دی جو فنانشل ایکشن ٹاسک فورس (ایف اے ٹی ایف) پاکستان کے ساتھ کر رہی ہے۔ کیا یہ صرف دہشت گردی کے قابل اعتراض الزامات کی وجہ سے پاکستان پر توجہ مرکوز کیے ہوئے ہے یا چین کے ساتھ اس کی شراکت داری پر ایسا کر رہی ہے یا اس کی وجہ وہ جغرافیائی سیاسی کھیل ہے جو امریکہ اور اس کے مغربی اتحادی بھارت کے ساتھ مل کر اس خطے میں کھیل رہے ہیں اور جس کی وجہ چین کا خطے میں بڑھتا ہوا

اثر ورسوخ ہے؟ یہ وہ چند سوالات تھے جن پر شدید بحث کی گئی جبکہ کچھ شرکا نے یہ سوال بھی اٹھایا کہ خلیجی ریاستوں ''جیسے دوبئی'' کو ایف اے ٹی ایف کی سکروٹنی لسٹ سے کیوں نکالا گیا جبکہ یہ بات سب کو معلوم ہے کہ دنیا بھر کا کالا دھن خلیجی ریاستوں کے بڑے بڑے منصوبوں میں لگایا جاتا ہے۔

سی ٹی (کاؤنٹر ٹیررازم) پر چین کی کثیر جہتی اپروچ

افغانستان کا مسئلہ اور انسدادِ دہشت گردی کا فوکس:

چین خاموشی کے ساتھ لیکن ثابت قدم رہ کر اپنی افغان اور انسدادِ دہشت گردی کی پالیسی کو چلا رہا ہے اور اس سلسلے میں علاقائی سٹیک ہولڈرز بالخصوص پاکستان اور روس کے ساتھ قریبی مشاورت کر رہا ہے۔ اس خاموش سفارت کاری کے ساتھ چین دہشت گردی کے خلاف معاشی طور پر مضبوط دفاعی دیوار کی طرح ابھرا ہے یعنی ایک ایسی طاقت جو اپنے معاشی غلبے کی بدولت انسدادِ دہشت گردی کی علاقائی کوششوں میں مدد کر رہی ہے۔

دسمبر 2014ء میں جب افغانستان سے امریکی اور نیٹو افواج کے انخلا کی باتوں نے زور پکڑا تو اس نے افغان محاذ پر بیجنگ کے ایکٹوازم کے لیے ایک ٹریگر کا کام کیا لیکن اس معاملے میں چین کی غالب خواہش قیام امن تھی جو کہ خطے میں تجارت کی شرطِ اولین تھی۔ (اس حوالے سے تفصیلی معلومات کے لیے باب نمبر آٹھ ملاحظہ کریں کہ چین کس طرح افغانستان میں استحکام کی کوششوں میں مصروف رہا)۔

اسلام آباد میں چین کے سفارت کار رہنے والے اور اب شنگھائی میں فودان یونیورسٹی کے ڈائریکٹر ساؤتھ ایشیا سٹڈیز سنٹر ڈویو کانگ کہتے ہیں کہ بڑا پس منظر یہ تھا کہ امریکہ افغانستان سے اپنی زیادہ تر افواج نکال لے گا جبکہ ابھی اس کا انسداد دہشت گردی مشن مکمل نہیں ہوا ہوگا اور اس کا مطلب ہوگا افغانستان کو مشکلات میں چھوڑ دینا۔

ان کا مزید کہنا تھا کہ ''افغانستان میں بمباری کبھی نہیں رکی تھی یہاں تک کہ دارالحکومت کابل میں بھی نہیں رکی۔ افغانستان کی چین کے ساتھ سرحد لگتی ہے لہٰذا چین کو خطے میں امن کے قیام

کے لیے کوششوں میں شامل ہونا ہی تھا۔''

بی آر آئی کا تحفظ:

چین کی سی ٹی اپروچ اور افغانستان میں مصروفیت کے حوالے سے دوسرا ٹریگر (محرک) بی آر آئی (بیلٹ اینڈ روڈ انیشی ایٹو) کا سب سے بڑا منصوبہ سی پیک تھا۔ بیجنگ اور اسلام آباد دونوں جانتے ہیں کہ وسط ایشیا سے منسلک ہونے کے لیے افغانستان بہت زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔

مغربی سنکیانگ خطے، جو حجم میں سب سے بڑا اور معدنی دولت سے مالا مال ہے، میں ایغور اسلامی قوم پرست بغاوت ایک اور عنصر ہے جو چین کی اس خواہش کے لیے ایندھن کا کام کر رہا ہے کہ وہ افغانستان کے معاملات میں زیادہ سرگرم اور متحرک طور پر شامل ہو؛ تاہم زیادہ توجہ دہشت گردوں کو شکست دینے اور افغانستان میں قیام امن پر ہی مرکوز رہے جو طویل عرصے سے دہشت گرد گروہوں جیسے القاعدہ، داعش اور مشرقی ترکستان اسلامک موومنٹ کا گڑھ سمجھا جاتا ہے اور جس نے سنکیانگ کے ایغور سنی مسلمانوں میں اپنے لیے حمایت حاصل کرنے کی کوشش کی تھی۔

چین افغانستان کے طول و عرض میں پیدا اور تیار ہونے والی منشیات کو تباہ کرنے کے لیے بھی امن اور استحکام کو اہم سمجھتا ہے۔ اس میں سے کچھ منشیات سنکیانگ کے راستے چین میں بھی پہنچتی ہیں۔

منشیات ہی اس مہلک ملغوبے کا ایک حصہ ہے جو افغانستان میں ہر قسم کے نان سٹیٹ ایکٹرز جیسے منشیات کے سمگلرز، جرام پیشہ افراد اور دہشت گردوں کے لیے گنجائش رکھتا ہے۔ امریکہ کے افغانستان میں ایک سابق کمانڈر جنرل جان ایلن، جنہوں نے جولائی 2011ء سے فروری 2013ء تک افغانستان میں 1.5 لاکھ امریکی اور نیٹو فورسز کی قیادت کی، نے بھی ان عناصر کو افغانستان میں جاری بدامنی کا منبع قرار دیا تھا۔

جنرل ایلن نے مئی 2018ء میں بروکنگز انسٹی ٹیوٹ میں اپنی اسیسمنٹ پیش کی، جس میں انہوں نے کہا کہ ''میرے مطابق افغانستان کے مستقبل کو سہ جہتی خطرہ درپیش ہے لیکن ساتھ ہی فوجی تناظر میں دیکھا جائے تو ایک نظریاتی عسکریت پسندی بھی ہے جسے ہم طالبان کہتے ہیں۔ اس

کے علاوہ منشیات کے بڑے انٹر پرائز ہیں جو عسکریت پسندوں اور مجرمانہ رویوں کے لیے ایندھن کا کام کرتے ہیں اور اس کے بعد ان کی سرپرستی کے لیے نیٹ ورک ہیں۔ میرا نہیں خیال کہ ہم ان سے نمٹنے کے لیے مناسب طور پر منظّم ہیں۔''

علاقائی ایکٹرز کے ساتھ ہم آہنگی:

علاقائی سلامتی کو درپیش خطرات کی اجتماعیت وہاں پر ہے جہاں چین، روس، پاکستان، ایران اور ترکی کے موقف ہم آہنگ ہوتے ہیں اور چین کو اجازت دیتے ہیں کہ وہ معاون علاقائی انسدادِ دہشت گردی پالیسی (سی ٹی) کے پیچھے ایک نمایاں قوت بنے۔

سکس پلس ون کے علاوہ ایک کثیر جہتی فورم، جو چین، امریکہ اور افغانستان پر مشتمل ہے' بھی انہیں اہداف کے حصول کی کوششوں میں مصروف ہے، لیکن چینی حکام سیاسی معاملات کی وجہ سے اس کی اتنی تشہیر نہیں کر رہے جتنی دوسرے ٹریکس کی کرتے ہیں۔ یہ 'خاموش سفارت کاری' چینی اخلاقیات اور ثقافت میں بڑی گہری جڑیں رکھتی ہے۔ وہ اپنے اہداف کا تعاقب بڑی خاموشی سے کرتے ہیں جب تک کہ مشن مکمل ہونے کے قریب نہیں پہنچ جاتا۔ 'بالکل ایسے ہی جیسے بھرپور توانائی کے حامل ڈرم بجانے والے بانسری کی دھیمی لَے بکھیریں' چینی لوگ بانسری کی دھیمی لے کی طرح کام کرتے ہیں۔

یہ حیرت کی بات نہیں ہے کہ فروری تا جولائی 2017ء کے درمیانی عرصے میں اسرائیل، ترکی، پاکستان اور متحدہ عرب امارات کے دفاعی حکام نے بیجنگ کے الگ الگ دورے کیے اور چین کے ساتھ سکیورٹی کے معاملات میں تعاون کے حوالے سے بات کی۔ بیجنگ نے پی ایل اے نیوی کو متعدد مواقع پر علاقے کا دورہ کرنے کے لیے بھیجا۔ چینی بحریہ کے جہازوں نے مشرقِ وسطیٰ کے متعدد ملکوں کی بندرگاہوں کے دورے کیے جن میں ایران، اومان، کویت، پاکستان، سعودی عرب، ترکی، قطر اور متحدہ عرب امارات کی بندرگاہیں شامل ہیں۔ ان میں سے متعدد دورے کئی برسوں میں پہلی بار کیے گئے تھے۔

چائنا گلوبل سکیورٹی ٹریکر نے ''پلان'' کی 2008ء سے خلیج عدن اور بحیرہ عرب کے

پانیوں میں مستقل موجودگی کی بات بھی کی جو کہ اس کی بحری قزاقی کے خلاف آپریشنز میں مسلسل مصروفیت کا نتیجہ ہے۔ اسی اثنا میں اس کا پہلا سمندر پار فوجی اڈہ، جو جبوتی میں قائم کیا گیا تھا، 2017ء میں آپریشنل ہو گیا۔

اسی سال مارچ میں چین نے کمبوڈیا کے ساتھ مل کر دوسری انسداد دہشت گردی اور انسانی بچاؤ کی مشقیں 'ڈریگن گولڈ 2018ء' کیں۔ یہ مشقیں ماراس پرووماؤنٹینز (ایم پی ایم) کے تربیتی میدان میں کی گئی تھیں۔ یہ مشقیں چین اور کمبوڈیا کے مابین سفارتی تعلقات کے ساٹھ سال مکمل ہونے پر کی گئی تھیں۔ مشقوں میں رائل کمبوڈین آرمڈ فورسز (آر سی اے ایف) کے دو سو اسی اور چین کی پیپلز لبریشن آرمی (پی ایل اے) کے دو سو سولہ فوجیوں نے شرکت کی تھی۔

اس سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ چین کتنی سنجیدگی سے دہشت گردی کے خلاف کارروائیوں پر اپنی توجہ مرکوز کیے ہوئے ہے اور اس سلسلے میں اپنے آس پاس کے ممالک کو کس طرح اعتماد میں لے رہا ہے تاکہ ٹرانس بارڈر دہشت گردی سے نمٹا جا سکے۔

چین طویل عرصہ افغانستان سمیت کسی بھی جنگ یا تنازع میں ملوث ہونے کا مخالف رہا ہے۔ وہ کسی کی سائیڈ بھی نہیں لینا چاہتا ہے؛ تاہم افغان حکام نے صدر حامد کرزئی کے دور میں ہر موقع پر چینی رہنماؤں پر دباؤ ڈالنا شروع کر دیا تھا کہ وہ اسلام آباد کو قائل کریں کہ وہ طالبان جنگجوؤں کا خاتمہ کرے۔

مزید یہ کہ چین متعدد دیگر بین الاقوامی فورمز کا بھی رکن رہا ہے جیسے ہارٹ آف ایشیا، دی کابل ڈائیلاگ، کوآڈری لیٹرل کوآرڈی نیشن گروپ (کیو سی جی) اور ٹرائیکا پلس (جس میں امریکہ اور روس بھی شامل ہیں)؛ چنانچہ یہ کوئی اتفاق نہیں کہ چین کی وزارت برائے خارجہ امور اور وزارت برائے پبلک سکیورٹی نے اقدامات کا ایک سلسلہ شروع کیا' جس میں بیجنگ میں ہونے والے سہ جہتی مذاکرات اور سمپوزیم شامل ہیں' جن میں چین کے علاوہ پاکستان اور افغانستان کے حکام اور ماہرین نے شرکت کی۔ یہ ایک متوازی کوشش تھی، جس میں چین کی وزارت برائے خارجہ امور نے ٹریک ون کے تحت سرکاری سٹیک ہولڈرز کو انسداد دہشت گردی کے عمل میں مصروف کیا تھا' جبکہ دوسری جانب وزارت برائے عوامی سلامتی نے ٹریک ٹو کے تحت نجی تھنک ٹینکس اور افغانستان اور پاکستان

دونوں کے دانشوروں سے سٹریٹیجک مذاکرات اور رہنمائی کے لیے مشورہ کیا تھا۔

دہشت گردی پر بین الریاستی مطابقت کے لیے شنگھائی تعاون تنظیم کا استعمال:

اسی عرصے کے دوران بیجنگ، اسلام آباد اور نئی دہلی کو کثیر جہتی فورموں پر ایک دوسرے کے قریب لانے کی بھی کوشش کرتا رہا جیسے کہ پہلی مشترکہ انسدادِ دہشت گردی مشقیں وغیرہ۔ یہ مشقیں شنگھائی تعاون تنظیم (ایس سی او) کے تحت اگست 2018ء میں روس میں ہوئی تھیں۔

ایک نیوز بریفنگ میں چینی وزارتِ خارجہ کے ترجمان ہوا چن ینگ نے کہا تھا کہ ''ہم سنجیدگی کے ساتھ امید رکھتے ہیں کہ وہ دوطرفہ بنیادوں پر اور کثیر جہتی میکنزم، جیسے ایس سی او، کے تحت اپنے بات چیت کے عمل اور تعاون کو بڑھا سکتے ہیں، تعلقات بہتر بنانے کے لیے اکٹھے کام کر سکتے ہیں اور مشترکہ طور پر علاقائی امن اور استحکام کو برقرار رکھ سکتے ہیں۔''

وزارت خارجہ کے ترجمان نے مزید کہا کہ بھارت اور پاکستان، دونوں جنوبی ایشیا کے اہم ممالک ہیں اور یہ کہ ''ان کے تعلقات میں استحکام اس خطے اور پوری دنیا میں امن اور ترقی کے لیے کنجی کی حیثیت رکھتا ہے۔''

ایس سی او کے رکن ممالک کی انسدادِ دہشت گردی مشقوں میں چین، روس، قازقستان، تاجکستان، کرغیزستان، بھارت اور پاکستان کے تین ہزار فوجیوں نے حصہ لیا تھا۔ یہ ایس سی او کے چارٹر کے تحت سب سے بڑی مشقیں تھیں جن میں پاکستان اور بھارت نے پہلی بار شرکت کی تھی۔ چین کی وزارت برائے قومی دفاع کے ترجمان رین گاؤ چیانگ کا اس بارے میں کہنا ہے کہ ''ان مشقوں نے رکن ممالک کے درمیان دفاع اور سلامتی کے حوالے سے تعاون میں گہرائی پیدا کرنے، نئے خطرات اور چیلنجز سے نمٹنے کے لیے صلاحیت میں اضافہ کرنے اور علاقائی امن اور استحکام کے تحفظ کے معاملات میں مثبت کردار ادا کیا۔''

اس سے پہلے ہونے والی ایس سی او کی انسدادِ دہشت گردی کی مشقیں محدود تھیں اور ان میں صرف وسطی ایشیا کے ممالک، جو کہ ایس سی او کے رکن تھے، شرکت کرتے تھے لیکن ان مشقوں میں بھارت اور پاکستان کی شمولیت کے بعد اس انسدادِ دہشت گردی مشن کا دائرہ کار پورے جنوبی

ایشیا تک توسیع اختیار کر گیا، حالانکہ پاکستان اور بھارت دو ایٹمی ممالک ہیں اور روایتی حریف کے طور پر جانے جاتے ہیں۔

بیجنگ میں چائنا انسٹی ٹیوٹ آف کونٹمپریری انٹرنیشنل ریلیشنز میں انسدادِ دہشت گردی کے ماہر لی وائے نے اس حوالے سے اظہارِ خیال کرتے ہوئے بتایا کہ ''ایس سی او (شنگھائی تعاون تنظیم) کے رکن ممالک کے درمیان انسدادِ دہشت گردی کے حوالے سے مؤثر تعاون نے حالیہ برسوں کے دوران وسطی ایشیا میں دہشت گرد گروہوں کو کھوکھلا کر دیا اور امید کی جاتی ہے کہ یہ تعاون جنوبی ایشیا میں بھی استحکام میں اضافہ کرے گا۔ جسے انسدادِ دہشت گردی کے حوالے سے وسطی ایشیا سے زیادہ پیچیدہ صورت حال کا سامنا ہے اور جہاں دہشت گردوں کے متعدد گروہ موجود ہیں۔''

چین کی اکیڈمی آف سوشل سائنسز کے پروفیسر سن ژوژی کہتے ہیں کہ 2018ء کا امن مشن پاکستان اور بھارت 'جو طویل عرصے سے فوجی تنازعات کا شکار ہیں' کے لیے ایک نادر موقع تھا کہ وہ اپنے فوجی تبادلہ جات اور اعتماد میں اضافہ کریں۔ اس سے علاقائی استحکام میں بہتری آ سکتی تھی۔

2018ء کا سال اس حوالے سے یاد رکھا جائے گا کہ اس میں چینی صدر شی جن پنگ نے علاقائی امن واستحکام کے لیے خصوصی کوششیں کیں۔ اپریل میں انہوں نے ووہان میں بھارتی وزیراعظم نریندر مودی سے بالمشافہ ملاقات کی اور امید کا اظہار کیا کہ اس سے دونوں ملکوں کے تعلقات میں بہتری آئے گی۔ انڈیا اور پاکستان، دونوں کی ایس سی او انسدادِ دہشت گردی مشقوں میں شرکت بھی اسی امن مشن کا حصہ تھی۔

دونوں راہنماؤں نے افغانستان میں اپنی نوعیت کے پہلے مشترکہ معاشی منصوبے کے لیے بھی آمادگی ظاہر کی۔ ووہان میں نریندر مودی سے ملاقات کے بعد چینی صدر شی جن پنگ نے جنوبی بھارت کے ساحلی شہر ماملا پورم میں اکتوبر 2019ء میں مودی سے غیر روایتی ملاقات کی تھی۔ لیکن اپریل مئی 2020ء میں مشرقی لداخ میں بھارت اور چین کا علاقائی تنازع کھڑا ہو گیا جس سے خطے میں امن کی کوششیں ایک بار پھر کھٹائی میں پڑ گئیں اور اس عمل سے بھارت اور پاکستان کے مابین کشیدہ تعلقات میں بہتری لانے کی امیدیں بھی دم توڑ گئیں۔

علاقائی تحفظات

انسدادِ دہشت گردی پر پاک چین مطابقت:

اگرچہ پاکستان جون 2018ء میں اپنے آپ کو فنانشل ایکشن ٹاسک فورس (ایف اے ٹی ایف) کی گرے لسٹ سے نکلوانے میں ناکام ہو گیا اور 2022ء کے وسط تک بھی یہ پابندی برقرار رہی تاہم چین پاکستان کے ساتھ کھڑا رہا اور اس عرصے میں بین الاقوامی برادری پر زور دیتا رہا کہ وہ انسدادِ دہشت گردی کے حوالے سے پاکستان کی کوششوں پر بامقصد اور غیر جانبداری سے غور کرے اور پاکستان کا کچھ سیاسی بوجھ بانٹے۔ پاکستان 21-20 اکتوبر 2022ء کو پیرس میں ہونے والی ایف اے ٹی ایف پلینری میٹنگ میں گرے لسٹ سے نکل آیا تھا۔

بیجنگ میں ایک معمول کی پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے چینی وزارتِ خارجہ کے ترجمان لُو کانگ کا کہنا تھا کہ ''دہشت گردی کے خلاف جنگ میں پاکستان کی حکومت اور عوام نے بڑا کردار ادا کیا ہے اور بڑی قربانیاں دی ہیں اور زمینی آپریشنز میں بڑی کوششوں کے ساتھ ساتھ اس نے مالی شعبے میں بھی دہشت گردی کے خلاف لڑائی لڑی ہے۔''

لُو کانگ کے یہ خیالات ایک ایسے موقع پر سامنے آئے تھے جب ایف اے ٹی ایف کے رکن کچھ ممالک یہ کوشش کر رہے تھے کہ پاکستان کو ان ملکوں کی فہرست میں شامل کیا جائے جو مالی شعبے میں انسدادِ دہشت گردی کے خلاف خاطر خواہ کوشش نہیں کرتے اور اس سلسلے میں پاکستان کا نام گرے لسٹ میں شامل رکھا جانا چاہیے۔ لُو کانگ نے مزید کہا کہ چین، جو پاکستان کا ہر موسم کا دوست اور سٹریٹیجک پارٹنر ہے، انسدادِ دہشت گردی کے خلاف جنگ میں پاکستان کے ساتھ رابطہ اور تعاون بڑھاتا رہے گا۔ انہوں نے کہا کہ ''ہم کئی بار زور دے چکے ہیں کہ پاکستان نے دہشت گردی کے خلاف عالمی جنگ میں بہت اہم قربانیاں دی ہیں اور دنیا بھر کے ممالک کو ایک دوسرے کے خلاف انگلیاں اٹھانے کے بجائے دہشت گردی کے خلاف جنگ میں ایک دوسرے کی مدد کرنی چاہیے اور باہمی عزت واحترام کا مظاہرہ کرنا چاہیے کیونکہ ایک دوسرے پر انگلیاں اٹھانا دہشت گردی کے

خلاف عالمی کوششوں کے لیے ٹھیک نہیں۔'' لُو کانگ نے زور دے کر کہا ''چین اس بات کا مخالف ہے کہ دہشت گردی کو کسی خاص ملک کے ساتھ جوڑ دیا جائے۔ ہم اس بات سے بھی اتفاق نہیں کرتے کہ دہشت گردی کے خلاف جنگ کی ذمہ داری کسی ایک ملک پر ڈال دی جائے۔ انہوں نے کہا، ''سب سے پہلے تو میں یہ کہوں گا کہ دہشت گردی کا عفریت ساری دنیا کا دشمن ہے۔ دہشت گردی کے خلاف جنگ کے لیے دنیا کے تمام ممالک کو مل کر کوششیں کرنی چاہئیں۔''

شی جن پنگ اور جو بائیڈن، آگے کا راستہ:

امریکہ کی چین کو روکنے اور محدود کرنے کی پالیسی جارج بش کے زمانے میں شروع ہوتی تھی اور اب تک جاری ہے؛ چنانچہ یہ حیرانی کی بات نہیں کہ جنوری 2021ء میں جو بائیڈن کی جانب سے اپنے عہدے کا حلف اٹھانے کے بعد جلد ہی یہ واضح ہو گیا تھا کہ چین بائیڈن انتظامیہ کی خارجہ پالیسی میں سب سے زیادہ اہمیت کا حامل رہے گا۔ حلف اٹھانے کے بعد چار ہفتوں کے اندر انہوں نے کینیڈا، برطانیہ، میکسیکو، جرمنی، فرانس، جاپان، جنوبی کوریا اور آسٹریلیا کے رہنماؤں سے بات کی۔

مذکورہ عالمی لیڈروں سے گفتگو میں صدر بائیڈن نے وعدہ کیا تھا کہ ''امریکہ کے تعاون کی عادات میں اصلاحات شروع کی جائیں گی اور جمہوری قوتوں کو مزید مضبوط کیا جائے گا جنہیں گزشتہ چند سالوں سے نظر انداز کیا گیا بلکہ میں کہوں گا کہ انہیں غلط طور پر استعمال کیا جا رہا تھا۔''

بائیڈن نے چین کا ذکر کرتے ہوئے جو لہجہ اختیار کیا وہ ان کے پیشرو سے مختلف نہ تھا جو بائیڈن کا کہنا تھا کہ ''ہم چین کی معاشی خرابیوں کا سامنا کریں گے، اس کے جارحانہ اقدامات کا مقابلہ کریں گے، چین کے انسانی حقوق، انٹلیکچوئل پراپرٹی اور عالمی حکمرانی پر حملے کی مزاحمت کریں گے، لیکن جب امریکہ کے مفاد میں ہوگا تو ہم چین کے ساتھ مل کر کام کرنے کے لیے بھی تیار ہیں۔'' ان خیالات کا اظہار بائیڈن نے امریکی ڈیپارٹمنٹ آف سٹیٹ ہیڈ کوارٹرز میں اپنی پالیسی تقریر میں کیا تھا۔

بائیڈن کو چینی صدر شی جن پنگ سے ٹیلی فون پر بات کرنے میں ایک مہینہ لگ گیا۔ بطور

امریکی صدر چینی ہم منصب شی جن پنگ سے ٹیلی فون پر پہلے مکالمے میں انہیں صدر شی جن پنگ کو چینی نئے سال کی مبارک باد دینا تھی۔ اس کے ساتھ ہی امریکی صدر نے چین کی معاشی پالیسیوں پر تشویش کا اظہار کیا۔ بائیڈن نے چینی صوبے سنکیانگ میں انسانی حقوق کی مبینہ خلاف ورزیوں پر بھی تشویش ظاہر کی۔ یہ باتیں وائٹ ہاؤس کے ٹیلی فون کالز کے اکاؤنٹ سے معلوم ہوئیں جو اسی سال بارہ فروری کو جاری کی گئیں۔

آفیشل اکاؤنٹ کے مطابق صدر شی جن پنگ نے کال کے دوران اس عزم کو دہرایا کہ تعاون ہی واحد راستہ ہے اور یہ کہ دونوں ممالک کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے باہمی تنازعات تعمیری انداز میں حل کریں۔ چینی سرکاری ٹی وی کے مطابق صدر شی جن پنگ نے اس بات کی ضرورت پر زور دیا کہ دونوں ملک مذاکرات کے لیے میکنزم کو بہتر بنائیں تاکہ ایک دوسرے کے ارادوں کو سمجھا جا سکے اور غلط فہمیوں سے بچا جا سکے۔

چینی میڈیا رپورٹس کے مطابق صدر شی جن پنگ نے تائیوان، ہانگ کانگ اور سنکیانگ پر بھی اپنے ملک کے مؤقف کو دہرایا اور امید ظاہر کی کہ امریکہ چین کی خودمختاری اور علاقائی سالمیت پر بات کرتے ہوئے احتیاط سے کام لے گا۔ صدر شی جن پنگ نے کہا کہ امریکہ کو چینی مفادات کا احترام کرنا چاہیے اور ان ایشوز کو محتاط طریقے سے ڈیل کرنا چاہیے۔

چائنہ انسٹی ٹیوٹ آف انٹرنیشنل سٹڈیز کے اسسٹنٹ ریسرچ فیلو ژانگ ٹنگ جُن کہتے ہیں ''دونوں رہنماؤں کی فون پر گفتگو سے اندازہ ہوتا ہے کہ صدر بائیڈن چین سے مزید تعاون مانگ رہے ہیں جو امریکی مفادات کے مطابق ہو۔''

دوسری جانب امریکہ کے نئے وزیر خارجہ انٹونی بلنکن کا کہنا ہے کہ چین امریکہ کے قومی مفادات کے لیے سب سے اہم خطرہ ہے۔ پھر ایک انٹرویو میں بلنکن حریفانہ پہلوؤں کے ساتھ پیچیدہ تعلقات کی بات کرتے ہیں جن میں کچھ پہلو مسابقانہ اور کچھ تعاون پر مبنی ہیں لیکن انہوں نے زور دیا کہ امریکہ کو چین کی طرف کمزوری نہیں بلکہ مضبوطی کے مؤقف کے ساتھ اپروچ کرنا چاہیے۔

اگرچہ چین امریکہ تعلقات کو حریفانہ چوکھٹے میں لانا امریکہ کی اندرونی تقسیم کے لیے پرکشش ہوسکتا ہے تاہم یہ امریکہ کے اثر ورسوخ کو بالخصوص ایشیا بحرالکاہل خطے تک محدود کر دے گا،

جہاں کے ممالک چین امریکہ تعلقات کو زیرو سم ٹرم (ایسی صورت حال جس میں فریقین میں ایک کا جو فائدہ ہو دوسرے کا وہ نقصان ہو) میں نہیں دیکھتے۔ ان کے خیال میں چین کی جیت کا مطلب امریکہ کی ہار نہیں۔ اُس خطے کے ممالک چاہتے ہیں کہ امریکہ ایشیا میں مصروف رہے اور وہ امریکہ کے اندرونی بگاڑ کے بیرونی اثرات سے خوفزدہ ہیں تاہم وہ امریکہ کی طرح چین کو برا بھلا کہنے کی خواہش نہیں رکھتے کیونکہ انہیں چین کے ساتھ رہنے کے طریقے تلاش کرنے ہیں، جو ایک ایسا ملک ہے جس کے ساتھ وہ جغرافیائی، تاریخی اور معاشی طور پر جڑے ہوئے ہیں۔ ملکوں کو مجبور کرنا کہ وہ چین امریکہ مسابقت میں کسی ایک کا ساتھ دیں نہ صرف عام ممالک بلکہ شمال مشرقی ایشیا اور جنوب مشرقی ایشیا کے اہم کھلاڑی ممالک کی ضرورتوں اور مفادات کو بھی نظر انداز کرنے کے مترادف ہے۔ یہ باتیں آسٹریلین نیشنل یونیورسٹی کے جریدے ایسٹ ایشیا فورم میں مصنف اور تجزیہ کار ڈین سلیٹر کے حوالے سے لکھی گئیں۔

صدر بائیڈن کے بارے میں اس بات کا امکان کم ہے کہ وہ اس قابل ہوں گے کہ اپنے ملک میں وہ سیاسی حمایت حاصل کر سکیں جس سے وہ کثیر جہتی معاہدوں جیسے ٹرانس پیسفک پارٹنر شپ میں شمولیت اختیار کر سکیں اور ان کے پاس ان ڈیپ پاکٹس (وسیع اقتصادی وسائل کا حامل ہونا) کی کمی ہوگی جن سے وہ کولیشن کر سکیں اور چین کے خلاف اس کے ایشیا اور افریقہ میں عظیم الشان بیلٹ اینڈ روڈ انیشی ایٹو (بی آر آئی) کے لیے ایک پائیدار چیلنج بن سکیں۔ یہ بات جریدے ایسٹ ایشیا فورم میں انسٹی ٹیوٹ آف چائنا امریکہ سٹڈیز واشنگٹن ڈی سی کے ریزیڈنٹ سینئر فیلو سوربھ گپتا کے حوالے سے لکھی گئی۔

طاقت کی اس پوزیشن یا موقف کا مطلب اصل میں کیا ہے؟ یہ قیاس آرائی کا موضوع ہے تاہم چین نے ٹرمپ حکومت کی 'مصروف کرو اور مذاکرات کرو' کی پالیسی کے ساتھ چلنے سے انکار کر دیا۔ وہ امریکہ کی ان پالیسیوں سے بھی آگاہی رکھتا ہے جو امریکہ کی سکیورٹی اسٹیبلشمنٹ اوبامہ کے دور سے چلا رہی تھی اور جن کو مائیک پومپیو نے بھی اپنے لیے مثال بنا رکھا تھا، جنہوں نے ان پالیسیوں کا اس وقت بھی ڈھول پیٹا جب وہ سی آئی اے میں کام بھی نہیں کر رہے تھے۔

مائیک پومپیو نے سالانہ ٹو پلس ٹو ڈائیلاگ کے بعد حیدر آباد ہاؤس میں میڈیا سے گفتگو

کرتے ہوئے کہا تھا ''ہمارے لیڈر اور ہمارے شہری واضح طور پر دیکھ رہے ہیں کہ سی پی سی (کمیونسٹ پارٹی آف چائنا) جمہوریت کی، قانون کی حکمرانی کی اور شفافیت کی دوست نہیں اور نہ ہی نیوی گیشن کی آزادی کی دوست ہے جو کہ ایک آزاد، کھلے اور خوش حال انڈو پیسفک (انڈیا بحرالکاہل) کی بنیاد ہے۔ مجھے یہ کہتے ہوئے خوشی ہو رہی ہے کہ امریکہ اور بھارت ہر قسم کے خطرات کے خلاف تعاون بڑھانے کے لیے اقدامات کر رہے ہیں۔ صرف ان خطرات کے خلاف ہی نہیں جو چینی کمیونسٹ پارٹی کی طرف سے لاحق ہیں۔''

اس کا چینی وزارتِ خارجہ کے ترجمان وانگ وین بن کی جانب سے فوری ردِعمل آیا اور انہوں نے پومپیو کے چین کے بارے میں خیالات کو بے بنیاد قرار دیا۔ مسٹر وانگ نے کہا ''یہ بے بنیاد الزامات ہیں جن سے اس بات کی عکاسی ہوتی ہے کہ وہ (پومپیو) تاحال سرد جنگ کی ذہنیت اور نظریاتی تعصب سے چمٹے ہوئے ہیں۔ ہم ان پر زور دیتے ہیں کہ وہ سرد جنگ اور زیرو سم گیم کی ذہنیت کو ترک کر دیں، چین اور خطے کے ممالک کے درمیان فساد کے بیج بونا بند کر دیں اور خطے کے امن اور استحکام کو نقصان پہنچانا بھی بند کر دیں۔''

چینی حکام نے ایسے بیانات میں چھپا مخصوص پیٹرن پہچان لیا اور ان حکام کا شک وشبہ اس وقت مزید مضبوط ہو گیا جب چند روز بعد یعنی پانچ نومبر کو پومپیو نے مشرقی ترکستان اسلامک موومنٹ (ای ٹی آئی ایم) کو دہشت گرد تنظیموں کی فہرست سے خارج کر دیا۔ چین نے بھی ای ٹی آئی ایم کو فہرست سے نکالنے کا معمول سے زیادہ سخت ردِعمل ظاہر کیا۔

ترجمان وانگ وین بن نے معمول کی پریس کانفرنس میں زور دیتے ہوئے کہا ''دہشت گردی، دہشت گردی ہے۔ امریکہ کو فوری طور پر اپنی غلطی کا ازالہ کرنا چاہیے اور دہشت گرد تنظیموں پر سفیدی پھیرنے (وائٹ واش) سے باز رہنا چاہیے اور انسدادِ دہشت گردی کے خلاف عالمی تعاون سے پیچھے ہٹنے سے بھی گریز کرنا چاہیے۔''

بائیڈن انتظامیہ کی جانب سے ابتدا میں ہی اپنا یہ روپ دکھائے جانے کے بعد چینی حکام دہشت گردی کو جیو پولیٹکس کے لیے ایک ہتھیار کے طور پر استعمال کرنے کے اندیشے پر سے نظریں نہیں ہٹائیں گے۔ چین کو 2010ء اور 2015ء کے درمیانی عرصے میں ای ٹی آئی ایم کے ہاتھوں

شدید نقصان اٹھانا پڑا، جس کے بارے میں چینی لیڈرز اب بھی یقین رکھتے ہیں کہ یہ پر اکسی دہشت گردی کا ہتھیار ہے۔

زیادہ تر چینی حکام اور تھنک ٹینک جیو پولیٹکس سے وابستہ خطرات کے بارے میں بہت زیادہ سوچتے ہیں، بالخصوص ان ممالک کی جانب سے جو کھلے عام چین کو اپنی قومی سلامتی کے لیے خطرہ سمجھتے ہیں۔ حکام سوال اٹھاتے ہیں کہ پھر کیوں چین کو اس پالیسی کے حصے کے طور پر دہشت گردی کی پراکسی آؤٹ فٹس میں عامل نہیں بننا چاہئے؟ ان کے نزدیک مشرقی ترکستان اسلامی موومنٹ (ای ٹی آئی ایم) چین کے بارے میں مغربی پالیسی میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتی ہے۔

باب دہم

سنکیانگ، ہانگ کانگ کا دہشت گردی اور سیاسی آلے کے طور پر استعمال

دوسری جنگ عظیم کے بعد زیادہ تر مغربی طاقتوں نے انسانی حقوق کو تاریخی طور پر ایک سیاسی ہتھیار کے طور پر استعمال کیا اور اکثر ان ملکوں پر سیاسی اور تجارتی پابندیاں لگائیں جن کے ساتھ انہیں کوئی مسئلہ تھا۔ ہانگ کانگ یا سنکیانگ (مغربی چین میں مسلم آبادی والا سب سے بڑا صوبہ، جس کی آبادی ایک کروڑ تیس لاکھ ہے) میں انسانی حقوق کے بارے میں امریکہ اور مغرب کے خیالات وہی تھے جو امریکہ اور اس کے زیر قیادت مغرب کے ہونے چاہئیں تھے۔ چین کے تحت آنے والے علاقوں میں انسانی حقوق کی مبینہ خلاف ورزیوں کا شور پہلے سے زیادہ ہو چکا ہے، بالخصوص انیس سو ستانوے میں برطانیہ کی جانب سے ہانگ کانگ کی چین کو واپسی کے بعد سے یہ شور شرابا تواتر کے ساتھ بڑھ رہا ہے۔ جزیرے میں دو ہزار انیس اور دو ہزار بیس میں ہونے والے جمہوریت نواز ہنگاموں اور امریکہ و برطانیہ کے میڈیا کی جانب سے مبینہ کنسنٹریشن کیمپوں (Concentration Camps) کے بارے شدید پروپیگنڈے کے بعد دشمنی اور نفرت بہت بڑھ گئی تھی، تاہم چین نے اس پروپیگنڈے کو بہادری کے ساتھ نظر انداز کر دیا تھا۔

وہ کلر انقلابات (color revolutions) جو جارجیا، یوکرین اور کرغیزستان میں دو ہزار تین اور دو ہزار پانچ میں آئے تھے، انہیں روسی حکام نے مغرب سے متاثرہ قرار دیا تھا اور دعویٰ کیا تھا کہ مغرب کی مالی امداد سے چلنے والی این جی اوز سیاسی و سماجی کارکنوں اور نوجوانوں کی تحریکوں کو

روپیہ پیسہ دیتی ہیں جو جان بوجھ کر حکومتیں گرانے کی کوشش کرتی ہیں۔

رنگین انقلابات نے روس کے دائرہ اثر پر مغرب کے تجاوز کرنے کے احساس میں اضافہ کیا اور پوسٹ کمیونسٹ ڈومین (post-Communist domain) میں مغرب کی مداخلت بڑھا دی جبکہ سوویت یونین کے ٹوٹنے کے نتیجے میں آزاد ہونے والی ریاستوں میں نیٹو اور یورپی یونین کی توسیع کی راہیں کھل گئیں۔ یہی رنگین انقلابات سوویت یونین کے ٹوٹنے کے بعد والے وسطی ایشیا میں 'حقوق کی تحریکوں' میں امریکہ کے ملوث ہونے کا باعث بنے۔ چینی حکام کو بھی امریکہ کی قیادت میں مغرب کے خلاف اسی طرح کی شکایات ہیں، جو چین کے ساتھ تجارت سے فائدہ اٹھاتا ہے لیکن جب انسانی حقوق جیسے معاملات کی طرف آتا ہے تو اسے ایک دشمن کے طور پر پیش کرتا ہے۔ چینی حکام کے مطابق دنیا کے مختلف ممالک میں نام نہاد کلر انقلابات کی مدد کر کے مغرب ترقی پذیر ملکوں میں سماجی بے چینی کو ہوا دیتا ہے جس کے نتیجے میں سماجی و معاشی عدم استحکام پیدا ہوتا ہے اور یوں وہ ترقی نہیں کر پاتے۔

(کچھ کلر انقلابات (color revolutions) کے بارے میں: (وکی پیڈیا سے): دنیا بھر میں میڈیا 21 ویں صدی کے اوائل میں سابق سوویت یونین کے کئی ممالک میں' عوامی جمہوریہ چین میں اور بلقانز (جنوب مشرقی یورپ کے علاقوں) میں کمیونزم سے متعلق تشکیل پانے والی مختلف تحریکوں کو بیان کرنے کے لیے 'رنگین انقلاب' کی اصطلاح استعمال کرتا ہے۔ اس اصطلاح کا اطلاق دیگر جگہوں پر برپا ہونے والے کئی انقلابات پر بھی کیا گیا ہے، بشمول مشرق وسطیٰ اور ایشیا پیسفک خطے میں 1980ء سے 2010ء تک رونما ہونے والے انقلابات کے۔ کچھ مبصرین' جیسے جسٹن ریموںڈ واور مائیکل لنڈ' نے ان واقعات کو ایک انقلابی لہر قرار دیا، جس کے ماخذ کا پتا فلپائن میں 1986ء میں رونما ہونے والے عوامی طاقت کے انقلاب سے لگایا جا سکتا ہے (جسے ''زرد انقلاب'' بھی کہا جاتا ہے) رنگین انقلابات میں حصہ لینے والوں نے زیادہ تر عدم تشدد والی مزاحمت کا استعمال کیا۔ ایسے مظاہروں، ہڑتالوں اور مداخلتوں کا مقصد حکومتوں کے خلاف احتجاج کرنا ہوتا ہے۔ رنگین انقلاب کی تحریکیں عام طور پر ان کی علامت کے طور پر کسی مخصوص رنگ یا پھول کے ساتھ وابستہ ہو گئیں۔ رنگین انقلابات غیر سرکاری تنظیموں (این جی اوز) کے اہم کردار کے لیے اور خاص طور پر

تخلیقی عدم تشدد مزاحمت کو منظّم کرنے میں انقلابی طلبا کارکنوں کے کردار کی وجہ سے قابل ذکر ہیں۔)

منافقت' تاریخی تناظر میں:

دو واقعات اس تناظر میں سبق آموز ہیں: انیس سو اسی کے اوائل میں امریکہ کی افغانستان میں مداخلت' جس کے لیے اسے ہر قسم کے مذہبی انتہا پسندوں کی حمایت حاصل تھی' تا کہ وہاں یعنی افغانستان میں سوویت یونین کے خلاف مشترکہ جنگ کی جا سکے۔ دوسرا واقعہ امریکہ کی سنٹرل انٹیلی جنس ایجنسی سی آئی اے سے متعلق ہے جس نے چین میں علیحدگی پسند تحریکوں کو ہوا دی تا کہ چین کی سرزمین کے استحکام کو نقصان پہنچایا جا سکے۔ لیکن اس کی تفصیل میں جانے سے پہلے ایک اور تاریخی سبق ہے جس سے امریکہ کی منافقت کا پردہ چاک ہوتا ہے' جس میں وہ انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کے حوالے سے بات کرتا ہے اور اس بار معاملہ پاکستان کا ہوتا ہے۔ 'دی اٹلانٹک' کو دیئے گئے ایک انٹرویو میں امریکہ کے ہنری کسنجر اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں کہ پاکستان نے انیس سو اکہتر میں بنگلہ دیش میں انسانی حقوق کی بڑے پیمانے پر خلاف ورزیاں کیں لیکن امریکہ نے واضح طور پر ان کو نظر انداز کیا کیونکہ اس زمانے میں پاکستان امریکہ اور چین کو قریب لانے کے لیے ایک قابل قبول مذاکرات کار تھا اور کسی تنازع میں انسانی زندگیوں سے زیادہ وہ (امریکہ چین) تعلقات اولین ترجیح تھے۔ انہوں نے اس کا جواز ان الفاظ میں پیش کیا:

''انسانی حقوق امریکی پالیسی کا ایک اہم ہدف ہیں لیکن قومی سلامتی بھی اتنی ہی اہم ہے۔ بعض حالات میں ان کے درمیان چوائس کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اخلاقی ایشوز بنانا آسان ہوتا ہے لیکن بعض اوقات حالات ایسے ہوتے ہیں جن میں کوئی تنازع کھڑا ہو جاتا ہے' بالخصوص اس وقت جب کوئی ایسا ملک' جو امریکی سلامتی یا بین الاقوامی آرڈر (نظم) کے لیے اہم ہوتا ہے' کوئی ایسا کام کرتا ہے جو ہماری اقدار سے متصادم ہوتا ہے اور صدر کے لیے متعدد فیصلے کرنے کی ضرورت کو اجاگر کرتا ہے، جیسے تنازع کی شدت، اس تنازع کے حل کے لیے دستیاب وسائل، اس کے متوقع ارتقا پر ہمارے ایکشن کے اثرات، اور آخری بات یہ کہ صدر اگر آگے بڑھنے کا کوئی راستہ تلاش کر لیتا ہے تو ان کوششوں کو برقرار رکھنے کے لیے امریکی عوام کی آمادگی ضروری ہوتی ہے۔ انسانی حقوق پر زور دینا

ہمیں عراق میں ناکام قومی تعمیر تک لے جاتا ہے' ان کو نظر انداز کرنے سے روانڈا میں نسل کُشی ہوتی ہے۔ ہم عصر پالیسی ساز پوری دنیا میں اس چیلنج کا سامنا کرتے ہیں' خاص طور پر پورے مشرق وسطیٰ میں۔ مدبر سیاست دان عام طور پر اپنے اہداف کو مرحلہ وار حاصل کرتے ہیں اور اس کی مزید تشریح کی جائے تو یہ نامکمل حالت میں ملتے ہیں۔ پالیسی کا آرٹ یا فن نامکمل مراحل سے مکمل اور بھرپور اہداف کی طرف بڑھنا ہے۔''

چین کو خطرہ سمجھنا، ایک تاریخی سبق:

آیئے پہلے پیچھے کی طرف ایک نگاہ دوڑاتے ہیں کہ مغرب نے کب علیحدگی پسندی کے نظریات کے ساتھ کھیلنا شروع کیا اور کب اسے چین کے خلاف سیاسی ہتھیار کے طور پر استعمال کیا۔ اواخر انیس سو اکانوے میں لیزلی ایچ گیلبوف نے نیویارک ٹائمز میں ایک مضمون لکھا تھا جس میں انہوں نے سی آئی اے کے چین کے بارے میں طویل مدتی منصوبوں کے حوالے سے سازشی نقطہ نظر کو پیش کی تھا۔ وہ لکھتے ہیں:

''سابق امریکی وزیر خارجہ جیمز بیکر نے ایک غیر اہم اور واقعات سے عاری آرٹیکل لکھا جس میں چین کے بارے میں ایک حقارت آمیز جملہ ہے۔ کچھ لوگ اسے محض ایک مشاہدہ کہیں گے' لیکن بش حکومت کے اہم حکام کے مطابق یہ ایک ایسا مشاہدہ ہے جو آگے چل کر پابندی میں بدل سکتا ہے' اگر بیجنگ کے لیڈر انسانی حقوق اور اسلحے کی فروخت کے بارے میں دنیاوی رویے کے نئے معیارات کو نظر انداز کرنا جاری رکھیں گے تو اس سے مڈل کنگڈم کی علاقائی سالمیت واستحکام کو خطرہ لاحق ہو جائے گا۔ مسٹر بیکر چین میں اس ہفتے کے آخر میں اس کارڈ کو نہیں کھیلیں گے بلکہ اس کا اشارہ بھی نہیں دیں گے۔ یہ بہت زیادہ دھماکہ خیز بھی ہوگا' لیکن چین کے حکمران جانتے ہیں کہ یہ کارڈ اب سامنے موجود ہے اور امریکی شکایات کے حوالے سے اگلی موو (چالوں) کا انتظار کر رہا ہے۔''

ظاہر ہے کہ جیمز بیکر نے عوامی سطح پر اس امکان کا ذکر کبھی نہیں کیا لیکن سی آئی اے کے ریڈار پر یہ ایشو کافی حد تک موجود تھا۔ یہ وہ وقت تھا جب چین میں چیئرمین ڈینگ ژیاؤ پنگ کا دور ابھی شروع ہی ہوا تھا۔ اس کے بعد رونما ہونے والے واقعات سے اس بات کے خاصے ثبوت ملے

کہ امریکی اسٹیبلشمنٹ نے غیر ایماندارانہ تجارت اور انسانی حقوق کو کس طرح استعمال کیا تا کہ چین کو دباؤ میں لایا جا سکے کہ وہ حقوق اور خود مختاری کے مغربی آئیڈیلز کو قبول کرے جسے چین اور روس پہلے ہی متعصّبانہ قرار دے چکے ہیں۔

مسٹر بیکر کا بے حد احتیاط سے تحریر کیا گیا جملہ بتاتا ہے ''ایک بڑے فری مارکیٹ سیکٹر کے فروغ پانے سے چین کے ساحلی صوبوں کا ہانگ کانگ، تائیوان اور عالمی معیشت سے بڑے اچھے طریقے سے انضمام ہوا ہے..... اگر سطحی طور پر دیکھا جائے تو یہ ایک دلچسپ حقیقت کے بارے میں محض ایک بیان ہے۔ جن چینی صوبوں نے آزاد تجارت کو گلے لگایا ہے وہ بیرونی تجارتی دنیا کا حصہ بن چکے ہیں' تاہم اگر گہرائی سے دیکھا جائے تو یہ ایک ایسا بیان ہے جس سے چین کی بوڑھوں (بزرگوں) کی حکومت کی ریڑھ کی ہڈی میں سنسنی کی لہر دوڑ جاتی ہے۔ لگتا یوں ہے کہ بجائے چین ہانگ کانگ اور تائیوان کو اپنے اندر جذب کرے جیسا کہ مختلف معاہدوں میں لکھا گیا ہے' لیکن ہو اس کے الٹ سکتا ہے یعنی تائیوان اور ہانگ کانگ چین کے جنوبی حصے کو ہی اپنے اندر جذب کر لیں''۔

یقینی طور پر اس کو رجحانات کی صاف وارننگ کے طور پر لیا جا سکتا ہے۔ یہ وارننگ بیجنگ کو کہتی ہے کہ چین کو مزید پُرکشش بناؤ۔ دوسری صورت میں جنوبی صوبے اور ہانگ کانگ (جس کے اقتدار اعلیٰ کو انیس سو ستانوے میں چین کو سونپا جا چکا ہے) بیرونی دنیا سے اس قدر قریب ہو سکتے ہیں کہ وہ چین کا حصہ ہونے سے ہی انکار کر دیں۔

لیزلی گیلبنوف کہتے ہیں کہ جارج بش اور وزیر خارجہ جیمز بیکر چین کو یہ کہتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں کہ وہ ایک امریکی سیاسی حقیقت کا سامنا کرے: چین کے لیے آگے خراب وقت ہے اگر وہ اپنے تجارتی طریقوں کو برقرار رکھتا ہے' خطرناک میزائل اور ایٹمی ٹیکنالوجی کو بیچنے کی روش پر قائم رہتا ہے اور انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کو جاری رکھتا ہے۔ یہ چینی کارروائیاں اب کافی آگے جا چکی ہیں۔ امریکی اور دیگر غیر معمولی اقدامات کر سکتے ہیں؛ جیسے کہ وہ ان اقدامات کو روکنے کے لیے علیحدگی پسندی کو ہوا دیں۔ چین کے لیڈران اگر اس کے برعکس سوچتے ہیں تو وہ بڑی غلطی کر رہے ہیں۔

ظاہر ہے کہ اس قسم کی زبان کے استعمال سے امریکہ کی سکیورٹی اسٹیبلشمنٹ کی سوچ اور ذہنیت کا پتا چلتا ہے یعنی انسانی حقوق، تجارت اور دفاعی سامان کی فروخت کے نام پر سیاسی بلیک

میلنگ کی جاتی ہے اور یہ تمام بے رحمانہ قومی مفادات کے نام پر کیا جاتا ہے۔

افغانستان میں بنیاد پرستی کی ہتھیار بندی:

اس سارے تناظر میں بات کی جائے تو پتا چلتا ہے کہ امریکہ اور سی آئی اے نے کیسے افغانستان میں بنیاد پرستی کو پیسہ فراہم کیا۔ یہ سب کچھ طویل عرصے سے تاریخ میں گم ہو چکا ہے' لیکن دسمبر دو ہزار چودہ میں واشنگٹن پوسٹ اخبار میں شائع ہونے والے ایک آرٹیکل کو سامنے لانا مشکل نہیں جو بنیاد پرستی کے منبعوں کا سراغ لگاتا ہے اور وضاحت کرتا ہے کہ کیسے امریکہ اور اس کی ایجنسیوں نے بڑے منظّم طریقے سے نصابی کتب اور دیگر کتابوں کے ذریعے خطے میں بنیاد پرستی کا بیج بویا۔

''افغانستان اور بھارت سے لے کر فرانس اور امریکہ تک کے جنگ و جدل کے حامی بنیاد پرستی کا سارا الزام پاکستان پر دھرتے رہے اور اصل گناہ کو نظر انداز کر دیا جو سی آئی اے نے افغانستان میں روسیوں کو شکست دینے کے لیے خطے میں بنیاد پرست قوتوں کی تخلیق اور ان کی ترقی کی صورت میں کیا' جو اس چیز کی واضح مثال ہے کہ جو خطے اور قومیں ہدف ہیں ان کے خلاف نتائج سے بے پرواہو کر ہر وہ کام کر گزرو جو آپ کے لیے مناسب ہے۔''

امریکہ نے انیس سو اسی کی دہائی میں افغان سکولوں میں سوویت یونین مخالف نصابی کتابوں کو پھیلانے کے لیے کروڑوں ڈالر خرچ کیے۔ وہ کتابیں جہادی طور طریقوں کی حوصلہ افزائی کرتی تھیں۔ جب امریکہ نے دو ہزار ایک میں طالبان حکومت کے خلاف لڑائی لڑی اور انہیں اقتدار سے محروم کر دیا تو دراصل اس خطے میں اپنی ہی رقم کردہ پُرانی تاریخ کو دہرایا تھا۔

آرٹیکل میں مزید بتایا گیا کہ وہ کتابیں جہاد کے بارے میں باتوں اور بندوقوں، گولیوں، فوجیوں اور بارودی سرنگوں کی تصاویر اور ڈرائینگز سے بھری ہوئی تھیں۔ یہ کتابیں سالوں تک افغان سکولوں کے نصاب کا حصہ رہیں حتیٰ کہ طالبان نے بھی ان کتابوں کو استعمال کیا۔

کتابیں جیسے ''جہادی تعلیم کی الف ب'' مقامی زبانوں میں شائع کی گئیں۔ ان کتابوں کو اوماہا میں یونیورسٹی آف نبراسکا کے زیر اہتمام امریکی ایجنسی فار انٹرنیشنل ڈویلپمنٹ نے شائع کیا اور امریکہ کی سی آئی اے اور پاکستان کی ملٹری انٹیلی جنس ایجنسی آئی ایس آئی نے افغان سکولوں میں

پہنچایا۔ یہ پرانی سوویت یونین مخالف کتابیں اب بھی افغانستان میں پڑھائی جا رہی ہیں اور بنیاد پرستی کو فروغ دے رہی ہیں۔

طالبان امریکہ کی سپانسر شدہ ان جہادی کتابوں کو دوبارہ شائع کر رہے ہیں تاکہ خطے کے بچوں کو اپنے زیرِ اثر لا سکیں حالانکہ دو ہزار دو میں یونیسف نے ایسی پانچ لاکھ کتابوں کو تلف کر دیا تھا۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ کس طرح بنیاد پرست اور مذہبی بنیادوں والے عناصر کو افغانوں کے ذہنوں میں داخل کیا گیا اور ان مخصوص پاکستانی مذہبی گروپوں میں بھی جو افغانستان کے ساتھ نظریاتی قربت رکھتے تھے۔ اس سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ امریکہ جن ممالک میں فوجی یا سیاسی طور پر مداخلت کرتا ہے وہاں وہ اس مداخلت کے طویل مدتی اثرات اور نتائج کی پروا نہیں کرتا۔

تاریخ لامحالہ خود کو دہراتی ہے!

اسی طرز پر چلتے ہوئے امریکہ نے تائیوان کے حوالے سے چین کی حساسیت کا ذرہ بھر بھی احترام نہیں کیا یہاں تک کہ جب بیس جنوری دو ہزار اکیس کو صدر بائیڈن کی افتتاحی تقریب ہوئی تو اس میں تائیوان کے امریکہ میں ڈی فیکٹو سفیر بی کھم سیاؤ کو بھی مدعو کیا گیا تھا۔ 1979ء کے بعد پہلی بار کسی تائیوانی سفیر کو امریکی صدر کی تقریبِ حلف برداری میں مدعو کیا گیا تھا۔ انیس سو اناسی وہ سال ہے جب امریکہ نے اپنی سفارت کاری کو تائی پے سے بیجنگ میں شفٹ کر لیا تھا۔

واشنگٹن نے دو ہزار سولہ میں بھی بیجنگ کو صدمے سے دوچار کیا تھا جب تائیوانی صدر ٹی سائی انگ وین کی جانب سے امریکی صدر منتخب ہونے والے ڈونلڈ ٹرمپ کو کئی گئی مبارکبادی ٹیلیفون کال کو سنا کیا گیا تھا۔

آزاد دانشوروں اور تجزیہ کاروں کے لیے یہ صرف ایک طرزِ عمل کی عکاسی کرتا ہے جو بارک اوبامہ کی ''ایشیا پائیووٹ'' پالیسی کے ساتھ سامنے آنا شروع ہوا جس میں بطور سٹریٹیجک پارٹنر کے انڈیا پر انحصار کیا گیا اور خطے میں چین پر انحصار کو کم کیا گیا۔ صدر ٹرمپ کے چار سالوں میں یہی کچھ کیا گیا۔ دو ہزار اٹھارہ میں ٹرمپ انتظامیہ کی جانب سے نیشنل سکیورٹی سٹریٹیجی کی اشاعت کے بعد یہ رجحان مزید واضح ہو گیا۔ ''اب زورِ عظیم طاقت کے تنازع کی جانب شفٹ ہو چکا ہے جس میں

روس اور چین کو نام لے کر نشانہ بنایا گیا' انہیں ''حریف'' قرار دیا گیا' انہیں 'ترمیم پرست طاقتیں' کہا گیا اور اس شفٹ (پالیسی میں تبدیلی) کے ساتھ دفاعی اخراجات میں تیزی لائی گئی''۔ اس پالیسی کے اعلان کے بعد سے چین کو امریکہ کا ایک بڑا مخالف بنا کر پیش کرنے کی کوشش کی گئی اور یہ کوشش مکمل طور پر حکومت کا معاملہ بن گئی۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ یہ سب کچھ ایک ایسے وقت میں کیا گیا جب امریکی صدر کا اہم ترین ہدف یہ تھا کہ چین اور روس' دونوں کے ساتھ ورکنگ اور دوستانہ تعلقات قائم کیے جائیں۔ (ڈبلیو جونز' گلوبل ٹائمز' 2019ء)

چین اب ایک بڑی معاشی، فوجی اور خلائی طاقت ہے۔ امریکہ کے لیے مشکل یہ ہے کہ اسے ایک ایسی صورت حال میں تعاون کی راہیں تلاش کرنی ہیں جب وہ ''محلے کا بڑا بدمعاش'' نہیں رہا۔ اس حوالے سے چین کے ساتھ دہشت گردی کے معاملات پر' معیشت پر' امن قائم رکھنے کی کوششوں میں اور بین الاقوامی اقتصادی اصلاحات کے سلسلے میں ایک بڑے شراکت دار کے طور پر پیش آنا ایسے ہی ہے جیسے اپنے ہی پھیلائے گئے تھیوسیڈائیڈز ٹریپ (Thucydides trap) میں سے نکل جانے کا راستہ فراہم کر دیا جائے۔ (Thucydides (460 قبل مسیح تا 400 قبل مسیح) ایتھنز کا ایک تاریخ دان اور جنرل تھا۔ اسے 'سائنٹفک ہسٹری' کا موجد بھی کہا جاتا ہے۔ اسی کے نام پر تھیوسیڈائیڈز ٹریپ کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے۔ اس اصطلاح کے مطابق جب ایک سر اٹھاتی ہوئی طاقت کسی پہلے سے قائم طاقت کے غلبے کو چیلنج کرتی ہے تو اس کے نتیجے میں جنگ کا خطرہ بڑھ جاتا ہے) ایگزیکٹو انٹیلی جنس ریویو کے واشنگٹن میں بیورو چیف جیمز بیول (James Bevel) کے مطابق اگر ہم چین کو ایک دشمن کے طور پر لیتے ہیں تو اس میں بڑی مشکل ہوگی۔

امریکہ نے افغانستان اور عراق پر حملہ کیا، لیبیا اور شام میں برپا ہونے والی شورش کو ہوا دی اور القاعدہ اور طالبان کے قیدیوں کے لیے گوانتاناموبے جیسی پنجرہ نما جیل قائم کی۔ یہ سب کچھ دسمبر دو ہزار ایک میں افغانستان میں بنیاد پرست طالبان حکومت کے خاتمے کے بعد کیا گیا۔ درحقیقت اٹھارہ مئی دو ہزار اکیس کو گوانتاناموبے میں سب سے پرانے قیدی' جو کہ پاکستانی سیف اللہ پراچہ تھے، کو کسی چارج کے بغیر رہا کر دیا گیا۔ وہ سولہ سال تک امریکی قید میں رہے اور اس دوران ان پر ظلم وستم کے پہاڑ توڑے گئے اور یہ سب کچھ بغیر کسی ثبوت کے کیا گیا۔ گوانتاناموبے

میں اب بھی 37 قیدی موجود ہیں۔ یہ سب کچھ قومی سلامتی کے نام پر کیا گیا۔ ایک کے بعد ایک آنے والی امریکی حکومتوں نے چین سے متعلقہ پالیسیوں اور پابندیوں کو گلے لگائے رکھا اور صرف امریکی قومی ترجیحات کو اہمیت دی۔

کمیونسٹ پارٹی آف چائنا، جو مسلسل اپنے علاقے اور لوگوں کے تحفظ کے لیے کام کر رہی ہے' اس کو ایک اور چیلنج کے طور پر لے رہی ہے۔ نیو یارک ٹائمز میں جیمز بیکر کے خارجہ امور پر مضمون میں ملفوف دھمکی کے بعد سے چین کے خودمختار علاقوں سنکیانگ، تبت اور ہانگ کانگ نے جو تیز رفتار ترقی کی ہے اس سے چینی لیڈروں کے عزم کی عکاسی ہوتی ہے۔

چین کا ''تھری ڈیز'' (Three Ds) ردِعمل:

حقیقت یہ ہے کہ کوئی بھی قابلِ ذکر ڈھکی چھپی یا براہ راست دھمکی' جیسے علیحدگی پسندی، دہشت گردی اور بیرونی طاقت کے ذریعے پھیلائی گئی عوامی بے چینی چین کو جھکا نہیں سکی ہے۔ چینی قیادت پورے عزم کے ساتھ خاموش، پُرامن اور سب کی ترقی کی راہ پر چلتی رہی۔ امریکہ کی ہر سازش اور ریشہ دوانیوں (جمہوری حقوق اور علیحدگی پسندی کو سیاسی آلے کے طور پر استعمال کرنا) کا جواب انہوں نے تھری ڈیز کی شکل میں دیا یعنی: Development, Development, and Development.

ان کا یقین ہے اور انہوں نے اس کا مظاہرہ بھی کیا کہ ان تھری ڈیز میں ہی ان کی ترقی، سماجی و سیاسی استحکام اور قومی اتحاد کا راز چھپا ہوا ہے۔

چین میں انسانی حقوق اور مبینہ طور پر آزادی مانگنے والے ایغور باشندوں کے حوالے سے سب سے مؤثر اور جامع جواب مارچ دو ہزار انیس میں آیا۔ یہ جواب نائب وزیر خارجہ اور چینی وفد کے سربراہ لی یو چینگ نے ایک تقریر میں دیا تھا جو حقائق سے بھری ہوئی تھی۔ موقع تھا' اقوام متحدہ' جنیوا میں ایڈاپشن آف دا یونیورسل پیریوڈک ریویو (UPR) آؤٹ کم رپورٹ آن چائنا۔ یہ تقریر سنکیانگ کے پیشہ ورانہ تعلیمی اور تربیتی مراکز کے خلاف غلط اور بے بنیاد الزامات کا جواب تھی:

''کچھ ممالک سفارش کرتے ہیں کہ چین سزائے موت ختم کر دے۔ چین کے حقائق،

قانونی پریکٹسز اور عوامی رائے کو پیشِ نظر رکھا جائے تو وہاں ابھی اس کے لیے حالات موزوں نہیں ہیں۔ کچھ ملکوں نے یہ سفارش بھی کی کہ چین لوگوں کو بڑے پیمانے پر جیلوں میں بند رکھنے کی پالیسی کو بھی ختم کر دے۔ سیدھے سادے طریقے سے بات کی جائے تو یہ انسانی حقوق کے نام پر چین کے اندرونی معاملات میں مداخلت ہے، جو ایک ایسی چیز ہے جس کی چین سختی سے مخالفت کرتا ہے۔ کچھ ممالک اور این جی اوز سنکیانگ میں پیشہ ورانہ تعلیم اور تربیتی مراکز کے بارے میں بھی غلط اور بے بنیاد الزامات لگاتے ہیں، جو کہ حقائق کے بالکل برعکس ہے۔ یہ مخصوص ممالک تو سنکیانگ کے حوالے سے مختلف پروگرام بھی مرتب کرتے رہے ہیں۔ یہ سب چیزیں چین کی خودمختاری اور اندرونی معاملات میں کھلی مداخلت ہیں، جنہیں کسی صورت قبول نہیں کیا جا سکتا۔''

یو چینگ نے وفود کو اپنے سنکیانگ کے دورے کے موقع متعدد تربیتی مراکز کے وزٹس کے بارے میں بتایا۔ انہوں نے وفود کو سنکیانگ میں بڑے بڑے متشدد دہشت گردانہ حملوں کے بارے میں ایک نمائش اور کچھ مذہبی مقامات کے دورے کے بارے میں بھی بتایا اور ساتھ ہی سنکیانگ کی تازہ ترین صورت حال سے آگاہ کیا اور اسے FACT کے نام سے موسوم کیا۔ FACT کو ذیل میں ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے:

''سب سے پہلے بنیادی مفادات یعنی ''F'' فار فنڈامینٹل انٹرسٹس کو لیتے ہیں۔ شمال مغربی بارڈر کے ساتھ واقع سنکیانگ صوبہ چین کے کل زمینی رقبے کا چھٹا حصہ ہے یعنی تقریباً سترہ فیصد اور یہاں چھپن نسلی گروہوں کے دو کروڑ چالیس لاکھ افراد بستے ہیں۔ سنکیانگ کا استحکام اور اتحاد پورے ملک کی خوشحالی اور استحکام کے لیے نہایت ضروری ہے۔ سنکیانگ سے متعلقہ ایشوز دراصل چین کی خودمختاری، سلامتی، علاقائی سالمیت اور بنیادی مفادات سے متعلقہ ہیں۔ ہم نسلی بنیادوں پر علیحدگی پسندی، متشدد دہشت گردانہ حملوں کی ہر صورت کے خلاف اور بیرونی طاقتوں کی مداخلت کے سخت مخالف ہیں۔

FACT کا دوسرا حرف ''A'' ہے یعنی اے فار اینٹی ٹیررازم۔ 1990ء کی دہائی سے چین کے اندر اور چین کے باہر سے ''تین قوتیں'' دہشت گردی، علیحدگی پسندی اور انتہا پسندی سنکیانگ میں ہزاروں دہشت گردانہ حملوں کا باعث بن چکی ہیں۔ سنکیانگ میں دہشت گردانہ

حملوں کے بڑے اور متشدد واقعات کے حوالے سے تصاویر اور ویڈیوز کی نمائش سے پتا چلتا ہے کہ انسانیت کے خلاف حملے کرنے والے یہ دہشت گرد کس قدر ظالم ہیں۔ مذکورہ تصاویر اور ویڈیوز میں ان کی بے رحمی کو دکھایا گیا ہے۔ اس طرح مذہبی انتہا پسندانہ نظریات بھی ان دہشت گرد حملوں کا سبب بن چکے ہیں۔ سنکیانگ ایغور خود مختار علاقے کی حکومت ایک طرف ان دہشت گردوں کے خلاف قانون کے مطابق کریک ڈاؤن جیسے اقدامات کر چکی ہے اور دوسری جانب دہشت گردی اور انتہا پسندی کی روک تھام کے لیے بھی اقدامات کیے گئے ہیں، جیسے پیشہ ورانہ تعلیم اور تربیتی مراکز کا قیام وغیرہ۔ یہ کوششیں کافی مؤثر ثابت ہوئیں اور ان سے عوام کی حمایت حاصل کرنے میں خاصی مدد ملی ہے۔

تیسرا لفظ ''C'' ہے یعنی سی فار کیمپس (campus)، کیمپ نہیں جیسا کہ کچھ شرارتی لوگ کہتے ہیں۔ میں نے سنکیانگ میں کچھ بورڈنگ سکولوں یا کیمپسز کا دورہ کیا۔ پیشہ ورانہ تعلیم اور تربیتی پروگرام فطری طور پر دہشت گردی کی روک تھام کرتے ہیں۔ یہ بیماریوں کی روک تھام بھی کرتے ہیں اور ابتدائی مرحلوں میں ہی اس کا علاج کرنا بھی مفید ہے جیسا کہ روایتی چینی ادویات میں کیا جاتا ہے۔ ان کا مقصد ایسے افراد کو تعلیم دینا اور بحال کرنا ہے جو انتہا پسندانہ نظریات سے متاثر ہیں تاکہ وہ دہشت گردی اور انتہا پسندی کا نشانہ نہ بنیں یا انہیں دہشت گردی کے لیے استعمال نہ کیا جا سکے۔ یکساں قومی زبان پر کورسز، قانون کا علم اور پیشہ ورانہ ہنر سے ٹریننگ حاصل کرنے والے افراد بنیاد پرستی سے نکل سکتے ہیں۔ تربیت حاصل کرنے والے ٹریننگ کے معاہدوں پر دستخط کرتے ہیں، جس کے تحت وہ مراکز سے تعلیم اور معاونت حاصل کرتے ہیں۔ ٹریننگ سنٹر مفت رہائش دیتے ہیں اور ٹریننگ حاصل کرنے والوں کے قانون کے مطابق تمام حقوق کا دفاع اور حفاظت کرتے ہیں۔ ٹریننگ پانے والے باقاعدگی کے ساتھ اپنے گھروں کو جا سکتے ہیں، چھٹی لے سکتے ہیں اور اپنے گھر والوں سے ٹیلی فون یا ویڈیو کالز کے ذریعے رابطہ کر سکتے ہیں۔ ان کے خاندان والے بھی ان کی خیریت دریافت کرنے کے لیے تربیتی مراکز کا دورہ کر سکتے ہیں۔ ہمیں پتا چلا ہے کہ جنوبی سنکیانگ کے شہر کاشغر میں بہت سے ٹرینی پہلے ہی گریجویٹ ہیں۔ انہوں نے جدید فیکٹریوں میں کام تلاش کر لیا ہے۔ وہ قریبی آبادیوں میں رہتے ہیں اور انتہا پسندانہ نظریات اور غربت، دونوں سے نجات حاصل

کر چکے ہیں۔ ہمیں تربیت یافتہ افراد کے چہروں پر اطمینان کی مسکراہٹ اور حکومت اور معاشرے کے لیے تعریفی کلمات سن کر بڑی خوشی ہوئی۔

''میں اس چیز کی نشاندہی کروں گا کہ پیشہ ورانہ تعلیم اور تربیتی پروگرام وہ خصوصی اقدامات ہیں جو سنکیانگ کی حکومت نے ایک خصوصی وقت میں کیے۔ ہم ٹریننگ سنٹر کے پروگرام کو بہتر کرتے رہیں گے۔ انسداد دہشت گردی کی صورت حال جب بہتر ہو جائے گی تو ہم یہ تربیتی پروگرام بھی بتدریج کم کر دیں گے حتیٰ کہ یہ مکمل ہو جائیں گے۔''

چوتھا لیٹر ''T'' ہے یعنی ٹی فار ٹُرتھ۔ سنکیانگ شہریوں کے مذہبی عقائد کی آزادی کے لیے متعدد اقدامات کر چکا ہے اور ان کے ثقافتی حقوق کے تحفظ کے ساتھ تمام نسلی گروہوں کے اپنی زبانوں کے حوالے سے تمام حقوق کا تحفظ بھی یقینی بنا چکا ہے۔ سنکیانگ میں چوبیس ہزار مساجد ہیں یعنی ہر چار سو مقامی مسلمانوں کے لیے ایک مسجد ہے جو کہ کئی مسلم ممالک سے بھی زیادہ ہے۔ مختلف ملکوں کے سفارت کاروں اور صحافیوں نے سنکیانگ صوبے اور پیشہ ورانہ تعلیمی اور تربیتی مراکز کے دوروں کے بعد کہا کہ ہم نے جو کچھ بھی دیکھا اور سنا ہے، وہ اس سے بالکل مختلف ہے جو ہمیں ان لوگوں کی جانب سے بتایا گیا جن کے اپنے ایجنڈے ہیں۔

''استحکام سے سنکیانگ کو ہی فائدے حاصل ہو رہے ہیں۔ مسلسل 27 مہینوں سے دہشت گردی کا کوئی واقعہ نہیں ہوا۔ گزشتہ سال ڈیڑھ سو ملین سیاحوں نے سنکیانگ کا دورہ کیا جبکہ اس سال توقع ہے کہ دو سو ملین سیاح سنکیانگ آئیں گے۔ کیا یہ انصاف ہے کہ جس جگہ سال میں دو سو ملین سیاح سیر کے لیے آتے ہوں، اس جگہ کو کہا جائے کہ غیر محفوظ ہے اور آزاد نہیں ہے۔''

''جو بھی چین کی خود مختاری اور قوانین کا احترام کرتا ہے، اسے خوش آمدید کہتے ہیں کہ وہ آئے اور سنکیانگ کے بارے میں جانے۔ سنکیانگ میں پیشہ ورانہ تعلیم اور تربیتی مراکز کی انتظامیہ کی اکثر ممالک کی جانب سے تعریف کی گئی ہے۔ دو مارچ کو آرگنائزیشن آف اسلامک کوآپریشن (OIC) کی کونسل آف فارن منسٹر نے ایک رپورٹ جاری کی جس میں او آئی سی کے چین کے دورے کا خیر مقدم کیا گیا اور مسلمانوں کا خیال رکھنے پر چین کی تعریف کی گئی۔ ان باتوں سے پتا چلتا ہے کہ متعلقہ اقدامات نے مسلم دنیا سے بھی ادراک اور حمایت حاصل کی ہے۔''

یو چینگ نے اپنی تقریر کو ان الفاظ میں ختم کیا کہ جب انسانی حقوق کی بات آتی ہے تو کوئی مثالی ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتا' لیکن انہوں نے اقوام متحدہ کے وفود کو یقین دلایا کہ ان کا ملک چین میں انسانی حقوق کو بہتر بنانے کے لیے ہر حوالے سے کام کرتا رہے گا تا کہ بہتر زندگی کے لیے لوگوں کی ضروریات اور توقعات کو پورا کیا جا سکے۔ انہوں نے مزید کہا کہ ان کا ملک دنیا بھر میں انسانی حقوق کو پروموٹ کرنے اور ان کی حفاظت کرنے کے لیے سب کے ساتھ مل کر کام کرے گا۔

سب کو شامل کرنے والی ترقی

سنکیانگ: سماجی و اقتصادی کایا پلٹ

میدانی، صحرائی اور پہاڑی سنکیانگ کا سفر کیا جائے تو پتا چلتا ہے کہ یہ وسیع اور دور دراز تک پھیلا علاقہ حیران کن ترقی کر چکا ہے۔

مالی ذرائع کی بڑے پیمانے پر فراہمی سے سنکیانگ کی معیشت تبدیل ہو چکی ہے۔ صوبہ کئی انفراسٹرکچرل اور صنعتی منصوبوں کو مکمل کر چکا ہے تا کہ چائنہ پاکستان اکنامک کوریڈور (سی پیک) کے ساتھ جڑا جا سکے۔ سب جانتے ہیں کہ سی پیک زیادہ بڑے منصوبے بیلٹ اینڈ روڈ انیشی ایٹو (BRI) کا ایک حصہ ہے۔ دو ہزار انیس میں سنکیانگ کا جی ڈی پی 1.36 ٹریلین یوآن تک پہنچ چکا تھا جبکہ محض چند سال پہلے دو ہزار چودہ میں اس کا جی ڈی پی 919 بلین یوآن تھا۔ چین کا ابتدائی سالوں میں جو جی ڈی پی تھا یہ اس سے دوسو گنا زیادہ ہے۔ شنہوا نیٹ کی فیکٹ شیٹ کے مطابق سنکیانگ کے شہری اور دیہی لوگوں کی فی کس سالانہ آمدنی دو ہزار اٹھارہ اور دو ہزار انیس میں 32764 یوآن ہو چکی تھی جو کہ انیس سو اناسی میں محض تین سو انیس یوآن تھی۔ یہاں تک کہ صوبے کی آبادی میں 22.14 فیصد اضافہ دیکھنے میں آیا جبکہ مین لینڈ چین کی ہان آبادی میں اضافے کی اوسط دو فیصد تھی۔ دو ہزار دس میں ایغور کی آبادی ایک کروڑ سے کچھ زیادہ تھی جو دو ہزار اٹھارہ میں بڑھ کر ایک کروڑ تیس لاکھ کے قریب پہنچ گئی تھی۔ یہ اعداد و شمار مغربی ذرائع سے آنے والی خبروں سے متضاد ہیں جن کے مطابق ایغور لوگوں کو بچے پیدا کرنے کے حوالے سے پابندیوں کا سامنا ہے۔

سی پیک کی وجہ سے سنکیانگ کے صنعتی، ٹرانسپورٹ، پانی، انرجی اور ٹیلی کمیونی کیشن کے منصوبوں میں تیزی سے ترقی ہوئی ہے۔ سنکیانگ کا ریلوے نیٹ ورک پہلے ہی چھ ہزار کلومیٹر کے ہندسے کو چھو چکا ہے، جس میں ایکسپریس وے اور ہائی وے کی انتظامی دیہات تک رسائی 99.74 فیصد ہے۔ ارمچی میں ایک سب وے نیٹ ورک کو ترقی دی گئی ہے اور یہاں اکیس سول ایئرپورٹ بھی موجود ہیں۔

ہر گریجویٹ کے لیے ملازمت کی ضمانت، تمام شہریوں کے لیے مفت علاج کی سہولت، دیہی علاقوں میں مفت تین سالہ پری سکول کی تعلیم، دیہات میں سستی رہائش کی فراہمی، چرواہوں کے لیے آبادیاں، شدید بیماری کی انشورنس، شہری اور دیہی لوگوں کے لیے کم از کم گزارہ الاؤنس، یہ سب معاشی تبدیلی کے وہ پھل ہیں جن سے یہ خطہ مستفید ہوا ہے۔

اُرمچی میں وزارت خارجہ امور کے عہدیدار عزیز ژانگ نے اس حوالے سے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا ''نسلی اور تہذیبی مسائل کو حل کرنے کے لیے ہم ثابت قدمی کے ساتھ چینی خصوصیات کے حامل درست راستے پر اصرار کرتے ہیں، علاقائی نسلی و تہذیبی خودمختاری کے نظام کو مکمل طور پر لاگو کرتے ہیں، مختلف نسلی گروہوں کے حقوق کو تحفظ فراہم کرتے ہیں اور ان کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں کہ وہ اپنی اپنی زبانوں کو ترقی دیں۔ مختلف مذاہب کے لوگوں کی نارمل مذہبی سرگرمیوں کا احترام کرتے ہیں اور ان کو تحفظ فراہم کرتے ہیں۔''

مئی دو ہزار چودہ میں چین نے سنکیانگ کو بی آر آئی اور سی پیک کے مرکزی ایریا میں تبدیل کرنے کی تجویز پیش کی تھی۔ ترقی کے ایک نئے مرحلے کا نتیجہ اُرمچی انٹرنیشنل لینڈ پورٹ اور قورغاس (Horgos) اور کاشغر اکنامک ڈویلپمنٹ زونز، پانچ ٹریڈ و لاجسٹک سنٹرز، ایک ٹرانسپورٹ ہب سنٹر، کلچرل اور سائنٹیفک ایجوکیشن سنٹر، میڈیکل سروس سنٹر اور ایک ریجنل فنانشل سنٹر کی صورت میں نکلا۔

گزشتہ تین برسوں کے دوران سنکیانگ نے بارہ ہزار چار سو غیر ملکی طالب علموں کو بھرتی کیا۔ سنکیانگ میں پانچ ہسپتال بین الاقوامی میڈیکل سروسز شروع کر چکے ہیں اور وہاں بیس ہزار غیر ملکی مریضوں کا علاج ہو چکا ہے۔ علاقے میں کل انتیس ہسپتال شاندار کراس بارڈر میڈیکل سروس

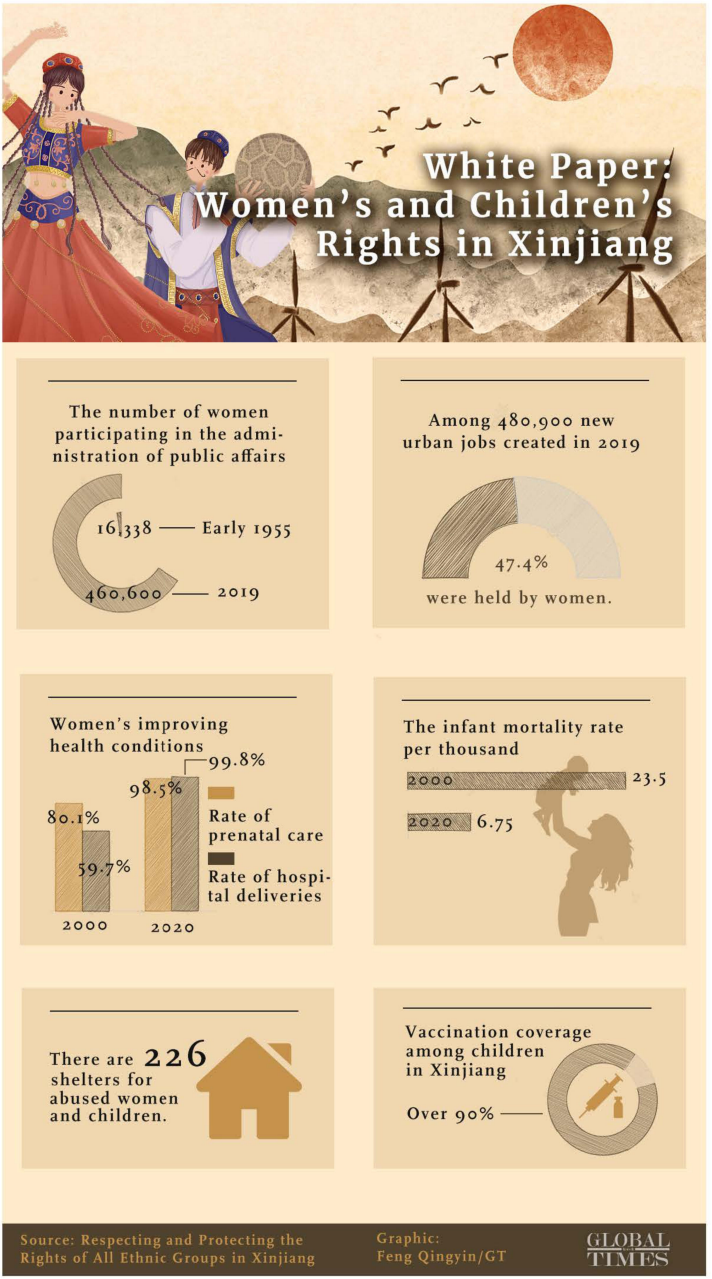
White Paper:
Women's and Children's Rights in Xinjiang
The number of women participating in the administration of public affairs
16,338 — Early 1955
460,600 — 2019
Among 480,900 new urban jobs created in 2019
47.4%
were held by women.
Women's improving health conditions
99.8%
98.5%
80.1%
59.7%
Rate of prenatal care
Rate of hospital deliveries
2000
2020
The infant mortality rate per thousand
2000
23.5
2020
6.75
There are 226 shelters for abused women and children.
Vaccination coverage among children in Xinjiang
Over 90% —
Source: Respecting and Protecting the Rights of All Ethnic Groups in Xinjiang
Graphic: Feng Qingyin/GT
GLOBAL TIMES

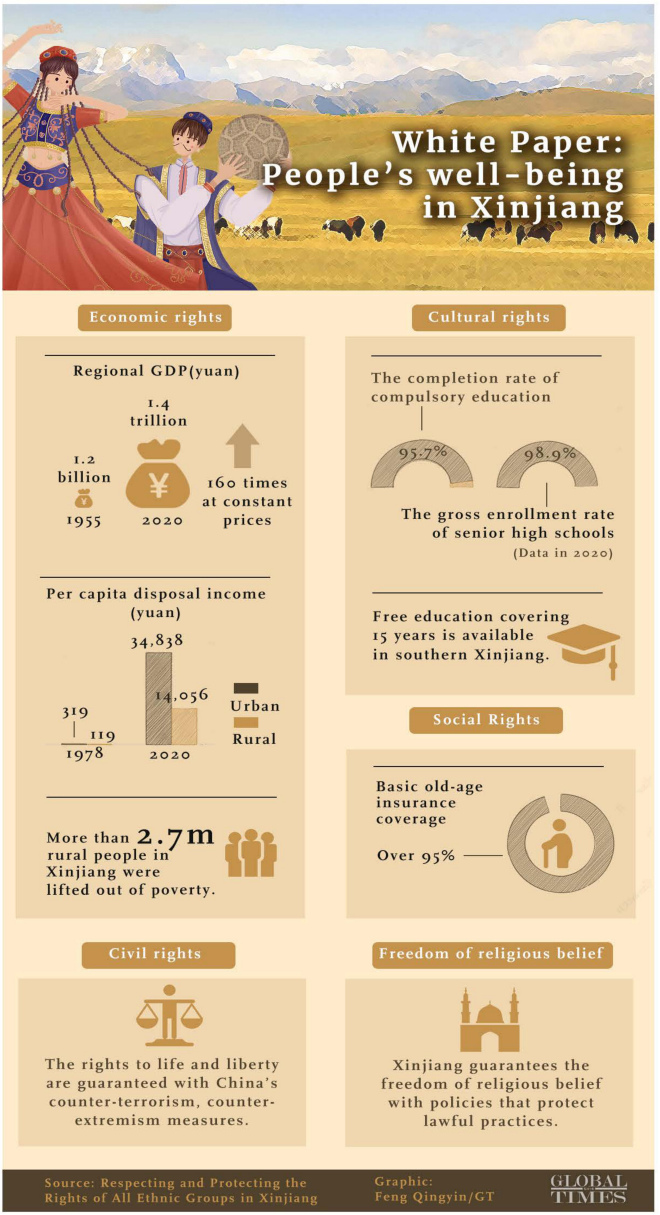
White Paper:
People's well-being
in Xinjiang
Economic rights
Regional GDP(yuan)
1.4
trillion
1.2
billion
1955
2020
160 times
at constant
prices
Per capita disposal income
(yuan)
34,838
14,056
319
119
1978
2020
Urban
Rural
More than 2.7m
rural people in
Xinjiang were
lifted out of poverty.
Cultural rights
The completion rate of
compulsory education
95.7%
98.9%
The gross enrollment rate
of senior high schools
(Data in 2020)
Free education covering
15 years is available
in southern Xinjiang.
Social Rights
Basic old-age
insurance
coverage
Over 95%
Civil rights
The rights to life and liberty
are guaranteed with China's
counter-terrorism, counter-
extremism measures.
Freedom of religious belief
Xinjiang guarantees the
freedom of religious belief
with policies that protect
lawful practices.
Source: Respecting and Protecting the
Rights of All Ethnic Groups in Xinjiang
Graphic:
Feng Qingyin/GT
GLOBAL
TIMES

پلیٹ فارم پیش کرتے ہیں اور تین ہمسایہ ممالک کے چوبیس بڑے ہسپتالوں کے ساتھ مل کر کام کرتے ہیں۔

چینی صدر شی جن پنگ چاہتے ہیں کہ سی پیک اور بی آر آئی کے ذریعے چین کے مشرقی اور مغربی ذرائع کو ایکسپورٹ اور مینوفیکچرنگ مراکز کے تحت مشرق اور مغرب سے منسلک کر دیا جائے۔

ذیل میں مذکورہ وائٹ پیپر کے دو صفحات دیئے گئے ہیں جن سے واضح ہوتا ہے کہ سنکیانگ میں خواتین اور بچوں کے حوالے سے کتنی ترقی ہوئی ہے اور عام لوگوں کی بہتری کے لیے کتنے جامع اور ٹھوس اقدامات کیے گئے ہیں۔

کاشغر، چین کی شراکتی ترقی کا مظہر:

پانچ لاکھ سے کچھ زیادہ آبادی کا حامل کاشغر شہر ایک غنودہ شہر ہے ماسوائے اس کے قدیم گرینڈ بازار کے۔ کاشی ایئرپورٹ، جو جرمنی کے فرینکفرٹ ایئرپورٹ کے نسبتاً نئے ٹرمینل کی طرز پر بنایا گیا محسوس ہوتا ہے' سے شہر کی طرف جانے والی سڑکوں پر اتنی ٹریفک نہیں ہوتی جتنی چین اور پاکستان کے ایئرپورٹس کی سڑکوں پر ہوتی ہے۔

ایغور' جو نسلی طور پر ترک مسلمان ہیں' آبادی کا نوے فیصد ہیں اور ڈیموگرافی (انسانی آبادی کا شماریاتی مطالعہ) میں غالب اکثریت رکھتے ہیں' تاہم اس کے مرکزی حصے کاشغر کی آبادی کا چالیس فیصد ہان چینیوں پر مشتمل ہے۔ یہ بدستور تجارت اور سیاست کا اعصابی مرکز ہے اور ایغور قوم پرستوں اور علیحدگی پسندوں کا گڑھ رہا ہے جہاں علیحدگی پسند ایسٹ ترکستان اسلامک موومنٹ (ای ٹی آئی ایم) کی جانب سے عسکریت جاری رہی۔

سنکیانگ چین کے جنوب میں رقبے کے اعتبار سے ملک کا سب سے بڑا صوبہ ہے جہاں کاشغر شہر میں قازق اور تاجک نسلی باشندوں کی جھلک بھی دیکھنے کو ملتی ہے۔ سنکیانگ دو کروڑ بیس لاکھ آبادی کے ساتھ چین کے پانچ خودمختار علاقوں میں سے ایک ہے' اور یہاں گروہی' سیاسی مسائل کی وجہ سے انتظامی سیاسی چیلنج کی صورت حال درپیش رہتی ہے۔

کاشغر چین کے لیے اس کی جدت اور روایت میں توازن پیدا کرنے کی خواہش کا مظہر

بھی ہے۔ یہ اس جدوجہد کی علامت بھی ہے جس کا مقصد ایک طرف سخاوت سے بھرپور سوشل سکیورٹی نیٹ ورک کے ذریعے آبادی کو اچھی خوراک اور تحفظ فراہم کرنا ہے اور ساتھ ہی یہ نیٹ ورک اپوزیشن بالخصوص علیحدگی پسند ای ٹی آئی ایم کو اپنے سے دور رکھتا ہے جس کے بارے میں بیجنگ کو یقین ہے کہ وہ چین کو بین الاقوامی طور پر بدنام کرنے کے لیے پراکسی کا کام کر رہی ہے۔

اپوزیشن کے ساتھ سلوک کی وجہ سے مغربی میڈیا صوبے پر نظر رکھے ہوئے ہے۔ مغربی میڈیا الزام عائد کرتا ہے کہ چین نے مبینہ طور پر دس لاکھ ایغور مسلمانوں کو کیمپوں میں قید کر رکھا ہے جہاں انہیں بنیاد پرستی سے پاک کیا جاتا ہے اور نئے تعلیمی پروگرام سے لیس کیا جاتا ہے۔

بیجنگ جواب میں ''کیمپوں'' کے الزام کو مسترد کرتا ہے اور اصرار کرتا ہے کہ ان کیمپوں میں تو قیدیوں کو نئی تعلیم دی جاتی ہے اور یہ کہ یہ تعلیم ملک کے ایک پارٹی، ایک زبان اور ایک قوم کی پالیسی سے مطابقت رکھتی ہے۔

سعودی ولی عہد محمد بن سلمان، جنہوں نے بیجنگ کا دورہ کیا تھا، نے چین کے بیانیے کی مکمل حمایت کی۔ چین کے بی بی سی اور وائس آف امریکہ سمجھے جانے والے چینی میڈیا ہاؤس سی سی ٹی وی کے مطابق سعودی ولی عہد نے چینی صدر شی جن پنگ سے ملاقات کے دوران اس بات پر اتفاق کیا کہ ان کا ملک اس بات کا حق رکھتا ہے کہ وہ اپنی قومی سلامتی کے حوالے سے دہشت گردی اور بنیاد پرستی کے خاتمے کے لیے کام کرے۔

چینی حکام اس حمایت کا بھی ذکر کرتے ہیں جو ان کے ملک کو بین الاقوامی فورموں، جیسے آرگنائزیشن آف اسلامک کوآپریشن (او آئی سی)، پر مسلمانوں کے لیے اس (چین) کی مثبت پالیسیوں کی وجہ سے حاصل ہوتی ہے۔

بیجنگ میں چینی وزارت خارجہ کے ایک ترجمان نے ایک بیان میں کہا کہ ہم کافی عرصے سے جانتے ہیں کہ متعدد مغربی ممالک سنکیانگ سے متعلق معاملات پر چین کو قصوروار سمجھتے ہیں لیکن ابوظہبی میں ہونے والے کونسل آف فارن منسٹرز آف آرگنائزیشن آف اسلامک کوآپریشن (او آئی سی) کے چھیالیسویں اجلاس نے ایک قرارداد منظور کی تھی جس میں مسلمانوں کی بہتری کے لیے چین کی کوششوں کی تعریف کی گئی تھی۔

چینی ترجمان نے کہا ''قرارداد میں چین کی تعریف کے ساتھ اس کی ان کوششوں کو بھرپور طریقے سے تسلیم کیا گیا جو وہ چینی مسلمانوں کے لیے کر رہا ہے۔ اس میں چین کے ساتھ تعاون کو مزید مضبوط بنانے کے لیے آمادگی کا اظہار بھی کیا گیا۔ چینی سائیڈ اس کو بہت سراہتی ہے۔'' ترجمان نے میڈیا کو یاددہانی کرائی کہ زیادہ عرصہ نہیں گزرا جب او آئی سی کے ایک وفد نے سنکیانگ کا دورہ کیا تھا' جب وہ ایک سیاسی مشاورت کے لیے چین آئے تھے۔ موجودہ حالات میں چین او آئی سی کے ساتھ مل کر کام کرنے کے لیے تیار ہے تاکہ دونوں فریقوں میں باہمی فائدے پر مبنی تعلقات کو مضبوط کیا جا سکے۔

ای ٹی آئی ایم، جو بیجنگ سے آزادی کا مطالبہ کرتی ہے، کمیونسٹ پارٹی آف چائنا کی تیز نگاہوں میں ہے' جس نے وہاں پر ترقیاتی کاموں کا جال بچھا دیا ہے اور گزشتہ ایک عشرے کے دوران اس صوبے میں انفراسٹرکچر کی ترقی اور معاشی توسیع کے لیے بڑے پیمانے پر کام کیا گیا تاکہ نان سٹیٹ ایکٹرز کی دھمکیوں کا جواب دیا جا سکے۔ بڑے پیمانے پر تعمیر کیے جانے والے انفراسٹرکچر میں سٹیٹ آف دی آرٹ ایئرپورٹ کی تعمیر کے علاوہ صاف پانی، بجلی، سڑکوں، ٹیلی کمیونی کیشن، صحت اور تعلیم کی سہولیات شامل ہیں۔ یہ سب چیزیں بی آر آئی سے جڑی ہوئی ہیں۔

حکام کا کہنا ہے کہ اوائل دو ہزار سترہ سے لے کر اب تک ایک بھی دہشت گردانہ حملہ نہیں ہوا' جس کی وجہ سے صوبے میں بالکل امن اور سکون ہے۔ یہاں تک کہ خود کاشغر شہر میں صورت حال قابو میں ہے اور یہ شہر نارمل ہو چکا ہے' تاہم سکیورٹی کے لیے تمام اقدامات بخوبی کیے جا رہے ہیں حتیٰ کہ مشہور اولڈ گرینڈ بازار کے داخلی اور خارجی راستوں پر سخت قسم کے سکیورٹی اقدامات کیے گئے ہیں' اور سکیورٹی کے افراد اور سکینرز کے ذریعے یہ فرض خوش اسلوبی کے ساتھ پورا کیا جا رہا ہے۔

کاشغر پشاور کے ساتھ ساتھ شنزن اور شنگھائی کا سسٹر سٹی بھی ہے۔ مرکز کی ہدایات پر دونوں صوبے انفراسٹرکچر اور اقتصادی ترقی میں سنکیانگ کی مدد کر رہے ہیں۔ نئی آبادیاں، سڑکیں اور تجارتی مراکز بنائے جا رہے ہیں اور زیادہ تر یہ کام دو ہزار تیرہ میں شروع کیے گئے بیلٹ اینڈ روڈ انیشی ایٹو (بی آر آئی) کے تحت کیے جا رہے ہیں۔ سی پیک' جو بی آر آئی کا ایک حصہ ہے' کی وجہ سے کاشغر اور سنکیانگ' دونوں بہت اہمیت اختیار کر گئے ہیں کیونکہ دونوں پاکستان کے قریب واقع ہیں۔ اس

لیے اس میں حیرانی کی کوئی بات نہیں کہ مرکز نے شنزن اور شنگھائی دونوں کو ہدایت کی ہے کہ وہ انفراسٹرکچر اور اقتصادی ترقی میں سنکیانگ کی مدد کریں اور اس کے حکام اور عوام کو اس امر کے لیے تیار کریں کہ پاکستان میں گوادر پورٹ کے مکمل ہونے کے بعد بڑی تجارت کا ان کا انتظار کر رہی ہے۔

کاشغر کی سڑکوں پر گاڑیوں کے لیے رفتار کی حد چالیس کلومیٹر فی گھنٹہ ہے اور گاڑیوں کو اسی رفتار سے چلنا پڑتا ہے۔ بجلی سے چلنے والے (الیکٹرک) سکوٹر، جو سواری کا مقبول ذریعہ ہیں، ماحول کو تباہی سے بچانے کی کوششوں کا حصہ ہیں، حتیٰ کہ سنکیانگ کے دارالحکومت اُرمچی سے ایک سو اٹھائیس کلومیٹر دور واقع تفریحی مقام ''ہیونلی لیک'' (Heavenly Lake) جانے کے لیے ٹریفک مینجمنٹ پروگرام بھی انہی کوششوں کا حصہ ہے جہاں کار پارکنگ کا ایریا تفریحی مقام سے پچیس کلومیٹر دور رکھا گیا ہے جہاں سے شٹل بس سروس سیاحوں کو پہاڑیوں میں گھری خوبصورت جھیل تک پہنچاتی ہے، جو برف سے ڈھکی ہوتی ہے۔

کاشغر کے پرانے شہر کی گلیوں، جو قدیم کلچر کو محفوظ رکھنے کے لیے دوبارہ تعمیر کی گئی ہیں، کو دیکھ کر سیاحوں کو پتا چلتا ہے کہ مقامی ایغور، جو یہاں رہتے تھے، کی زندگیاں اور فنِ تعمیر کیسا تھا۔ حیرت انگیز طور پر شہر کی زیادہ تر گلیاں اور فنِ تعمیر نہ صرف لاہور اور پشاور کے اندرون شہر کی یاد دلاتے ہیں بلکہ وسطی ایشیا کے پرانے قصبوں کو بھی آپ کی آنکھوں کے سامنے لے آتے ہیں۔ گرینڈ بازار کے بالمقابل بنے چند پرانے اور بوسیدہ مٹی کے مکان پرانے زمانوں کی یاد دلاتے ہیں۔ محسوس ہوتا ہے کہ ان قدیم سٹرکچرز کو محفوظ بنانے کے لیے خاصی بے عیب پلاننگ کی گئی، جو ایک پہاڑی کے اوپر واقع ہیں اور جن کو قریبی قدرتی دیوار نے گھیر رکھا ہے۔

پُرانا قصبہ بالکل صاف ستھرا اور گنجان آبادی والا ہے، جس میں بہت سے گھر باہر سے لاک کئے گئے ہوتے ہیں۔ رہائشیں باری باری تبدیل کی جاتی ہیں جہاں جوان اور بوڑھے سہ پہر کو اکٹھے ہوتے ہیں۔

شہری ترقی کی منصوبہ بندی کے علاوہ حکام اس ماحولیاتی بگاڑ سے بھی پریشان ہیں جو صنعتوں کے قیام، کوئلے سے چلنے والے پلانٹس اور پورے چین میں چلنے والی لاکھوں کروڑوں

گاڑیوں کی وجہ سے پیدا ہوا ہے' تاہم یہ پریشانیاں اور تفکرات بیجنگ اور اس کے صوبوں بشمول سنکیانگ کو ماحول اور ثقافت کے ساتھ ہم آہنگ رہتے ہوئے آگے بڑھنے سے روک نہیں پاتے۔

مجموعی طور پر کاشغر اور سنکیانگ کا دارالحکومت ارمچی، دونوں اس ثقافتی رنگارنگی کی نمائندگی کرتے ہیں جس کا جشن تمام چینی مناتے ہیں اور یہ جشن چین بھر کے ثقافتی پروگراموں میں اپنا تاثر قائم رکھتا ہے۔

لہاسہ، دنیا کی چھت:

لہاسہ جو تبت کا دارالحکومت ہے دنیا کی سب سے بڑی سطح مرتفع بھی ہے جو اس سخت پہاڑی خطے میں معاشی ترقی کی دماغ کو چکرا دینے والی گواہی دیتا ہے۔ مرکزی شہر سے کچھ فاصلے پر عظیم الشان انٹرکانٹی نینٹل ہوٹل مرکزی دھارے کے تبتیوں کے لیے سی پیک کا ایک عظیم مظہر ہے جو ایک پائیدار سماجی' معاشی ترقی کے پلان کے ذریعے لہاسہ کو زبردست انفراسٹرکچر کے ساتھ ایک جدید شہر میں تبدیل کر چکا ہے۔

لہاسہ سطح سمندر سے 3400 میٹر کی بلندی پر واقع ہے' اور اس قدر بلندی پر ایک انوکھا تجربہ فراہم کرتا ہے۔ جو لوگ خُنجراب پاس پر پاک چین بارڈر کا دورہ کر چکے ہیں' وہ اس کو آسانی سے محسوس کر سکتے ہیں۔ خُنجراب سطح سمندر سے پانچ ہزار میٹر کی بلندی پر واقع ہے' لیکن زیادہ تر سیاح اس کو محسوس نہیں کرتے کیونکہ درہ خنجراب پر ان کا قیام بہت مختصر ہوتا ہے۔

لہاسہ میں آکسیجن نارمل سطح کا صرف ساٹھ فیصد ہوتی ہے جس کی وجہ سے یہاں آنے والے نئے لوگوں کو چکر آتے ہیں، سر میں درد ہوتا ہے اور نیند نہیں آتی۔ یہاں زندگی کی رفتار آہستہ ہے۔ لوگ عام طور پر پُرسکون اور بے تکلف ہوتے ہیں۔ شاید اس کی وجہ بھی اس شہر کا اس قدر بلندی پر واقع ہونا ہے۔

لیکن تجربہ منفرد ہوتا ہے اور اس قابل کہ اس کے لیے بیجنگ سے چار گھنٹے کی فلائٹ لی جائے۔ تبت کو دنیا کی چھت بھی کہا جاتا ہے اور دور دراز کا یہ علاقہ مکاؤ، ہانگ کانگ اور ہمسایہ سنکیانگ کی طرح خودمختار ہے۔

کمیونسٹ پارٹی آف چائنا کسی علاقے کے دور دراز واقع ہونے یا ماحول سخت ہونے کی وجہ سے اسے ترقی سے محروم کرنے کی اجازت نہیں دیتی۔ نہ سنکیانگ میں نہ تبت میں۔ دریائے لولانگ کے ساتھ ساتھ وسیع و عریض علاقے میں سڑکوں اور عمارتوں کے انفراسٹرکچر سے چینی قیادت کے عزم کا پتا چلتا ہے' جو وہ خصوصی ترقیاتی منصوبوں کے ذریعے خودمختار علاقوں کو قومی دھارے میں لانے کے لیے رکھتی ہے۔

تبت کا علاوہ صدیوں دلائی لامہ کے زیرِ اثر رہا۔ ان کے پیروکار شدید غربت اور انتہائی سخت ماحول میں زندگی گزارتے رہے' لیکن ان کا روحانی لیڈر جب تک زندہ رہتا' اس کے اردگرد سونے کے ڈھیر لگے ہوتے' حتیٰ کہ جب وہ مرتا تو پوٹالہ محل میں اس کی قبر کو بھی 3720 کلوگرام خالص سونے سے بھر دیا جاتا۔

ساتویں دلائی لامہ نے اس جگہ کا انتخاب خود کو اپنے پجاریوں سے الگ تھلگ کرنے کے لیے کیا تھا اور یہاں لہاسہ میں قیام کر لیا تھا۔ یہ محل اپنی جگہ آرکیٹکچر کا ایک نادر نمونہ ہے۔ یہ دور سے ہی نظر آجاتا ہے اور ان کوششوں کی یاد دلاتا ہے جو اس کی مرحلہ وار تعمیر کے حوالے سے کی گئیں اور جو تین صدیوں پر محیط ہیں۔

دلائی لامہ کے کئی شاگردوں کی قبروں اور مزاروں کو بھی سونے، چاندی اور تانبے سے بھر دیا جاتا ہے۔ دلائی لامہ اور ان کے پیروکاروں کی زندگیوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ انیس سو اکاون تک ان کا یہ حال تھا کہ وہ بدترین زندگی بسر کر رہے تھے' پھر چین کی پیپلز لبریشن آرمی نے علاقے کا کنٹرول حاصل کر لیا۔ موجودہ اور چودھویں دلائی لامہ نے چینی اقتدار میں رہنے سے انکار کر دیا اور فرار ہو کر انڈیا پہنچ گیا۔

مذہبی لیڈروں کے برعکس لامہ' یعنی تبت کے نئے روحانی رہنما' جو کہ چینی کمیونسٹ پارٹی ہے' نے دلائی لامہ کے پیروکاروں کو شدید غربت سے نکالا اور انہیں ایک پُروقار زندگی دی۔ تقریباً ہر شہری کے پاس رہنے کے لیے گھر ہے' نوکری کی ضمانت ہے اور سماجی فلاحی نظام کے تحت وہ بالکل محفوظ ہیں۔

مذکورہ بالا محل تین حصوں پر مشتمل تھا' اور مختلف ادوار میں تعمیر کیا گیا تھا۔ یہ حصے زرد، سرخ

اور سفید رنگوں پر مشتمل تھے اور یہ رنگ بالترتیب طاقت، مذہب اور سیاست کی علامت تھے۔ محل کی تعمیر 1770ء میں شروع کی گئی تھی۔

ظاہر ہے کہ ترقی کی یہ سطح بہت زیادہ لاگت سے حاصل کی گئی تھی' اور اس میں سرکردہ لیڈر ذاتی طور پر مصروف تھے' اور یہ عمل تبّتی آبادی کے عشروں پر محیط فوکس اور مشاہدے کے بعد کیا گیا تھا۔ یاد رہے کہ تبت کی غالب اکثریت بدھ مت کے ماننے والوں کی ہے۔ انیس سو پچاس' ساٹھ اور ستر کی دہائیوں میں جو سیاسی بے چینی پھیلی اور اپوزیشن کی جانب سے جو مظاہرے کئے جاتے رہے' ان کے بارے میں چینی حکام کا خیال تھا کہ ان میں غیر ملکی ہاتھ ملوث ہیں بالخصوص انڈیا اور امریکہ کے ہاتھ۔ ان ریشہ دوانیوں اور سازشوں کا جواب ترقیاتی منصوبوں اور سماجی و معاشی مراعات کی شکل میں دیا گیا۔ ان چیزوں نے تبت کی بڑی آبادی کو منصوبہ بند بے چینی اور افراتفری سے محفوظ کر دیا۔

انیس سو نوے کی دہائی میں لہاسہ میں صرف چار بڑے ہوٹل تھے' لیکن دو ہزار انیس میں یہ تعداد ایک سو ساٹھ ہو چکی تھی' جن میں عظیم الشان انٹر کانٹی نینٹل ہوٹل بھی شامل ہے۔ یہ سب تبت میں دنیا بھر سے آنے والے بدھ مت کے پیروکاروں کی وجہ سے کیا گیا۔ تبت میں سب سے زیادہ سیاح اندرون ملک سے آتے ہیں جو کہ مقامی ٹورازم کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔

سرنگوں کے ایک سلسلے کے ساتھ، لہاسہ مشرق اور مغرب میں متعدد وادیوں کے ساتھ منسلک ہے۔ یہاں تک کہ تنگچی نامی قصبے' جو لہاسہ سے تقریباً 200 کلومیٹر مشرق میں واقع ہے' میں انفراسٹرکچر حیرت انگیز طور پر اتنا ہی اچھا ہے جتنا لہاسہ یا اُرمچی میں۔

یہ سب 1950ء اور 1960ء کے درمیانی عرصے میں پائی جانے والی صورت حال سے ایک بالکل برعکس صورتحال کی عکاسی کرتے ہیں۔ ان سارے برسوں میں پوٹالہ محل صرف ایک چیز کی نگرانی کرتا رہا اور وہ چیز تھی انتہائی غربت، چند سڑکیں، برائے نام سہولتیں جیسے پانی اور بجلی۔ آج، پورا علاقہ جدید شاہراہوں' سرنگوں کے ایک پورے سلسلے اور جدید ترین پلوں کے ذریعے اچھی طرح سے مربوط اور منسلک ہے۔

یہ سب خطے کی جامع اور تعاون و شراکت پر مبنی سماجی و اقتصادی ترقی پر بھرپور توجہ مرتکز کئے بغیر یقیناً ناممکن تھا۔ یہ سوچ کر حیرت ہوتی ہے کہ ایسی ہی مخلصانہ توجہ اگر حکمران اشرافیہ کی جانب

سے پاکستان کے شمالی علاقوں پر مرتکز کی گئی ہوتی تو آج وہ علاقے کیسے نظر آتے۔ اپنی حکمران اشرافیہ کا چین کے بے لوث رہنماؤں کے ساتھ موازنہ کیا جائے تو کردار کا شدید تضاد ابھر کر سامنے آتا ہے۔

لہاسہ میں تمام خود دار قوموں کے لیے ایک سبق ہے: کسی خطے کا دور دراز واقع ہونا اور وہاں کی سخت آب و ہوا' دونوں شراکت پر مبنی اور عوام پر مرتکز ترقی کی راہ میں رکاوٹ نہیں بن سکتیں۔

باب یازدہم

مستقبل- درپیش چیلنجز اور حاصل مواقع

سابق امریکی صدر ڈونلڈ ٹرمپ نے چین پر الزام عائد کیا تھا کہ وہ کووڈ19 پھیلانے کا ذمہ دار ہے۔اس کے لیے 'ووہان وائرس' اور 'چائنا وائرس' جیسے الفاظ استعمال کیے گئے۔صحت سے متعلق ایک مسئلے کو قومی مفادات کے لیے سیاسی رنگ دینا کوئی نیا ہتھکنڈا نہیں ہے، لیکن جس انداز میں ٹرمپ اور دوسرے مغربی رہنماؤں نے چین پر کاری ضرب لگانے کے لیے وائرس کو ایک جغرافیائی وسیاسی آلے کے طور پر استعمال کیا، وہ نہایت انوکھا تھا۔چین اس پر احتجاج کرتا رہا، لیکن ساتھ ہی خاموشی سے اس مسئلے (وائرس کے پھیلاؤ) کے حل کی کوششوں میں بھی مصروف رہا، اور بہت سوں کے لیے یہ حیرت کا باعث تھا (کچھ کے لیے شرمندگی کا) کہ مارچ 2020ء کے وسط میں چین کورونا کے خلاف بڑی کامیابی حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا۔یہ وہ وقت تھا جب امریکہ اور یورپ میں کورونا کی ہلاکت خیزیاں ابھی شروع ہی ہوئی تھیں۔

دی ہیلتھ سلک روڈ

امریکہ کے برعکس بیجنگ نے ویکسین ڈپلومیسی کا اہتمام کیا جسے کچھ حکام نے 'ہیلتھ سلک روڈ' کا نام دیا۔اس ڈپلومیسی کے تحت کم وبیش سو ممالک کے لیے ویکسین کی لاکھوں خوراکیں بھجوائی گئیں تاکہ وہاں ایمرجنسی میں استعمال ہوسکیں یا پھر مارکیٹ میں فروخت کی جاسکیں۔ان میں سے 53 ممالک کو ویکسین کی لاکھوں خوراکیں مفت دی گئیں۔ان 53 ممالک میں ایشیا اور افریقہ کے درجنوں ترقی پذیر ممالک بھی شامل تھے۔

متحدہ عرب امارات (یو اے ای) نے بھی کورونا کے خلاف سائنو فارم ویکسین کا انتخاب کیا تھا کیونکہ پاکستان کی طرح اس نے بھی تیسرے مرحلے کے طبی تجربات کے لیے رضا کارانہ طور پر خود کو پیش کیا تھا جس کے بدلے میں اسے دوا فراہم کی گئی، جبکہ مقامی طور پر ویکسین تیار کرنے کی صلاحیت میں بھی مدد دی گئی۔ سائنو فارم نے خطے میں ویکسین کی تقسیم کے لیے بھی یو اے ای میں اس کی تیاری کا عمل شروع کیا۔

کورونا کے خلاف سائنو ویک، کین سائنو اور سائنو فارم کے نام غیر ممالک میں گھر گھر لیے جانے لگے، بالخصوص وہ ممالک جو چین کے بیلٹ اینڈ روڈ انیشی ایٹو (بی آر آئی) میں شراکت رکھتے ہیں۔ اس سے چین ایک ایسے ملک کے طور پر ابھر کر دنیا کے سامنے آیا جو دنیا بھر کے ممالک میں نرم اور دوستانہ مداخلت کرتا ہے، بجائے امتیازی جغرافیائی سیاسی ہتھکنڈوں، مختلف بہانوں سے جارحیت اور جنگ کو استعمال کرنے کے۔

پیٹی (Patie)

پاکستان اور چین، جو پہلے ہی چائنا پاکستان اکنامک کوریڈور (سی پیک) کے بندھن میں بندھے ہوئے ہیں، دونوں ممالک کورونا کے دنوں میں اس وقت ایک دوسرے کے مزید قریب آ گئے جب پاکستان کے پاس کورونا ویکسین کی فراہمی میں تعطل آنے لگا اور گلوبل کوویکس COVAX (Covid-19 Vaccines Global Access) کے تحت ویکسین کی فراہمی کا جو وعدہ کیا گیا تھا، اس کو پورا کرنے کی راہ میں خلل پیدا ہونے لگا۔ آسٹرزینیکا ویکسین بھارت کے سیرم انسٹی ٹیوٹ آف انڈیا (SII) میں تیار ہوتی تھی۔ اس میں پاکستان کا جو حصہ تھا اس کی فراہمی میں اس وقت تعطل پیدا ہو گیا جب بھارت کے اندر اس ویکسین کی طلب بڑھ گئی لیکن اس موقع پر بھی چین پاکستان کی مدد کو آیا اور اس نے نہ صرف پاکستان کو لاکھوں کی تعداد میں ویکسین فراہم کی بلکہ ویکسین کی تیاری کا مرکز بھی بنا کر دیا۔

وبا کے حوالے سے دیگر بہت سے تحفوں کے ساتھ چین نے پاکستان کو متعدی امراض کا ایک اعلیٰ مرکز اور اسلام آباد میں کورونا ویکسین کی تیاری کا مرکز بھی بنا کر دیا جس میں روزانہ ایک لاکھ

ویکسینز تیار کرنے کی صلاحیت ہے۔ یہ مرکز نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف ہیلتھ میں قائم کیا گیا جس نے مئی دو ہزار اکیس میں کام شروع کر دیا اور یہ پاکستان کے تاریخی اور آزمودہ دوست کی طرف سے بہترین تحفہ قرار پایا۔

درحقیقت ویکسین ڈپلومیسی کے اس دور میں پاکستان کو سب سے زیادہ فائدہ ملا: سینکڑوں کی تعداد میں وینٹی لیٹرز، حفاظتی آلات، کین سائنو اور سائنو فارم ویکسینوں کی لاکھوں کی تعداد میں ڈوزز پاکستان کو ملیں۔ ویکسین کی زیادہ تعداد ان ممالک کو تحفے کے طور پر ملی جن کے 35000 افراد نے ویکسین کے کلینیکل ٹرائلز میں حصہ لیا۔

نئی سرد جنگ

بائیڈن کی نئی سرد جنگ کی وجہ سے درپیش جغرافیائی و سیاسی چیلنجز

کورونا کی وبا نے انسانی وجود کے ہر پہلو کو جس طرح متاثر کیا، ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ وبا کے سماجی، معاشی اور سیاسی اثرات و نتائج پر کوئی سوال نہیں اٹھا سکتا۔ اس تحریر کے وقت کورونا کیسوں کی تعداد اڑسٹھ کروڑ تیرہ لاکھ سے زائد ہے جبکہ دنیا بھر میں اس سے اڑسٹھ لاکھ سے زیادہ اموات ہو چکی ہیں۔

اس قسم کے زبردست چیلنجز کے باوجود امریکہ کی قیادت میں مغرب اور چین کے درمیان نئی سرد جنگ نے ایک شکل اختیار کر لی ہے اور ارتقائی منازل طے کی ہیں۔ دو ہزار اکیس کے سال نے امریکی قیادت میں مغرب اور مشرق میں چین روس اتحاد کے درمیان پہلے ہی سے خراب تعلقات کو مزید بگڑتے ہوئے دیکھا۔

جنوری دو ہزار اکیس میں جیو پولیٹیکل محاذ اس وقت مزید گرم ہو گیا جب جو بائیڈن وائٹ ہاؤس میں متمکن ہوئے۔ ان کی ابتدائی موو (Move) نے ہی اس دراڑ کو مزید گہرا کر دیا جو بلاکوں کی سیاست اور کورونا کی وبا کی وجہ سے پیدا ہوئی تھی۔ بائیڈن نے اپنی چودہ اپریل کی تقریر، جس میں انہوں نے افغانستان سے اپنی فوجیں نکالنے کا اعلان کیا تھا، میں چین کو امریکی مفادات کے

لیے سب سے بڑا خطرہ قرار دیا تھا۔ انہوں نے کہا تھا ''بڑھتے ہوئے جارحانہ چین کی سخت مسابقت کا مقابلہ کرنے کے لیے ہمیں امریکہ کی مسابقانہ صلاحیتوں کو بڑھانا ہوگا۔''

بائیڈن کے یہ خیالات زیادہ حیرانی کا باعث نہیں تھے کیونکہ چند گھنٹے پہلے ہی امریکہ کے ڈائریکٹر آف نیشنل انٹیلی جنس ایورل ہینز (Avril Haines) نے چین کا معاملہ امریکہ کی سینیٹ انٹیلی جنس کمیٹی میں پیش کیا تھا، جس میں چین کو انٹیلی جنس کمیونٹی کے لیے ''بے مثل ترجیح'' قرار دیا گیا تھا۔

امریکی ایف بی آئی کے ڈائریکٹر کرسٹوفر رے (Christopher Wray) کا کہنا تھا ان کی ایجنسی ہر دس گھنٹے بعد ایسی تحقیقات کا آغاز کرتی ہے جس کا تعلق آگے چل کر چین سے بنتا ہے۔ کرسٹوفر نے امریکی سینیٹرز کو بتایا، ''میرا نہیں خیال کہ کوئی دوسرا ملک ہماری اختراع، ہماری معاشی سلامتی اور ہماری جمہوریت پسندی کے لیے اس سے بڑا خطرہ ہو۔'' ٹائم میگزین کے مطابق اب امریکہ کے لیے دہشت گرد گروپوں سے زیادہ بڑا خطرہ چین بن چکا ہے۔

اسی طرح درپیش خطرات کے تخمینے پر مبنی ایک تحریری رپورٹ سے اس بات کا اشارہ ملتا ہے کہ ''گزشتہ دو عشروں میں امریکہ کا اب دہشت گرد گروپوں جیسے القاعدہ اور داعش پر فوکس کم ہو رہا ہے، امریکہ کی ترجیحات تبدیل ہو رہی ہیں جس کا اندازہ امریکی صدر جو بائیڈن کی جانب سے افغانستان سے اپنی افواج واپس بلانے کے فیصلے سے ہوتا ہے، اور اب امریکہ بین الاقوامی دہشت گردی پر توجہ دینے کے بجائے چین روس اور ایران سے نمٹنا چاہتا ہے۔''

گیریژن یونیورسٹی لاہور میں ڈین سوشل سائنسز ڈاکٹر محمد علی احسان اس بات کو مسترد کرتے ہیں کہ چین امریکہ کے لیے واحد سب سے بڑا خطرہ ہے۔ اس کے بجائے انہوں نے اس کو ایشیا بحرالکاہل اور یوریشیا میں امریکی ڈپلومیسی کے لیے سب سے بڑا امتحان قرار دیا۔ ان کا کہنا ہے، ''یہ پورا آئیڈیا کہ امریکہ دنیا کو 'اینٹی چین اتحاد اور پروچائنا اتحاد' میں تقسیم کرنے کی کوشش کر رہا ہے، اسی طرح کے ایک سابق ناکام پالیسی سلوگن کا دوبارہ نفاذ ہے، جس میں کہا گیا تھا، تم ہمارے ساتھ ہو یا ہمارے خلاف ہو۔'' انہوں نے مزید کہا کہ صدر جو بائیڈن کو اس چیز سے بچنا ہوگا کیونکہ کچھ ممالک، جیسے کہ پاکستان، کے چین کے ساتھ تعلقات بہت گہرے ہیں اور یوں دنیا کو اینٹی چین

اور پرو چین بلاکوں میں تقسیم کرنے کے پورے خطے پر سیاسی، سفارتی اور سلامتی کے حوالے سے شدید مضمرات ہوں گے۔

جو بائیڈن کی جانب سے چین امریکہ سرد جنگ کے خاموش اعلان میں کئی سفارتی جھگڑے اور روس و ایران کے خلاف معاشی پابندیاں شامل ہیں اور اس سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ امریکی پالیسی کا فوکس ایشیا پر ہے۔ اس سے پاکستان اور چین کو ایک دوسرے کے قریب آنے، امن کے قیام کے لیے اپنی حکمت عملیوں کو ہم آہنگ کرنے اور تجارتی و معاشی تعاون کو مزید بڑھانے کے لیے زور لگانے کا ایک اور موقع ملا۔

اگر تاریخ کو ایک رہنما مان لیا جائے اور مشترک چیلنجز کی نوعیت کو مدِ نظر رکھا جائے تو چین اور پاکستان کی پارٹنرشپ پاک امریکہ تعلقات کے برعکس نہایت ہموار طریقے سے آگے بڑھی ہے۔

چین اور امریکہ- دوہرے پن میں مضمر سبق

امریکہ اور چین کے مابین طرزِ فکر کا فرق ہاتھ سے لکھے اس رقعے سے بھی سامنے آتا ہے جو سابق امریکی صدر رچرڈ نکسن نے پاکستان کے لیے شکریے کے طور پر لکھا تھا۔ انہوں نے لکھا تھا:

''وہ لوگ جو آنے والی نسلوں کے لیے زیادہ پُرامن دنیا چاہتے ہیں، ان پر ہمیشہ کے لیے آپ کا قرض رہے گا۔'' نکسن نے یہ خط صدر یحییٰ خان کو لکھا تھا، جس میں ان کی طرف سے چین اور امریکہ کے مابین تعلقات بڑھانے میں پاکستان کے کردار پر شکریے کا اظہار کیا گیا تھا۔

نکسن نے وزیرِ اعظم چواین لائی کی ہنری کسنجر، جو جولائی انیس سو اکہتر میں چینی سرزمین پر قدم رکھنے والے پہلے بڑے امریکی عہدیدار تھے، سے اس خصوصی درخواست کا حوالہ دیا جس میں انہوں (چواین لائی) نے کہا تھا ''چین آنے کے لیے آپ نے جو پُل (پاکستان) استعمال کیا، اس کو بھولنا مت۔ آپ کو اس کی دوبارہ بھی ضرورت پڑ سکتی ہے۔'' چواین لائی نے یہ بات یاد دہانی کے لیے اس وقت کی تھی جب کسنجر کراچی سے بیجنگ آئے تھے اور پاکستان نے ان کے دورے کے لیے راستہ ہموار کیا تھا۔

تاریخ گواہ ہے کہ پاکستان جن دوملکوں کو ایک دوسرے کے قریب لایا تھا' ان میں کس نے پاکستان کے ساتھ کیسا سلوک کیا۔ پاکستان کی امریکہ سے مایوسی کا آغاز کسنجر کے جانے کے محض چند ماہ بعد ہی ہوگیا تھا جب بھارتی فوج نے مشرقی پاکستان پر حملہ کر دیا، اور پاکستان نے اس حملے کے خلاف جس امریکی بحری بیڑے کی امید لگا رکھی تھی وہ کبھی مدد کے لیے نہ آیا۔ امریکی اسٹیبلشمنٹ نے اپنے لیے جغرافیائی و سیاسی سہولت کا خیال رکھا، صرف اپنا فائدہ دیکھا، اور چین کے لیے اپنے ''پُل'' پاکستان کو بھلا دیا۔

پھر یہ بھی ہوا کہ امریکہ اس وقت دوبارہ آیا جب انیس سو اناسی میں سوویت یونین نے افغانستان پر حملہ کر کے اس پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد نائن الیون ہوا اور اس میں بھی امریکہ نے پاکستان کو استعمال کیا جیسا کہ چو این لائی پہلے ہی پیش گوئی کر چکے تھے۔ زیادہ تر پاکستانی محسوس کرتے ہیں کہ امریکہ نے وعدے پورے نہیں کیے، ہر چیز کو جیو پولیٹیکل فوائد کی نظر سے دیکھا، اور قریب نظری کا تاریخی مظاہرہ کیا۔

تاریخ بتاتی ہے کہ چین نے ایسا نہیں کیا، اور اپنے ''آئرن برادر'' کو کبھی نہیں بھولا۔

آگے کا راستہ

تعلقات کے لیے آگے امتحان کا وقت ہے جیسا کہ وزیر اعظم وین جیا باؤ کہتے ہیں ''یہ ایک بڑا درخت ہے جس کی جڑیں بہت گہری ہیں اور یہ کہ چین اور پاکستان کے لوگوں کی دوستی ان کے خون میں دوڑتی ہے۔''

چین امریکہ سرد جنگ کا پہلا دور، جس میں ایشیا میں انڈیا امریکہ کا بنیادی مہرہ ہوگا، نئے چیلنجز لائے گا اور یہ پاک چین پارٹنرشپ پر دباؤ کا باعث بنے گا۔

درپیش اہم چیلنجز

ایک بڑا اور اہم چیلنج اس دوستی کو بداعتمادی سے بچانا ہے جو پاکستان کے شمال اور جنوب میں ایک سے زیادہ تعلقات کی وجہ سے اس میں سرایت کر سکتی ہے۔ پاکستان کے لیے امریکہ کے

ساتھ تعلقات کو سنبھالنا بھی ایک مسئلہ ہے۔ امریکہ پاکستان کے لیے اس لیے اہم ہے کہ اس کے ذریعے پاکستان کو نہ صرف مغرب کے بڑے دارالحکومتوں تک رسائی ملتی ہے بلکہ ورلڈ بینک اور آئی ایم ایف تک رسائی بھی آسان ہو جاتی ہے جبکہ ساتھ ساتھ اس گہری جڑوں والے بڑے درخت کو محفوظ رکھنا بھی ضروری ہے، جس کی طرف چینی وزیراعظم نے اشارہ کیا تھا۔ اس کے لیے انتہائی احتیاط، کاریگری اور طویل مدتی مقاصد کے واضح ہونے کی ضرورت ہوتی ہے۔

ایک اور بنیادی چیلنج امریکہ کی خطے پر لفظی بیان بازی پر کان نہ دھرنا ہے۔ مغرب زیادہ تر خطے پر اپنا غلبہ برقرار رکھنے میں دلچسپی رکھتا ہے۔

ایسٹ ترکمانستان اسلامک موومنٹ (ای ٹی آئی ایم) کو دہشت گرد تنظیموں کی فہرست سے نکالنے سے پتا چلتا ہے کہ کسی تنظیم کو اسی وقت دہشت گرد قرار دیا جا سکتا ہے جب اس سے کوئی جیوپولیٹیکل فائدہ ملتا ہو۔ اب چین کو ایک ایسے بھیڑیے کے طور پر پیش کیا جا رہا ہے جو بڑا بھی ہے اور بُرا بھی، اور جسے قید رکھنے کی ضرورت ہے۔ یہی پروپیگنڈا اس وقت امریکہ اور اس کے تمام اتحادی کر رہے ہیں۔

یہ بہت اہم ہے کہ اس پُرشوکت لفظی بیان بازی کا شکار نہ ہوا جائے۔ مغرب چین کے خلاف 'منفی اثر' اور 'قرضہ جال پالیسی' کا پروپیگنڈا کرتا تھا، جس کا چین نے اس طرح بہترین جواب دیا کہ اس نے اپنی پالیسیوں کو دوگنا کر دیا اور جاری رکھا کیونکہ چین اپنی انہی پالیسیوں کی بدولت گزشتہ چالیس برسوں کے دوران اسّی کروڑ چینیوں کو غربت کی دلدل سے نکال چکا تھا۔

اسلام آباد کے لیے چیلنج تھا کہ وہ دائیں اور بائیں جھولتے ہوئے مختصر مدتی فوائد حاصل نہ کرے کیونکہ اس سے اس کی گہری جڑوں کو نقصان پہنچ سکتا تھا۔ بیجنگ سے تعلقات کو قریب نظری اور ابہام سے بچانا اسلام آباد کے لیے ایک اونچی چڑھائی چڑھنے کے مترادف ہے جو کہ کئی گیندوں کے ساتھ کرتب دکھاتا رہا ہے جس میں بہت زیادہ وقار نہ تھا جبکہ نتائج بھی ملے جلے تھے۔

بین الاقوامی دباؤ کی وجہ سے بیجنگ کے لیے چیلنج یہ تھا کہ وہ اس بین الاقوامی دباؤ کے

بارے حساس رہتا جو چین کے بہت زیادہ قریب ہونے کی وجہ سے پاکستان پر پڑ رہا تھا۔ ان میں اول الذکر بھارت کے لیے بھی خصوصی ہدف تھا اور امریکہ کے لیے بھی کیونکہ دونوں ملک چین کے بی آر آئی (بیلٹ اینڈ روڈ انیشی ایٹو) پروجیکٹ کی وجہ سے شکوک وشبہات کا شکار تھے۔

مشترکہ مقدر کا انتھک سرگرم تعاقب

بیجنگ میں ایک اعلیٰ چینی عہدیدار نے مجھے بتایا تھا ''یقیناً ہم نہیں چاہتے اور نہ ہی ہم ایسی خواہش کر سکتے ہیں کہ مغرب میں پاکستان کو اس کے دوستوں سے محروم کر دیا جائے۔ ہم صرف یہ چاہتے ہیں کہ ہمارے باہمی تعلقات میں خلوص اور شفافیت ہو۔ آپ ہمیشہ ہمیں موجود پائیں گے۔'' اس عہدیدار نے یہ بھی کہا تھا کہ پاکستان اس وقت جس جیو پولیٹیکل مخمصے میں پھنسا ہوا ہے چین اس سے بخوبی آگاہ ہے۔ ان جذبات کی گونج اعلیٰ ترین سطح پر بھی سنائی دی۔ چینی صدر شی جن پنگ نے اپنے پاکستانی ہم منصب صدر عارف علوی کو ایک تہنیتی پیغام بھیجا تھا جس میں دونوں ملکوں کے سفارتی تعلقات کے ستر سال پورے ہونے پر ایک دوسرے کو مبارک باد دی گئی تھی۔ ''چین اور پاکستان ہر موسم کے تزویراتی تعاون والے پارٹنر ہیں اور دونوں مختلف ایشوز پر ایک دوسرے کو بھرپور اعانت فراہم کرتے ہیں۔ دونوں ملکوں کا باہمی اعتماد اور دوستی، گزشتہ ستر برسوں کے بدلتے ہوئے حالات پر پورا اترے ہیں اور ہمیشہ چٹان کی طرح مضبوط رہے ہیں۔''

صدر شی جن پنگ نے اپنے پیغام میں اس آمادگی کا ایک بار پھر اظہار کیا کہ وہ پاکستان کے ساتھ مل کر دونوں ملکوں کے لوگوں کے درمیان ایک ایسی کمیونٹی تشکیل دینا چاہتے ہیں جس کا مستقبل ایک ہو اور دونوں ملکوں اور ان کی عوام کو اس کا فائدہ ہو۔

چینی پاکستانیوں کو جو پیغام دیتے ہیں ان میں باہمی اعتماد، مشترکہ مستقبل، ہر موسم کے تزویراتی دوست، آزمائی ہوئی دوستی اور آئرن برادرز جیسے الفاظ لازمی موجود ہوتے ہیں، جن سے پاکستانیوں کے لیے چینیوں کے خلوص کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

وقت بتائے گا کہ یہ باہمی عہد اس دباؤ اور ان چیلنجز کو سہار پائیں گے جو دونوں ملکوں کو

ایشیائی کمیونٹی کا حصہ ہونے کی بنا پر مستقبل میں درپیش ہو سکتے ہیں۔ یہ چیلنجز سخت جیو پولیٹکس کے نئے راؤنڈ کے تناظر میں ہو سکتے ہیں کیونکہ مغرب چاہتا ہے کہ دنیا بھر میں اس کے غلبے کو چیلنج کرنے والا کوئی نہ ہو، تاہم ایک چیز یقینی ہے کہ آگے بڑھنے کا واحد راستہ معاشی خوشحالی کا انتھک تعاقب اور غربت کا خاتمہ ہے جسے بے مثل معاشی ترقی سے ہی حاصل کیا جا سکتا ہے جبکہ معاشی ترقی کی جڑیں جیوا کنامکس میں پیوست ہیں۔

''امتیاز گل پاکستان اور چین کے مابین کثیر جہتی تعاون کے بنیادی اصولوں کی کھوج کرتے اور ان کے بارے میں استدلال رکھتے ہیں۔ وہ بنیادی اصول جن کی جڑیں اعتماد اور مفادات کی پائیدار ہم آہنگی میں مضبوطی سے پیوست ہیں۔ گُل مستقبل کے ممکنہ چیلنجوں پر نظر رکھتے ہیں اور انہیں معلوم ہے کہ یہ دوطرفہ قربت اور افہام وتفہیم کو مزید تقویت دینے میں مدد ثابت ہو سکتے ہیں اور مواقع پیدا کرنے کا سبب بن سکتے ہیں۔ امتیاز گل کی کتاب جدید چین کی حرکیات اور امنگوں کو سمجھنے کے حوالے سے ایک انمول اضافہ ہے' لیکن شاید اس سے بھی اہم بات یہ ہے کہ یہ کتاب پاکستان اور چین کے مابین تعاون پر مبنی تعلقات کی انفرادیت اور معیار کو اجاگر کرتی ہے جو چھ دہائیوں سے زیادہ عرصے پر پھیلے سیاسی واقتصادی علاقائی اور عالمی ماحول میں مستقل اور مضبوط رہے ہیں۔''

ایمبیسیڈر ریاض ایم خان

(چین میں سب سے طویل عرصے تک کام کرنے والے پاکستان کے سفیر)

''ہنی بھائی چارے کے پیچھے کیا ہے؟'' اس کتاب کے مطالعہ نے میرے چین میں گزرے خوشگوار وقت کی یاد تازہ کر دی ہے۔ امتیاز گل کی تحریر کا اپنا ایک انداز ہے۔ ایسا انداز جس پر صرف ایک تجربہ کار صحافی کو ہی عبور حاصل ہو سکتا ہے۔ وہ اپنے سفر میں قاری کو ساتھ لے کر چلتے ہیں۔ وہ جو کچھ دیکھتے ہیں کوئی لگی لپٹی رکھے بغیر ضبطِ تحریر میں لے آتے ہیں۔ یہ کتاب پاک چین باہمی تعلقات کے بارے میں تو ہے ہی' یہ تیزی سے اہمیت اختیار کرتے ہوئے اس خطے کی جیوسٹریٹیجک حرکیات کو بھی دریافت کرتی ہے۔ اور ہاں، امتیاز گل اس میں واشنگٹن کی پیش کردہ کچھ جعل سازیوں کو بے نقاب کرتے بھی نظر آتے ہیں' لیکن وہ امریکہ کو مطعون نہیں کرتے۔ وہ محض ریکارڈ کو درست کرتے ہیں اور ایسا کرتے ہوئے وہ چین اور پاکستان' دونوں کو اپنے لیے بات کرنے کی اجازت دیتے ہیں' اپنے موقف کے اظہار کی۔ مغربی میڈیا کے بیانیے، جو اکثر ایک ہی عینک سے مشاہدہ کرتے ہوئے تخلیق کیے جاتے ہیں' کے رجحان کو پیش نظر رکھا جائے تو ایسا کرنا انتہائی اہم ہے۔ یہ کتاب سیاست، علاقائی اور عالمی دونوں، میں گہری دلچسپی رکھنے والوں کو مناسب اور اہم مطالعہ فراہم کرتی ہے۔ تصنیف یہ بھی یاد دلاتی ہے کہ ممکن ہے آنے والے زمانے میں ایک نئی سپر پاور ابھر کر سامنے آجائے لیکن چین ہمیشہ پاکستان کا آئرن برادر رہے گا۔''

مرانڈا حسین

صحافی' ایڈیٹر

اس کتاب میں امتیاز گل نے پاک چین تعلقات' جو وقت کی ہر آزمائش پر پورا اترے ہیں' کا بھرپور نقشہ کھینچا ہے۔ پاک چین تعلقات اور اس کی مختلف جہتوں پر لکھنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے۔ یہ کتاب اس موضوع پر تصانیف میں ایک قابلِ قدر اضافہ ہے۔ یہ کتاب دونوں ملکوں کے تعلقات کی تزویراتی' سیاسی' سفارتی اور معاشی جہتوں کے ٹھوس تجزیے پر مبنی ہے۔ امتیاز گل نے اس میں پاک چین تعلقات کے علاقائی اور عالمی سیاق وسباق کا بھی احاطہ کیا ہے۔ بلاشبہ اپنی حیران کن معاشی ترقی کی وجہ سے چین دنیا کے اہم عالمی سٹیک ہولڈرز میں سے ایک کے طور پر ابھر کر سامنے آیا ہے۔ یہ بات بڑی خوش آئند ہے کہ امتیاز گل نے یہ کتاب ایک ایسے وقت پر شائع کی جب دونوں ملک اپنے سفارتی تعلقات کے قیام کی 70ویں سالگرہ منانے میں مصروف ہیں۔ اس علمی کاوش پر میں امتیاز گل کو مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ یہ کتاب پاک چین تعلقات پر کام کرنے والے سکالرز' پریکٹیشنرز اور طلبہ کے لیے بے حد مفید ثابت ہوگی۔

مخدوم شاہ محمود قریشی ،سابق وزیر خارجہ پاکستان

میں امتیاز گل کو تقریباً چار دہائیوں سے ایک ساتھی اور دوست کے طور پر جانتا ہوں۔ تب سے جب انہوں نے 'دی مسلم' کے لیے ایک ابھرتے ہوئے رپورٹر کے طور پر کام شروع کیا تھا جبکہ میں اس اخبار کا ایڈیٹر تھا۔ 'حقائق میں سے سچائی' کو تلاش کرنے کی ان کی پیشہ ورانہ مستعدی اور لگن اس خطے کے سب سے اہم ریلیشن شپ، آئرن برادرز کے طور پر پاک چین ہر موسم کی سٹریٹیجک پارٹنر شپ' کے بارے میں ان کے اس انتہائی معلوماتی مطالعہ سے عیاں ہے۔ ان کی تازہ تصنیف بتاتی ہے کہ یہ بندھن اتنا منفرد، اتنا متعلقہ اور اتنا اہم کیوں ہے، نہ صرف دونوں ملکوں کے لیے، جنہوں نے تقریباً ایک طرح کی پاکیزگی اور تقدس کے ساتھ اس تعلق کو فروغ دیا ہے جس کی عالمی سفارتکاری کی تاریخ میں مثال نہیں ملتی' بلکہ پوری دنیا کے لیے بھی۔ افغانستان سے امریکی انخلا کے بعد پاک چین تعلقات آج علاقائی امن، سلامتی اور استحکام کی کلید ہیں اور تزویراتی مفادات کی مطابقت کے ذریعے ربط سازی کے راستے پر آگے بڑھ رہے ہیں۔ اس دوطرفہ بندھن کا مرکز عوام سے عوام کی دوستی ہے' جو مصنف کے چین کے مختلف دوروں کے حوالے سے درج بہت سی روایات اور واقعات سے بھی ظاہر ہوتی ہے۔ تیزی سے بدلتی ہوئی دنیا میں پاکستان اور چین کے کردار کو بہتر طور پر سمجھنے کے لیے طلبا، سکالرز اور سفارت کاروں کو یہ کتاب ضرور پڑھنی چاہیے۔ درحقیقت پاک چین تعلقات ہمسایوں کے درمیان کسی بھی نوعیت کے اختلافات کے بغیر دوطرفہ بندھن کا ایک اچھا کیس سٹڈی ہے۔ دونوں ملک کئی دہائیوں کے گرم جوشی پر مبنی تعاملات کے تحت مسلسل ایک دوسرے کے قریب تر ہیں۔ چین پر امتیاز گل کی یہ تصنیف اس حوالے سے ایک بروقت کاوش ہے کہ یہ عالمی نظام میں عہد ساز تبدیلیوں، اقتصادی اور سیاسی طاقت کے توازن میں مغرب سے مشرق کی طرف ایک ٹیکٹونک تبدیلی کے تناظر میں سامنے آئی ہے۔ اکتوبر 2022ء میں کمیونسٹ پارٹی آف چائنا (CPC) کی 20ویں کانگریس نے صدر شی جن پنگ کے کردار کو سی پی سی کی ایک صدی پر مبنی طویل تاریخ کی قدآور شخصیات کے برابر لا کھڑا کیا اور وہ اس قطار میں چیئرمین ماؤ اور بصیرت والے رہنما ڈینگ شیاؤ پنگ کے ساتھ کھڑے نظر آتے ہیں۔ دنیا کی دوسری سب سے بڑی معیشت کے طور پر چین کے غیر معمولی عروج میں مذکورہ تینوں رہنماؤں کی اعانت اور کردار کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اپنی لگن اور عوام پر مرتکز پالیسیوں کے ساتھ ان چینی رہنماؤں نے اپنے ملک کی کایا ہی پلٹ دی ہے۔ لیکن ہم چین کے بارے میں بہت کچھ مغربی ذرائع سے حاصل کرتے ہیں، جو اکثر پروپیگنڈا مواد ہوتا ہے جو چینی نظام کو ہدف بناتا ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ کمیونسٹ پارٹی آف چائنا کے تحت معاشرے میں تحرک پیدا ہوا' لیکن پارٹی کا اس سے بھی بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے ایک گوند کے طور پر کام کیا اور چین کے تمام متنوع علاقوں اور نسلوں کو متحد رکھا۔ یہ کتاب تحریر کرنے کا مقصد پاکستان میں قارئین کو چین کی حیران کن کامیابی اور ترقی کے راز بتانا ہے۔ چین کیا ہے؟ چینی کردار اور چینی روح یا جذبہ کیا ہے؟ چینی جذبے کو جانے بغیر چین کو مجموعی طور پر سمجھنا تقریباً ناممکن ہے۔ انہی دو عوامل نے ملک کو سیاسی استحکام اور معاشی ترقی کی طرف بڑھانے کا عزم کیا اور اس عزم پر پورا اترے۔

سینیٹر مشاہد حسین سید

پاک چین تعلقات نیو ورلڈ آرڈر میں جغرافیائی و معاشی دفاعی فصیل کا اقرار ہیں۔ یہ گہرا اشتراک اور تعاون علاقائی اور بین الاقوامی فورمز پر دہائیوں تک قائم رہنے والے باہمی اعتماد اور ایک دوسرے کی غیر متزلزل حمایت کے بغیر ممکن نہ تھا۔ دونوں ملکوں کے مابین جو ایک آہنی بانڈ قائم ہے' امتیاز گل نے اس کا گہرائی تک تجزیہ کیا ہے اور نہ صرف یہ سراغ لگایا ہے کہ وہ کون سی چیز ہے جس نے اس دوستی کو خصوصی حیثیت دی بلکہ یہ بھی کہ ایک ایسی دنیا میں کیسے فروغ پذیر رہا جا سکتا ہے جو بدلتی ہوئی جغرافیائی و سیاسی وفاداریوں کی وجہ سے زیادہ پیچیدہ ہوتی جا رہی ہے۔ امتیاز گل اس کتاب میں اپنے قارئین کو چین کے تیز رفتار ترقی کے سفر پر بھی لے جاتے ہیں۔ یہ کتاب پاک چین منفرد تعلقات کا جشن منانے کے ساتھ ساتھ ایک خراج تحسین بھی ہے۔ یہ کتاب چینی تجربے سے سبق سیکھنے کا موقع بھی فراہم کرتی ہے۔ یہ موقع کہ تمام ترقی پذیر ممالک چین کی ترقی اور کامیابی سے کیسے اور کیا سیکھ سکتے ہیں۔ یہ تصنیف اس بات پر بھی زور دیتی ہے کہ ترقی پذیر ممالک کو ایسا کرنا ہی چاہئے۔

ڈاکٹر معید یوسف

سابق نیشنل سکیورٹی ایڈوائزر اور مصنف

Brokering peace in nuclear environment